بکھر نہ جائیں خواب

آسیہ رزاقی

SIMREE FILATI
جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراول.....2004ء
ناشرین.....خواتین ڈائجسٹ
پریس.....ابن حسن پریس

سول ایجنٹ:

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی

کچھ اپنے بارے میں

اپنے یا اپنی تحریروں کے بارے میں لکھنا میرے خیال میں بے حد مشکل کام ہے- اور یوں تو کئی بار انٹرویو یا سروے خواتین ڈائجسٹ میں چھپتے رہتے ہیں ان سے بھی قارئین کو میرے بارے میں خاصی معلومات ہو چکی ہیں- مختصر یہ کہ جو کچھ سیکھا حاصل کیا' وہ بزرگوں سے ورثے میں ملا اور بزرگوں کی ہمت افزائی ابا کی کوشش کہ میں ایک ادیبہ بن جاؤں- جس زمانے میں بچے چھٹی ساتویں میں پڑھ رہے ہوتے ہیں- میں نے ادیب کا امتحان پاس کرلیا تھا اور اس کے اگلے سال ادیب عالم کرلیا-

ابا میرے مطالعے کے لیے دلی سے کتابیں منگواتے تھے اور جب وہ مشرقی پاکستان میں تھے- انہوں نے مجھے بنگلہ پڑھنے کی ترغیب دی- بنگلہ اردو بات چیت کے قاعدے بھیجے- اس کے بعد خالص بنگلہ قاعدے صرف شرت چندر چٹر جی اور ٹیگور کے ناول بنگلہ زبان میں پڑھنے کے لیے میں نے سب قاعدے پڑھ ڈالے- تھوڑی شد بد تو ہوئی مگر آگے کوئی رہنمائی کرنے والا نہ ملا تو بس ترجمے ہی پڑھ کر ذوق کو تسکین دے ڈالی-

میرے میاں صاحب نے جو کہ خود بھی شاعر اور ادب نواز تھے- دنیا بھر کے ادبی شاہکار میرے لیے مہیا کیے- روسی' چینی' مصری' فرانسیسی' بنگلہ' ہندی اور انگلش ناولوں کے ترجمے ہی پڑھے لیکن ان سب سے ذہن کو جلا ملی- ہمارے پاس اتنی کتابیں ہو جاتی تھیں کہ ہم انہیں شوقین لوگوں میں بانٹ دیتے یا لائبریری کو دے دیتے- اب تو میرے پاس بہت محدود ذخیرہ کتب ہے- اور یہ مطالعہ ہی ہے جس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی کتھا کہانی لے کر قارئین کے روبرو ہوں- بزرگوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے شوق کو بڑھایا- ہمارے خاندان میں ادیبوں شاعروں نقادوں' مورخوں کا سیل بے کراں تھا- بلکہ یہ بزرگ بہترین مترجم بھی تھے-

وہ خواتین جن کو ادبی ماحول نہ ملا اور وہ بہترین ادب پیش کر رہی ہیں- دراصل وہ قابل تعریف ہیں- یہ ان کی لیاقت اور قابلیت اور شوق کی انتہا ہے- مجھے تو ان پر رشک آتا ہے-

آسیہ رزاقی

بے پناہ صلاحیتوں کی مالک

علی سفیان آفاقی

آسیہ رزاقی کو اگر پیدائشی مصنفہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا- پیدائشی مصنفہ سے یہ مراد نہیں کہ انہوں نے پیدا ہوتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا- مطلب یہ ہے کہ لکھنے کی صلاحیتیں اور ''جراثیم'' قدرت نے پیدائش کے ساتھ ہی انہیں ودیعت کر دیے تھے- یوں بھی فنکار ادیب تخلیق کار کو قدرت ہی یہ صلاحیتیں فراہم کرتی ہے ورنہ ہر شخص ہر کام کرنے پر قادر نہ ہو جائے-

انہیں یہ ذوق اور شوق ورثے میں بھی ملا ہے- ان کے دادا بہت اچھے شاعر تھے- ان کے والد ابو تیم فرید آبادی کا شمار بہت اچھے مزاح نگاروں میں ہوتا تھا- انہوں نے بچوں کے لیے بھی بہت دلچسپ اور مفید کتابیں تحریر کی ہیں- ان کے تایا سید ہاشمی فرید آبادی نامور محقق' مورخ' صحافی' عالم اور ادیب تھے- انجمن ترقی اردو میں مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ کافی عرصے کام کیا- ریاست حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے بھی منسلک رہے- ایک عدد چچا سید مظفر فرید آبادی منفرد انداز کے شاعر و ادیب تھے- دادی کے حوالے سے ان کا تعلق ریاست لوہارو سے ہے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی ذریعے سے مرزا غالب تک جا پہنچتا ہے- اس اعتبار سے انہیں خاندانی مصنفہ کہا جا سکتا ہے- پھر آنکھ کھولتے ہی انہوں نے گھر میں لکھنے پڑھنے کا جو ماحول دیکھا' اس سے بھی متاثر ہوئیں اور ان کے شوق کو جلا ملی- انہوں نے بچپن ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا- لکھنے سے مراد تختی اور خوش خطی لکھنا نہیں ہے- وہ مضامین اور کہانیاں لکھا کرتی تھیں-

1947ء میں ہم نے بھوپال میں ایک روزنامہ ''چغل خور'' کے نام سے نکالا تھا- یہ روزنامہ دو فل اسکیپ کے کاغذوں یعنی چار صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا جسے ہم خود ہی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے- بھوپال میں ہمارا خاندان بہت وسیع تھا- سب ایک ہی محل میں رہا کرتے تھے مگر ہر ایک کا حصہ اور گھر الگ تھا لیکن ساتھ ہی تھے- ''چغل خور'' ہاکا پھلکا اخبار تھا جس میں ہر گھر کی چغلیاں خبروں کی شکل میں شائع کی جاتی تھیں- اس میں اداریہ اور فکاہیہ کالم بھی ہوتا تھا- جمعہ کے روز سنڈے ایڈیشن زیادہ صفحات پر اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا- یعنی لکھا جاتا تھا- پرچے کا ماہانہ چندہ ایک آنہ تھا- ہمارے نمائندے (چھوٹے بچے) جو ہمیں گھروں کی اندرونی خبریں فراہم کرتے تھے وہی اس اخبار کو ہر گھر میں خریدار کے پاس لے جا کر پڑھوایا کرتے تھے- آسیہ رزاقی اس وقت آسیہ تمیم تھیں- انہوں نے ''چغل خور'' کے لیے ہمیں فرید آباد سے مضامین ارسال کیے- اس وقت ان کی عمر گیارہ بارہ سال کی ہوگی- یہ مضامین بہت دلچسپ اور گھریلو معاملات کے بارے میں ہوتے تھے-

آسیہ رزاقی شادی کے بعد بھی لکھتی رہیں- ان کے شوہر انیس احمد رزاقی مرحوم بہت ادب ذوق تھے- بہت اچھا کتب خانہ انہوں نے بنا لیا تھا- انہوں نے بھی اپنی بیگم کی حوصلہ افزائی کی- اس طرح وہ باقاعدہ ادیبہ اور کہانی نویس بن گئیں-

خواتین لکھنے والیوں کی آج کل کوئی کمی نہیں ہے- بلکہ شاید بہتات ہے- لیکن آسیہ رزاقی نے اپنا منفرد انداز تحریر اور اسلوب شروع سے آخر تک برقرار رکھا- وہ اپنے موضوع اور کردار اپنے آس پاس سے اکٹھے کرتی ہیں اور پھر انہیں بہت موثر' دلچسپ اور دلنشین انداز میں پیش کر دیتی ہیں- ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عام خواتین لکھنے والیوں کی طرح روایات اور عشق و محبت کو اپنا موضوع نہیں بنایا- بعض کہانیوں میں اس کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے لیکن عام رواج سے ہٹ کر معاشرتی' گھریلو موضوعات پر کہانیاں لکھنا اور مقبولیت حاصل کرنا واقعی ایک کارنامہ ہے- ان کے کردار انوکھے' منفرد اور زندگی سے بھرپور ہوتے ہیں- روزمرہ کے واقعات سادہ انداز میں بیان کرتی ہیں اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ زبان اور قواعد کے ساتھ ''گستاخی'' کبھی نہیں کرتیں- ان کی تحریریں با محاورہ ہوتی ہیں اور زبان مستند- پھر بھی اگر وہ ایک مقبول اور ہر دل عزیز مصنفہ ہیں تو فی زمانہ یہ بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں ہے-

1977ء میں ہم نے ان کی ایک کہانی سے کردار اخذ کر کے فلم ''عاشی'' بنائی تھی جو ہیروئن کے مخصوص اور انوکھے کردار کی وجہ سے بہت پسند کی گئی تھی- بابرہ شریف اس فلم کی ہیروئن تھیں- انہیں یہ کردار اور ہم نے اس کردار کو جو انداز دیا تھا وہ اتنا پسند آیا کہ اس کے بعد کئی فلموں میں وہ اس کو اپناتی رہیں- ان کی ذرا مہ میریل ''نادان نادیہ'' میں بھی انہوں نے یہی انداز اپنایا تھا- لیکن ''عاشی'' کے سوا مخصوص بات کسی اور کردار میں پیدا نہ ہو سکی- چونکہ وہ ماحول' حالات اور پس منظر کے عین مطابق تھی-

آسیہ رزاقی آج بھی لکھ رہی ہیں اور ہر بار ایک نئی کہانی اور نیا کردار تلاش کر لاتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ سکہ رائج الوقت کے برعکس یہ محبت اور عشق پر بھی مشتمل نہیں ہوتی-

واقعی بڑے سخت حوصلے اور بے پناہ صلاحیتوں کی بات ہے-

بکھر نہ جائیں خواب

''کھائے جا- کھائے جا- ڈائن- اری ان گنوں کے ساتھ کس کا مقدر پھوڑے گی- اللہ جانے- نہ کھانے پینے کی تمیز، نہ بات کرنے کا سلیقہ- اے خدا مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے تو نے'' اماں کی تند و تلخ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی وہ دانت پیس کر یہ دل خوش کن الفاظ میرے بارے میں فرما رہی تھیں-

کھٹے کنو نمک مرچ کے ساتھ کھاتے ہوئے اتنا مزہ آ رہا تھا اپنی دھن میں ایک کے بعد دوسرا کنو چھیلتی اور کھا جاتی- اماں کی نظر مجھ پر پڑی ہوگی- بس آ گیا جلال مجھے کھاتے پیتے دیکھ ہی نہیں سکتیں اچھا پہن اوڑھ لوں تو الگ فصیحتے کہ میں اس قابل نہیں ہوں- جواب دیتی تو وہ منہ توڑنے کی دھمکی دیتیں-

''اللہ میاں- میں کہاں چھپ جاؤں کہ اماں کے اعتراض اور خفگی سے بچ سکوں-'' مجھے اپنے منہ کا ذائقہ کڑوا لگنے لگا- دھواں سا سینے میں بھر گیا- جی چاہا سارے کنوا اٹھا کر زمین پر پٹخ دوں- مگر پھر تو میرا جرم اور بھی ناقابل معافی ہو جائے گا- میں اماں کے عتاب سے ڈر کر غصہ بھی نہیں کر سکتی- احتجاج کا ذکر ہی کیا- اس لیے انہیں گھور کر رہ گئی-

''گھورتی کیسے ہے نامراد- دیدے نہ پھوڑ دوں کسی دن-''

اماں تلملا کر بولیں-'' کھانا کھائے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہے مگر تیرا پیٹ تو کبھی بھرتا ہی نہیں- اب یوں سنتے سے ٹھونس رہی ہے جیسے کئی دن کی بھوکی ہو- کوئی دیکھے تو کیا کہے-''

اماں دبی زبان سے ارشاد فرما رہی تھیں کیونکہ باہر کچھ مہمان بیٹھے تھے ورنہ میرے بارے میں اظہار خیس کرتے ہوئے اماں کی آواز کافی بلند ہوتی ہے- مگر وہ اس وقت ضبط کیے ہوئے چپکے چپکے ڈانٹ رہی تھیں- میں نے اماں کا سرخ چہرہ دیکھ کر منہ پھیر لیا میز پر بکھرے چھلکے اٹھا کر دوپٹے

کے آنچل سے میز کی سطح پونچھنے لگی- رس ٹپک گیا تھا نا- ابھی مجھ پر پھوہڑ پن کا الزام لگ جاتا- اور چونکہ گھر میں میرا کوئی نوکر بھی نہیں تھا اس لیے خود ہی صفائی کرنی پڑی-

''ہاں- ہاں کر دے دوپٹے کا ستیاناس- تیرے باوا کی مل جو کھڑی ہے اور آ جائے گا دوپٹہ- اری کمبخت یہ طریقے کہاں دیکھے ہیں تو نے- ذلیل گنواروں والے- ارے گاؤں والے بھی اتنے جاہل بدتمیز نہیں ہوتے- جانے کس سزا میں میرے پلے پڑی ہے کمبخی-''

اماں گو ہرافشانی کرتے ہوئے کچکچا کر میری طرف قہقہیں- میں سر بچانے کو ذرا پیچھے ہوگئی- وہ جھونک میں اس کرسی سے ٹکرا کر گریں جس پر میں بیٹھی تھی- ماتھے پر چوٹ لگی- وہ سر تھام کر بیٹھ گئیں اور رونے لگیں- سچی بات ہے- افسوس تو مجھے بھی ہوا مگر میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا- ہاں اتنا ضرور تھا کہ مار کھانے کے لیے میں اپنا سر ان کے آگے جھکا دیتی تو شاید چوٹ انہیں نہ لگتی- اب اماں کو مزید موقع نہ ملا مجھے کوسنے کا-

''نامراد- دیدے پھوٹی- تیرا بس چلے تو مجھے مار ہی ڈالے خدا سمجھے تجھ سے- میرا سر پھوڑ دیا-''

میں چپکے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی- جب تک میں سامنے رہتی اماں بھڑاس نکالتی رہتیں- ویسے تو ذرا سی محنت سے اماں تھک جاتی تھیں- مہمانوں سے زیادہ دیر باتیں کر کے بھی انہیں تکان ہو جاتی مگر مجھے برا بھلا کہنے، فضیحتے کرنے میں اگر سارا دن بھی انہیں مل جائے- وہ رکے بغیر ایک سانس میں میرے عیب و ہنر دنیا بھر کو سناتی رہتیں اور ذرا نہ تھکتیں- گھر میں سب ہی مجھ سے چڑتے اور نفرت کرتے تھے- ہر ایک کو میرے ہر فعل میں اعتراض کا پہلو نظر آ جاتا- ویسے کوئی مجھ سے محبت بھی کرتا ہے؟ اس کا اندازہ مجھے نہیں ہوا- ننھے تو اپنے کھانے پینے کی ہی فکر میں رہتی تھی- باقی سب لوگ بھی اپنے اپنے راگ الاپتے- بھیا کو دوستوں اور کرکٹ کے میچوں سے ہی فرصت نہ ملتی- جب بھی کبھی کبھار گھر میں نظر آتے مجھ پر نظر پڑتی تو دو چار خطابات اور ایک دو تھپ سے مجھے نوازتے- خطابات کی مجھے پروا نہ تھی اور تھپ تو بے حد ہلکا پھلکا ہوتا جیسے پیار کر رہے ہوں- یوں بھی ان کی آواز اور لہجے میں میرے لیے نفرت نہ ہوتی- وہ کسی سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے چار بہنوں کے اکلوتے بھائی- سب کو ہی اپنے چٹکلوں سے خوش رکھنا چاہتے- مگر آپی جو ہیں نا- بس وہ مجھ سے خار کھاتی تھیں- نہ جانے انہیں مجھ سے کیا پرخاش تھی کہ کبھی سیدھے سبھاؤ بات نہیں کرتیں- جب مخاطب ہوتیں طنز و حقارت سے ہر قسم کے الزامات مجھ پر عائد کرتیں- ہر نقصان میرے کھاتے میں لکھا جاتا- میں پھوہڑ، بے ڈھنگی اور لاپرواہی اس لیے گھر میں کسی کے ہاتھ سے برتن ٹوٹیں ان کی ذمے دار مجھ پر ہوتی کوئی چیز وقت پر اور اپنی جگہ نہ ملے- وہ یقیناً میں نے ہی..... ادھر ادھر رکھ دی ہوگی- کھانے پینے کی چیزیں کم ہو جائیں تو وہ لازماً میں نے ہی کھائی ہوں گی-

نادیہ کی گڑیا کھوئی - تو وہ میں نے اپنی کسی سہیلی کو دے دی ہوگی - کوئی کھلونا ٹوٹ گیا تو لازماً میں ہی اس سے کھیلی ہوں گی میرے ہاتھ توڑنے، پھوڑنے پھینکنے میں ماہر تسلیم کیے جاتے اور میرا بے ڈھنگا پن مسلم تھا - اسی لیے اماں کا نیا دوپٹہ یا نئی چپل آپی پہن کر اپنی سہیلی کے گھر چلی جاتیں - واپس آ کر چپکے سے رکھ دیتیں - اماں ضرورت پڑنے پر دیکھتیں تو مجھے ہی مطعون کرتیں کہ مجھ نصیبوں جلی نے ہی ان کے دوپٹے پر دھبے ڈالے ہیں اور چپل کا اسٹریپ توڑا ہے - کیونکہ ان کے خیال میں میرے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کرتا - کر ہی نہیں سکتا -

ان کی باقی بیٹیاں تو انتہائی سلیقہ شعار، فرماں بردار تہذیب کی علمبردار تھیں - ایک میں ہی بدتمیز، پھوہڑ، زبان دراز نافرمان تھی - اماں خفا ہو رہی ہوتیں میں ناکردہ گناہی کی فریاد آنکھوں میں سموئے ٹکر ٹکر انہیں دیکھا کرتی - آپی منہ دوپٹے میں چھپائے کھی کھی ہنسا کرتیں - حد تو یہ ہے کہ نادیہ اور افروز بھی آپی کی دیکھا دیکھی اپنے قہقہے میرے سر منڈھنے سے نہ چوکتیں - کہتے ہیں بد اچھا بدنام برا -

مجھے بدنام کرنے میں بھی آپی کا ہی ہاتھ تھا - ہر وقت اماں کے کولہے سے لگی بیٹھی رہتیں اور میری شکایتیں کیا کرتیں - بھلا وہ گھر کا کام کرتی تھیں تو مجھ پر کون سا احسان تھا - وہ صفائی کرتیں میں چیزیں پھیلا دیتی - کتابیں، کاپیاں ادھر ادھر ڈال دیتی تو ذرا نرمی سے سمجھا دیتیں - شاید میں مان جاتی مگر ماں کو مجھ سے بیر تھا -

صرف ابا اماں کو سمجھایا کرتے - جب وہ الزامات خطاؤں اور جرموں کی لمبی فہرست سناتیں - (ظاہر ہے میرے بارے میں) ابا کہتے -

''بیگم، بلاوجہ بدنام نہ کرو - غلط الزام نہ دیا کرو - بری بات ہے -''

اماں کی کبھی کبھار کی یہ حمایت بھی مہنگی پڑتی - اماں تلملا کر رہ جاتیں - قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتیں اور میں کئی دن اماں اور آپی کے عتاب کا شکار رہتی - پھر میں بھی کہاں تک دوسروں کے کیے گئے جرائم کی سزا بھگتتی - اب کوئی مجھ پر غلط الزام لگاتا تو میں چپ نہ رہتی - فوراً صفائی پیش کرتی نتیجہ یہ کہ مجھے گستاخی کا موجب سمجھا جانے لگا -

ہمارے گھر کے اوپر والے حصے میں نئی کرایہ دار آ کر رہ رہی تھیں - روشن آپا - اندر صحن کے زینے سے میں ان کے پاس چلی جاتی دلچسپ، باغ و بہار اور بے تکلف طبیعت کی تھیں - ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی - ان کو میری مظلومیت اور گھر والوں کی زیادتی کا احساس تھا - کبھی کبھی جب میں ان سے اپنے دکھڑے روتی وہ سمجھاتیں -

''تم چپ رہا کرو اور صرف غلط الزام کی صفائی دیا کرو - وہ بھی اماں کا غصہ کم ہونے کے بعد -''

پہلے پہل جب میں نے صفائی پیش کی - اماں آنکھیں پھاڑے میرا منہ تکنے لگیں - انہیں یقین نہ

آیا کہ میں ان کے الزام کو غلط بھی کہہ سکتی ہوں -

جب بھی میں ایسے موقع پر زبان کھولتی تو اماں گالیوں، کوسنوں کو کافی نہ سمجھ کر مارنے دوڑتیں - میں تو ان کے ہاتھ بھلا کہاں آتی - وہ بے بسی سے رونے لگتیں - اور آپی کو اللہ موقع دے وہ ان سے لپٹ کر خود بھی آنسو بہاتیں اور اماں کو تسلیاں دے کر ان کی ہمدردیاں بٹورتیں -

ابا کے سامنے میرا مقدمہ پیش ہوتا وہ میری حمایت کرتے اماں چڑ جاتیں -

''اچھا - میں تو غلط کہتی ہوں کچھ تم بھی کہو - اس بدبخت کا ہوگا کیا - لڑکی ذات -''

''بدبخت نہیں - خوش بخت ہے میری بیٹی بیگم بیٹیوں کے لیے نیک الفاظ دعائیہ کلمات استعمال کرنے چاہئیں - کیسی ماں ہو تم -''

''اچھا - اچھا مگر میرے لیے تو دکھ و ہندہ ہے یہ - اسے کہیں دفع کرو - بڑی آپا کے پاس بھیج دو -''

''سوچوں گا -'' ابا لاپروائی کے انداز میں ادھر ادھر ہو جاتے اماں حیرانی سے دیکھتی رہتیں - ایسے کئی مقدمے بغیر کسی فیصلے کے انجام کو پہنچے - ماں دانت پیس کر کہتیں -

پتا نہیں اماں کو مجھ سے اس قدر نفرت کیوں تھی خصوصاً جب کوئی مہمان آتا - اس کے جانے کے بعد میری شامت آ جاتی - بعد میں روشن آپا نے مجھے بتایا -

''کہ یہ جو غیر قسم کی مہمان عورتیں آتی ہیں وہ آپی کے رشتے کے سلسلے میں آتی ہیں مگر وہ پسند مجھے کر لیتی ہیں -''

حالانکہ گھر والے تو مجھے ناپسند کرتے تھے - آپی کا رنگ بھی کافی سانولا تھا اور قد مجھ سے چھوٹا - حالانکہ وہ مستقل اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے رہتیں - پھر بھی مجھے چھوٹی لگتیں -

اب مجھے معلوم ہوا کہ جب بھی مہمان عورتوں کے پاس میں جاتی جہاں آپی بڑے شرمیلے انداز میں سر نیچا کیے بڑے اخلاق سے مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کر رہی ہوتیں مجھے دیکھتے ہی کیوں غصے سے سرخ ہو جاتی تھیں یا غم سے پیلی پڑ جاتیں یا اماں ایسی غضبناک نظروں سے مجھے دیکھتیں کہ میں وہاں سے فوراً ہی بھاگ پڑتی -

اب جو روشن آپا نے بتایا کہ وہ آپی کے رشتے کے لیے آتی ہیں اور مجھے پسند کر جاتی ہیں جو اماں کو ظاہر ہے منظور نہیں - یہ سن کر مجھے جو ہنسی آئی تو ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ گئے - روشن آپا دو منٹ تو میرے ساتھ ہنستی رہیں - پھر ''پگلی ہے'' کہہ کر مشین کی جانب متوجہ ہو گئیں -

مجھے آپی کی ناکامی اور اپنی فتح کے خیال سے جسم میں گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی - جب بھی ہنسی کو روکنا چاہتی وہ اور بھی مجھے گدگدانے لگتی - میں بے قابو ہو کر فرش پر لوٹیں لگانے لگی - روشن آپا نے مجھے گھورا - بناوٹی ناگواری سے دیکھا - میں نے ان کو بھی اپنی ہنسی میں لپیٹ لیا - ہائے کیسا دل خوش کن خیال تھا یہ - آپی مجھ سے دبتی ہیں اس لیے اور بھی چڑتی ہیں - میرے ہنسی کو اس وقت

بریک لگا- جب دوسرے کمرے سے وجیہہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر آپا کے کمرے میں آیا-

''دورہ پڑ گیا کیا؟ ایک منٹ مشکل سے سویا ہوں کہ معلوم ہوا کوئی آفت آ گئی- پتا چلا محترمہ کی ہنسی ہے- پانچ منٹ سے انتظار کر رہا ہوں کہ اب آواز بند ہو- اب ہنسی رکے نہ کسی کے آرام کا خیال نہ نیند کی پروا- یہ گھر ہے یا مسافر خانہ-''

خیر وجیہہ کی تو مجھے زیادہ پروا نہ تھی- اسی لیے ڈھٹائی سے میں نے کہا-

''یہ کوئی سونے کا وقت ہے- ہم تو ایسے ہی باتیں کر رہے تھے- ہنسی آ گئی-''

وجیہہ نے منہ بنا کر کہا ''رات کی ڈیوٹی دے کر آیا ہوں پوری رات جاگ کر- اب سونے لیٹا تو تم آ گئیں- شیطان کی خالہ-''

میں خفا ہو کر صحن کی طرف جانے لگی تو انہوں نے بڑھ کر مجھے روک لیا اور طنز سے کہا-

''بھئی تم کیوں خفا ہوتی ہو- بات کرو- ہنسو- شور مچاؤ- قصور تو ہمارا ہے جو تمہارے گھر میں آ کر رہ رہے ہیں مالک مکان ہو- جو چاہو کرو- اور ہم پر پابندیاں لگاؤ- زور سے نہ چلو- چھت ہلتی ہے- صحن نہ دھوؤ پانی رستا ہے- منڈیر کے پاس مت آؤ- اینٹیں گر پڑیں گی- اوپر نہ چڑھو- سیڑھیاں کمزور ہیں- ہونہہ-''

وہ بڑے غصے سے یہ سب کہہ کر میرا ہاتھ جھٹک کر دوسرے کمرے میں گھس گئے- میں سراسیمہ کھڑی رہ گئی- روشن آپا کو اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے جلدی سے کہا-

''دیکھیے آپا سارا الزام میرے سر تھوپ کر چلے گئے بھلا میں کہتی ہوں- یہ سب- اماں سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے- مجھ پر عتاب نازل کر کے چلے گئے- واہ سب گھر والوں کی طرح- بس اب میں نہیں آؤں گی آپ کے گھر-''

روشن آپا جلدی سے بولیں ''ارے وہ تو پگلا ہے رات کی ڈیوٹی دے کر آتا ہے تو اس کا مزاج خراب رہتا ہے- سو لے گا تو ٹھیک ہو جائے گا- تم برا نہ مانو-''

میں کیوں برا نہ مانتی گھر والے تو میرے پیچھے پڑے ہی رہتے تھے- اب یہ حضرت بھی ان کے نقش قدم پر چلتے رہے تو میرا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا- یہی تو ایسی پناہ گاہ تھی جہاں میں آزادی سے ہنستی بولتی تھی- روشن آپا ہمدرد تھیں- اب کے بچوں سے بھی دوستی تھی میری- میں جھوٹ موٹ دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر بسورنے لگی- روشن آپا جلدی سے مجھے لپٹانے اور پیار کرنے لگیں-

''اسی لیے بزرگ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو زیادہ ہنسنا زیب نہیں دیتا- اب روؤ بیٹھ کر-''

''بڑا آیا میرا بزرگ-'' میں تنفتاتی نیچے اتر آئی- کئی دن میں اوپر نہیں گئی- غصہ وجیہہ پر تھا- مگر گھر تو میرا تھا اور کرائے دار روشن آپا- وجیہہ ان کا چھوٹا بھائی تھا- دفتر قریب ہونے کی وجہ سے انہی کے پاس رہتا تھا- اس سے پہلے تعلیم کے بہانے وہ کئی سال ہمارے ہاں اوپر کے ایک

کمرے میں رہ چکا تھا- بھیا سے پکی دوستی تھی- گھر میں بھی اس کا آزادانہ میل جول تھا- اماں اس کو پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ ''شریف لڑکا'' تھا بچپن سے ہی وہ آپی کی دیکھا دیکھی میرے پیچھے پڑا رہتا تھا بھیا کی طرح چیت لگاتا اور ڈانٹ ڈپٹ تو روز کا معمول تھا بغیر غرائے تو اب بھی باز نہ آتا- روشن آپا آنکھیں نکال کر اسے نہ گھوریں تو وہ ہر وقت مجھ پر اعتراض اور نکتہ چینی کر کے حکم چلائے- وہ روشن آپا سے کہتا-

''آپا! تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن سے یہاں آئی ہو اور میں اسے برسوں سے جانتا ہوں- بہت ڈھیٹ ہے بغیر ڈانٹ کے تو بات نہیں سنتی- لاتوں کی بھوت ہے یہ-''

ایک روشن آپا سے ہی دوستی تھی میری- وجیہہ تو ایم- اے کر کے واپس اپنے گاؤں چلا گیا تھا میں پریشان تھی- کیونکہ پہلے تو وہ بچہ سمجھ کر محض ڈانٹ ڈپٹ سے ہی کام چلاتا تھا- اب تو وہ طنز بھی کرتا- مذاق بھی اڑاتا- میں اس کی غیر موجودگی میں روشن آپا کے پاس جاتی تھی-

لیکن اب میں نے فیصلہ کیا کہ غیروں کی اوٹ پٹانگ باتوں سے بہتر ہے کہ میں اپنوں کی ڈانٹ پھٹکار سنوں- اسی لیے میں نے اب اپنی عادتوں میں اعتدال کا راستہ اپنایا- چپکے سے اماں کا ایک آدھ کام بھی کر دیا-

اماں کپڑے دھو رہی تھیں- میں نے انگنی پر لے جا کر ڈالے- وہ سبزی بنا رہی تھیں تو میں چھلکے سمیٹ کر پھینک آئی- وہ کنگھا لیے آپی کی منتظر تھیں میں ڈرتے ڈرتے ان کے ہاتھ سے کنگھا لے کر بیٹھ گئی اور ان کے بال سلجھانے لگی- میں نے ابھی دو لٹیں سلجھائی تھیں کہ آپی آ گئیں اور جھپٹ کر مجھ سے کنگھا چھین لیا اور بولیں-

''بس بس- رہنے دو اپنی کارگزاری- سارے بال نوچ کر رکھ دو گی- ہٹو- میں چوٹی کروں گی اماں نے رسان سے کہا- ''رہنے دے فوزیہ- اسی کو کرنے دے- آج تو بڑے موڈ میں ہے- بہت کام کر رہی ہے-''

آپی کو بھلا اتنی تعریف بھی کب گوارا تھی- چیخ کر بولیں-

''موڈ بدلتے کیا دیر لگتی ہے- ایسے آدمی سے کوئی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے- آج تک اماں کا کوئی کام کیا ہے جو اب کرنے بیٹھ گئیں- ہوگا کوئی مطلب- جبھی خوشامد میں محبت اچھل رہی ہے- نکلی، خود غرض-''

غصے اور صدمے نے میری عقل سلب کر لی- میں وہاں سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گئی

''خوشامدی ہو تم- میں کیوں خوشامد کروں گی- ذرا اپنی صورت تو دیکھو- چڑیلوں کی طرح میرے پیچھے پڑ رہتی ہو- کبھی مجھے کچھ کرنے بھی دیتی ہو تم- خود ہی ہر کام میں ٹانگ اڑاتی ہو اپنی تعریفوں کے لیے- مجھے ضرورت نہیں ہے تعریفوں کی-''

آپی نے میری کمر پر دو ہتڑ رسید کر کے چلے بھنے لہجے میں کہا۔

''چڑیل ہوگی تو۔ کام کی نہ کاج کی۔ ڈھائی سیر اناج کی۔ کھانے میں تو بلا ہے بلا۔ اوپر سے زبان چلاتی ہے۔''

میں نے ترکی پہ ترکی کہا ''کھاؤں گی۔ کھاؤں گی۔ اپنے باپ کی کمائی کھاتی ہوں۔ تمہارا راہ یا نہیں کھاتی۔ تم بھی تو کھاتی ہو۔ پھر کیوں جلتی ہو۔ مجھ سے، پانچ برس پہلے سے کھا رہی ہو۔ میں نے تم سے کم ہی کھایا ہے۔ جلتی ہو مجھ سے جبھی تو کملا بنی جا رہی ہو بھلا ہوا۔ ہوں۔''

آپی فوراً بھاگتی ہوئی کمرے میں جا کر رونے لگیں۔

اماں دیدے پھاڑے حیرانی، رنج اور پریشانی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کے بال ایسے ہی بکھرے رہے۔ گنگھا جمن پر پڑا رہا۔ میں بھی بے ممتی کے عالم میں کھڑی رہی۔ شام کو ابا آئے میں نے ان کے کپڑے بدلنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ مجھے سخت غصہ تھا۔ اور اگر میں ذرا بھی دیر کرتی تو آپی کی شبہ پر اماں ضرور ابا کو مجھ سے بدظن کر دیتیں۔ اس لیے میں نے ابا سے کہا۔

''ابا گھر میں سب مجھے کھانے کا طعنہ دیتے ہیں۔ آپ، میری تنخواہ یا جیب خرچ مقرر کر دیں۔ میں اپنا خرچ الگ سے اماں کو دے دیا کروں۔ پھر کوئی میرے کھانے کو کوئے کو تو سمجھ لوں گی۔''

ابا خاموش کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ اماں آ گئیں کمر پر ہاتھ رکھ کر تیکھے تیور سے بولیں۔

''کھایئے گی کیا؟ اور کہاں سے؟''

''جو بھی گھر میں پکے گا کھا لوں گی۔'' میں نے سعادتمندی سے سر جھکا کر کہا۔

''تو کہیں کی رانی ہے کیا؟ اور فوزیہ تیری لونڈی ہے جو تجھے پکا پکا کر کھلائے۔ سی کر پہنائے۔ ایں؟ اور تو کھانے بھی اور غرائے بھی۔ دیکھو جی۔''

اماں ابا کی طرف مڑیں۔ ''اس کا دماغ درست کرو۔ پتا نہیں کہاں سے ایسی ایسی باتیں سیکھ کر آتی ہے۔ تنخواہ مقرر کرو۔ ارے ایسے آنکھیں نکال کر غرائی ہے کہ میں تو دم سادھے بیٹھی رہ گئی۔ یہ زبان درازی۔ یہ باتیں کس سے سیکھیں اس نے؟''

ابا نے آہستہ سے کہا۔ ''بانو۔ کوئی سکھا تا نہیں ہے۔ محرومیاں خود ہی راستہ نکالتی ہیں۔ تم بھی تو اپنے رویے میں لچک پیدا کرو خدا کے لیے۔ اسے نفسیاتی کیس نہ بنا دینا۔''

وہ اماں کو سمجھاتے ہوئے اندر لے گئے پھر میرے پاس آ کر بولے۔

''بیٹی! میں کیا سن رہا ہوں۔ اتنی اچھی تابعدار اور خاموش رہنے والی بیٹی۔ اور بڑی بہن سے بدتمیزی کرے۔ نہیں یقین نہیں آتا۔''

میں جھینپ گئی۔ منہ بسور کر بولی۔ ''تو سب لوگ میرے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں؟ آپی میری جھوٹی شکایتیں اماں سے کرتی ہیں۔ مجھے طعنے دیتی ہیں کہ میں سب سے زیادہ کھاتی ہوں۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔''

''چہ چہ۔'' ابا افسوس سے بولے غصہ تو بہت بری چیز ہے گناہ ہے۔ اس پر قابو رکھنا چاہیے۔ فوزیہ تم سے بڑی ہے اگر وہ نصیحت کرے تو تم کو برا نہیں ماننا چاہیے۔''

اماں نے اپنی چیتی کی نفرت کو نصیحت کا نام دے کر ابا کو آپی کا حامی بنا دیا تھا۔

''وہ تمہیں اچھی بچی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔'' ابا نے پھر کہا۔ ''تاکہ تمہاری تعریف ہو اور سب تمہاری اچھی باتوں پر خوش ہوں۔ فوزیہ بھی خوش ہوگی۔ بڑی بہن ماں کے برابر ہوتی ہے ''ابا۔ وہ ہر وقت میرے خلاف باتیں کرتی ہیں۔ جو کام میں نہیں کرتی وہ بھی میرے ذمے ڈال دیتی ہیں کہ اس نے یہ بگاڑا ہے۔ یہ توڑا ہے۔''

ابا خاموش رہے۔ پھر سوچتے ہوئے کہنے لگے۔

''بڑوں کا فرض ہے بچوں کو عقل سکھائیں۔ صحیح راستے پر چلنے کا گر بتائیں۔ ماں باپ اولاد کو نیک اور صالح دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے فوزیہ اور ارشد کو بھی کبھی ڈانٹ کر کبھی پیار سے اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ انہیں معاشرے کا معزز رکن بنایا اب وہ تم کو اسی راستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ کوئی غلط بات دیکھتے ہیں تو تم کو ٹوکتے ہیں۔ اس بات کو غصہ نہیں کہتے تمہیں فوزیہ کی بات ماننی چاہیے۔''

''مگر ابا۔ وہ مجھے کوئی اچھی بات نہیں بتاتیں۔ بس شکایت کر کے مجھے تنگ کرتی ہیں۔ نادیہ افروز تک میرا مذاق اڑاتی ہیں میرے کام پر اعتراض کرتی ہیں۔ وہ کچھ بھی کریں انہیں سزا نہیں ملتی۔ میں کچھ نہ کروں تب بھی جھڑکیاں، ڈانٹ پھٹکار۔ پرسوں بھیا کے دوست آئے تھے نادیہ ان کے لیے پان لے جا رہی تھی۔ راستے میں طشتری گر کر ٹوٹ گئی اس نے جھٹ اماں سے کہا۔ ''چھوٹی آپا دوڑتی ہوئی آ رہی تھیں ان کے دھکے سے طشتری ٹوٹ گئی۔'' حالانکہ سچ ابا۔ میں بہت دور تھی اس سے۔ اماں ہر وقت خفا ہوتی ہیں کہ تو کھا کھا کر سانڈنی ہو رہی ہے۔ تیرے باوا کے کارخانے تو نہیں لگے ہوئے جو برتن توڑتی رہے اور آتے رہیں گے۔''

میں نے خوب جی بھر کر بھڑاس نکالی۔ ابا بھی فرصت میں تھے کہ سنتے رہے۔ بس اتنا میں نے سنا کہ وہ اماں کے کمرے میں جا کر انہیں کچھ نصیحت کر رہے تھے۔ ایک فقرہ پلے پڑا۔

''بچوں کو تحفظ نہیں دیا تم نے بیگم۔ جھوٹ کا سہارا لے کر زندگی نہیں گزر سکتی بانو۔ اپنے بچوں کے ساتھ انصاف کرو انہیں شفقت کی ضرورت ہے۔''

پتا نہیں اماں نے کیا کہا اور کیا کیا سنا۔

رات کو میں کھانا کھانے نہیں گئی۔ غصہ تو اب نہیں رہا تھا۔ مگر میں چاہتی تھی ابا مجھے اپنا خرچ دے دیا کریں میں سب کو دکھا کر، جتا کر اماں کو دوں اور ہر بات میں کہوں کہ میں تو اپنا خرچ دیتی ہوں۔ مفت نہیں کھاتی۔ جیسے بوا کا داماد ان کے گھر رہتا ہے اور خوب بوا سے لڑتا ہے اور اپنے خرچ کا اعلان کر کے اینڈتا ہے کہ میں اپنا خرچ کرتا ہوں۔ کسی کا، یا نہیں کھاتا۔

افروز ابا کا پیغام لائی تھی- میں چلی گئی- سب کھانا کھا رہے تھے- اماں خاموش سی پلیٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں- آپی کا سر جھکا ہوا تھا- شاید ابا نے جھاڑ پلائی تھی- مجھے کھڑا دیکھ کر اشارے سے بیٹھنے کو کہا- میں بیٹھ کر کے بولے-

''کھانا کھاؤ- آیندہ میں نہ سنوں کہ کسی نے دوسرے کو کھانے پینے کا طعنہ دیا ہے یا کسی پر غلط الزام لگایا ہے- سب بہن بھائی سلوک اور محبت سے رہنا سیکھو- میں تم لوگوں کے لیے اتنی محنت کرتا ہوں- گھر کا سکون ہر دولت اور نعمت سے بڑھ کر ہوتا ہے اور میں تم لوگوں سے اس دولت کے حصول کے لیے تعاون چاہتا ہوں-''

کھانا کھاتے ہی اس قدر نیند آئی تھی کہ جیسے کسی نے نیند کی دوا کھلا دی ہو- شاید میں زیادہ کھاتی تھی- آپی ٹھیک کہتی تھیں- بھئی مجھے بھوک زیادہ لگتی تھی- کوئی کام تو تھا نہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ کھانے کو دل چاہتا- املی، چنے، کشمش یا پھل جو ہاتھ لگتا میں اٹھا لاتی- مگر ابا کو خوش کرنے کو میں نے اب اماں کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا- اماں کو خوش دیکھنے کے لیے کھانے میں اعتدال رکھا-

میرے ہاتھ سے واقعی برتن بہت ٹوٹتے تھے- جانے کس طرح ہاتھ لگ کر پلیٹ نیچے گر جاتی- پانی پیتے میں گلاس پھسل جاتا اور زمین سے گلے ملنے لگتا میں یہ جان بوجھ کر تو نہیں کرتی تھی- آپی کہتی تھیں کہ میں اندھی اور مفلوج ہوں- ہاتھ میں طاقت نہیں ہے-

اماں بے ڈھنگے پن کو کوستیں-

ابا کہتے کہ بچپن کی لاپروائی ہے-

مگر نادیہ کا خیال تھا کہ میں جان کر سب کی توجہ حاصل کرنے کو ایسے کام کرتی ہوں-

افروز کہتی تھی کہ مجھے ڈانٹ سننے میں مزا آتا ہے اس لیے ایسی حرکتیں کرتی ہوں- نادیہ کی یہ حالت تھی کہ کسی نے ذرا بھی کچھ کہہ دیا تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی- افروز کو تو کسی کا سخت لہجہ بھی برداشت نہ ہوتا رونا شروع کر دیتی- مجھ سے ایسی ایکٹنگ نہ ہوتی- شاید میں عادی ہو گئی تھی رہ رہ کے آپی نیچے آئیں تو شکوہ کرنے لگیں کہ میں کئی دن سے ان کے گھر کیوں نہیں آئی- میں چپ

شام کو مہمانوں کی آمد متوقع تھی- آپی لپ جھپ باورچی خانے میں مصروف کار تھیں- اماں بھی سب کو ڈانٹ رہی تھیں- خصوصاً مجھے-

''لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی- مجال ہے کسی کام میں ہاتھ بٹا لے وہ نگوڑی کب سے اکیلی لگی ہوئی ہے- برابر کی بہن ذرا جو مدد کر دے- الٹا بگاڑنے کو تیار- چل ادھر آ- مبین پھینٹ دے فوزیہ کیا کیا کرے-''

آپی نے کہا-''رہنے دیں اماں! یہ اور بھی کام پھیلائے گی- میں سب کر لوں گی-'' وہ سر نیچا کیے مسکرا رہی تھیں-

اماں نے کہا-''اے ہے بچی- سموسے بنانے ہیں- پھلکیاں تلنی ہیں- ابھی تک برتن بھی اندر سے نہیں نکالے گئے- اور تم بھی ذرا منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو- سارا دن ہو گیا محنت کرتے- آرام کر لو-''

''بس آرام ہی ہے اماں'' آپی مکاری سے شرمائیں-''کون سا پہاڑ ڈھو رہی ہوں-''

''اور کیا-'' میں نے چڑ کر کہا-''روز ہی کرتی ہیں کون سا آج نرالا کام کر رہی ہیں- جو تھک گئیں- میں بھی کر سکتی ہوں یہ چھوٹے چھوٹے کام- سموسے بنانا کیا مشکل ہے- قیمہ بھرا اور تکون بنا لیا-''

اماں کو بھی اپنی لاڈلی کے کام زیادہ نظر آتے تھے- بھنا کر بولیں''اچھا تم تو رہنے دو نکی کہیں کی-''

میں وہاں سے ٹل گئی- شام کو میں نے نہا کر کپڑے بدلے گہرے فیروزی رنگ کا چوڑی دار پاجامہ، چمپئی کلی کا کرتا، چنا ہوا فیروزی دوپٹہ- افروز نے ایک روز کہا تھا کہ آپی تم پر فیروزی اور چمپئی رنگ بہت کھلتا ہے- میں نے سرمہ بھی لگایا اور اماں کی الماری سے پاؤڈر بھی چرا لیا- جیسے ہی مہمانوں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا میں اماں کے سامنے سے گزر کر اندر آ گئی- سب کو جھک جھک کر سلام کیا اور کرسی پر ڈٹ گئی-

تین خواتین- ایک تو شاید ماں تھی- دو ان کی لڑکیاں- عورت مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی- لڑکیاں سوالات کر رہی تھیں- میں نے صاف صاف جوابات دیے کہ نہ تو مجھے باورچی خانے کے کام میں دلچسپی ہے نہ سلائی وغیرہ آتی ہے تفریح پسند ہے- فلم دیکھنے کا شوق ہے اگر کوئی دکھا دے تو- اور ابا اجازت دے دیں تب- میں باتیں بنا رہی تھی اور اماں مجھے آنکھوں آنکھوں میں کھائے لیتی تھیں-

جب آپی چائے مع لوازمات کے لائیں میں کھڑے ہو کر انہیں پیش کرنے لگی- چٹ پٹی پھلکیاں، دہی بڑے، پیسٹری، پاپڑ، مٹھائی- اماں نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا ان مہمانوں کے لیے- آپی ہونق چپ رہی تھیں تو میں نے کہا-

''یہ ساری چیزیں میری آپی نے خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں- آپی بہت سلیقہ مند ہیں- ان کی دستکاری تو کمال کی ہوتی ہے-''

ان لوگوں نے اماں کا شکریہ ادا کیا اور کھا پی کر رخصت ہو گئیں-

میں جلدی سے باہر آ گئی- دوسرے دن افروز کی زبانی معلوم ہوا کہ تینوں ماں بیٹی مجھ پر سو جان سے فدا ہو کر گئی ہیں انہیں درزن باورچن کی نہیں ایک خوبصورت بہو کی ضرورت تھی-

آپی کی روئی روئی آنکھیں، اڑی اڑی رنگت اور افسردہ چہرہ دیکھ کر افسوس تو مجھے بھی ہوا- اماں

سخت ناراض تھیں- وہ ابا سے کئی بار جھگڑیں- میں نے اپنے غسلخانے سے ابا کی آواز سنی-

''ارے کمال کرتی ہو- بچی ہے وہ- بھلا اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے-''

مگر اماں مجھے مکار، چالاک اور بہن کی دشمن ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں- انہوں نے مجھ سے کچھ کہا نہیں لیکن ناراضی ان کے رویے، ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی-

گھٹا آ رہی تھی اور ہوا بھی تیز تھی- مجھے یہ موسم بہت پسند ہے- کاش ہمارے گھر جھولا ہوتا تو میں افروز کے ساتھ خوب پینگیں بڑھاتی- صحن میں ایک بے کار چارپائی پلنگ پڑا تھا- اس پر لیٹ کر املی چوستے ہوئے آسمان پر بادلوں کی یلغار دیکھ رہی تھی- بادلوں میں بھی خاصی چھین جھپٹ، مار دھاڑ اور شور شرابا ہوتا ہے- لگتا تھا جنگ ہو رہی ہے- گولے داغے جا رہے ہیں تو پیں دہاڑ رہی ہیں- کالے اور سفید بادل ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے- اچانک اماں میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں- میں نے تعجب سے انہیں دیکھا- انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت بھرے لہجے میں کہا-

''دیکھ میری بچی! میں ہاتھ جوڑتی ہوں- ایک بات کا وعدہ کر- میری عزت تیرے ہاتھ ہے-''

میں گھبرا کر بولی ''ارے اماں کہیے نا پھر-''

اماں کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر مجھے بہت خفت ہو رہی تھی-

اماں نے بتایا کہ پرسوں پھر کچھ لوگ آپی کو دیکھنے آ رہے ہیں- اماں چاہتی تھیں میں ان کے سامنے نہ جاؤں-

اماں مجھ بدتمیز، ڈھیٹ، موذی، بے حیا سے درخواست کر رہی تھیں کہ میں ان کی لاڈلی، سلیقہ شعار، تمیز دار، شیریں زبان ہرفن مولا پیاری بیٹی کے رشتے میں روڑے نہ اٹکاؤں- اپنے تمام تر خطابات، خامیوں سمیت ان کی اعلیٰ وارفع شہزادی کی شکست کا سامان نہ کروں- افسوس بھی ہوا، خوشی بھی افسوس اماں کی آپی سے بے پناہ محبت کا جس کی وجہ سے وہ میرے سامنے منت کرنے پر مجبور ہوئیں- خوشی اپنی کم بختی پر جو ہر بار آپی کو شکست دینے کا باعث بنتی-

میں نے اکڑ کر کہا- ''اچھا نہیں جاؤں گی ان کے سامنے، مگر میری کچھ شرطیں ہیں-''

اماں نے کہا ''اری کہہ- کیا شرطیں ہیں؟''

''ایک جوڑا اپنے فیشن کا تو ابھی دلوا دیں- دوسرا جوڑا آپی کی شادی کے بعد مجھے عمدہ سا دلوا دیں اور یہ جوڑے ان کپڑوں کے علاوہ ہوں گے جو آپی کی شادی میں میرے لیے بنیں گے- ایک سینڈل کالی چالی کا، اونچی ہیل کا- اور ہاں- میں جو بھی کھاؤں پیوں کوئی اعتراض نہ کرے- اور- ہاں بھیا فلم دکھائیں- یہ مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کریں تو میں کیا میرا سایہ بھی کسی کو نظر نہیں آئے گا-''

خوشی سے اماں کی حالت دیدنی تھی- ہنس رہی تھیں اور دعائیں دے رہی تھیں مجھے' چلتے چلتے

انہوں نے عجیب حرکت کی- جھک کر میرا منہ چوم لیا اور چلی گئیں- میں حیران حواس باختہ سی وہیں پڑی رہی- ساکت وصامت- آنکھوں میں پانی بھر آیا- نرم نرم سی کیفیت دل کو گدگدانے لگی- دل خوش کن سی- سبک سبک، غم آلود سا احساس میرے روئیں روئیں میں سنسنی سی دوڑانے لگا- شاید پہلی بار اماں نے مجھے پیار سے یوں چوما ہوگا- مجھے تو یاد نہیں کہ وہ نادیہ، افروز کے علاوہ کبھی مجھے پاس بلا کر لپٹاتی ہوں- پیار تو دور کی بات ہے-

آپی کافی مسرور و مطمئن نظر آئیں- میری خاطر بھی کر رہی تھیں- کبھی چپکے سے کیلا تھما دیتیں کبھی سیب' وقت مقررہ پر خواتین آئیں- ڈرائنگ روم میں بٹھائی گئیں- میں اندر بیٹھی رہی مگر عورتیں کھانے پینے میں مشغول تھیں- جانے کا نام نہ لیتی تھیں- کب تک قید رہتی- پچھلی طرف سے ہو کر باہر..... بھیا کے کمرے میں چلی گئی- یہ کمرہ خاص بھیا نے اپنے دوستوں کے لیے سجایا تھا تصویریں لگائی تھیں اور مچھلیوں کا ایکوریم بھی تھا- بھیا کو رنگین مچھلیاں بہت پسند تھیں اور مجھے بھی- میں اکثر بھیا کی غیر موجودگی میں مچھلیوں کا تماشا دیکھا کرتی تھی-

کمرے میں آنے کے بعد میں نے غور کیا کہ وہاں تو وجیہہ بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے ہیں- بھیا کے دوست ہی ہوں گے وجیہہ نے بے چینی سے مجھے دیکھا- میں دروازے کے قریب مچھلیوں کے پاس کھڑی تھی- وجیہ کو میری آمد شاید پسند نہ آئی- اگر مجھے معلوم ہوتا یہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے میں ہرگز نہ آتی- مگر اب آنے کے بعد فوراً واپس جانا بھی اچھا نہیں لگا-

میں بھیا کے سب دوستوں کے سامنے آتی تھی- وہ سب میری قابلیت کا امتحان لیا کرتے تھے اور خوب میرا مذاق اڑاتے مگر میں نے ان صاحب کو کبھی بھیا کے ساتھ نہیں دیکھا تھا- شاید یہ کوئی نیا دوست یا کرکٹ کا شائق ہوگا- وجیہہ نے باتیں کرتے کرتے مجھے بے چینی سے دیکھا- صاف ظاہر تھا وہ مجھے بھگانا چاہ رہا تھا- ان دونوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں- میں نے دوسرے آدمی کو دیکھا- پھر محض وجیہہ کو چڑانے کے لیے پوچھا-

''میں نے پہلے تو کبھی آپ کو دیکھا نہیں- کیا آپ کرکٹ کے کھلاڑی ہیں؟''

انہوں نے دلچسپی سے میرا جائزہ لیا- کافی اچھی شکل کا لڑکا تھا- اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور بال براؤن سے بولا تو آواز بھی بھاری اور اچھی لگی- بھیا جیسی-

آپ کو کرکٹ پسند ہے؟'' اس نے پوچھا-

''خاک!'' میں نے منہ بنایا-'' کوئی کھیل ہے بھلا؟ وقت کتنا ضائع ہوتا ہے؟''

''پھر کون سا کھیل پسند ہے آپ کو؟''

''آنکھ مچولی'' میں نے فوراً کہا-'' ہم اسکاؤں میں خوب کھیلتے ہیں-'' وہ مسکرائے- وجیہہ کو دیکھ کر کہا-

''ہاں- اچھا کھیل ہے-''
وجیہہ نے مجھے گھور کر کہا-
''اچھا قابلیت بگھارنا بند کرو- اور سب کہاں ہیں؟'' میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی- اطمینان سے بولی-
''سب ڈرائنگ روم میں ہیں- آپی کے رشتے کے واسطے کچھ مہمان آئے ہیں- اماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ سامنے نہیں جاؤں گی- آپی ان کی خاطر میں.....'' پھر ایک دم مجھے خیال آیا- اجنبی کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں اور میں بات ادھوری چھوڑ کر رک گئی-
''اچھا تم جاؤ- اور چائے وغیرہ یہاں بھی لاؤ-''
وہ مجھے ٹالنا چاہتا تھا- مجھے ضد ہو گئی- اس دن مجھے کیا سنگ کر رہا تھا میں کرسی پر بیٹھ گئی-
''کیوں؟ میں کیوں لاؤں چائے؟ وہاں سب کے سامنے جانے پر تو پابندی لگا دی گئی ہے- اب جاؤں گی تو سب یہی کہیں گے کہ جان بوجھ کر آئی ہوں-''
میں باتیں کرتی رہی- اجنبی بھی شریک گفتگو رہا- وجیہہ پہلے تو بھنا یا رہا- پھر اس نے مذاق اڑانا شروع کر دیا- میری بے وقوفی اور بے ڈھنگے پن کے قصے سنائے اور خوب طنز کیا-
''تو بس میں تو ایسی ہی ہوں- سارا سلیقہ اور تہذیب تو آپی کو دے دی اللہ میاں نے میرے لیے کچھ بچایا ہی نہیں-'' میں نے بڑی بے نیازی سے کہا-
وجیہہ نے میرے ہاتھوں برتن ٹوٹنے اور بدن پر کپڑا چار دن بعد پھٹ جانے کا بھی تفصیل سے ذکر کیا کہ میں جو کپڑا اپہنتی ہوں وہ دوسری بار پہننے کے لائق نہیں رہتا- چپل ہر ہفتے نئی آتی ہے- اور یہ کہ میرے ہاتھوں میں سوراخ ہیں جن کی وجہ سے برتن خود بخود نیچے جا گرتے ہیں- اور یہ کہ میں انتہائی منہ پھٹ، بد دماغ اور بد زبان ہوں- سونے پر سہاگہ- بدمزاج اتنی کہ ذرا سی بات پر خفا ہو کر ایک ہفتے سے ان کے گھر نہیں گئی-
جب ملازمہ چائے وغیرہ کمرے میں لے آئی تو میں منہ سجائے ان لوگوں کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی- جب کہ وہ دونوں قہقہے لگا رہے تھے-
''آؤ بھئی میزبان صاحب! اپنا فرض ادا کرو-'' وجیہہ نے مجھ سے کہا- ''چائے بناؤ-''
''میں نہ تو چائے پینا پسند کرتی ہوں نہ کسی کے لیے بناتی ہوں-'' میں تنک کر بولی-
''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ یہ کام بھی نہیں کر سکتیں ملکی کہیں کی-''
میں جھلا کر ان کے سامنے جا بیٹھی اور سلیقہ دکھانے کو چائے بنانے لگی- وجیہہ کی چائے میں نظر بچا کر میں نے گرم مسالا ڈال دیا جو دیر ہی بڑوں کے ساتھ الگ سے آیا تھا- ایک گھونٹ پیتے ہی وہ بگڑنے لگے- اتنے میں بھیا بھی آ گئے اور باتوں میں شریک ہو گئے میں اندر آ گئی- مگر مہمان

ابھی موجود تھے- ''اف اللہ! کب تک قید بھگتوں-؟''
میں اوپر چلی گئی- روشن آپا کو اماں سے کیے وعدے اور مہمانوں کی آمد کا بتایا- کچھ دیر بعد وجیہہ اوپر آئے اور مجھے گھورتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور روشن آپا کو اشارے سے بلا لے گئے- روشن آپا آئیں تو میں نے پوچھا-
''کیا بات ہے؟ وجیہہ بھائی اتنے چپ چپ کیوں ہیں میرا آنا برا لگا؟ چلی جاؤں؟''
روشن آپا ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے بولیں-
''پگلی لڑکی! وہ تم سے بہت خفا ہے- تم ادھر باہر کے کمرے میں کیوں گئیں؟ وہاں وہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کے رشتے کے سلسلے میں اس کی ماں بہن آئی تھیں؟ بھلا اس غیر آدمی کے سامنے تمہیں جانے کیا ضرورت تھی؟''
''ایں؟'' میں بہت پریشان ہوئی ''مگر مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں-''
''وہ تو اپنی ماں بہن کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا- وجیہہ گلی میں کھڑا تھا- جان پہچان اور کالج کے ساتھی کو دیکھ کر روک لیا- تم جو وہاں پہنچیں تو وجیہہ کو بہت غصہ آیا-''
''میں تو بھیا کا دوست سمجھ کر اندر بیٹھ گئی تھی- ان کو غصہ کیوں آیا؟ میں نے جرم تو نہیں کیا تھا-''
روشن آپا قدرے متفکر سی بیٹھی رہیں- میں نیچے آ گئی کئی دن خاموش سے گزر گئے- اماں کو میرے باہر کمرے میں جانے کا پتا نہیں چلا شاید- نہیں تو میری شامت آ جاتی ایک دن میں اسکول سے آ کر کھانا کھا کے باورچی خانے میں چلی گئی- آپی وہیں تھیں- مجھے دیکھ کر کندھا موڑ کر بیٹھ گئیں ان کی خفگی کا یہی انداز تھا- میں کھانا کھا رہی تھی کہ نادیہ بھی آ گئی- وہ آج اسکول سے جلدی آ گئی تھی- چپکے سے بولی-
''آپی پتا ہے آج کون آیا تھا؟''
''مجھے کیا پتا- میں تو اسکول سے ابھی آئی ہوں-'' میں نے کہا- نادیہ زور سے ہنسی- آپی نے مڑ کر ہمیں دیکھا- ان کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں- گلابی گلابی-
''اس دن جو لوگ آپی کے رشتے کے لیے آئے تھے نا وہی لوگ آج پھر آئے تھے-''
''اچھا!'' میں چہک کر بولی- ''تو اب آپی کی شادی ہو گی ہیں؟ مزا آئے گا- کتنے دن سے ہم نے کسی شادی میں شرکت نہیں کی- آپی- مجھے جوڑا بنا کر دینا- بھول نہ جانا- اماں نے بھی-''
میری بات پوری ہونے سے پہلے آپی وہاں سے چلی گئیں جاتے جاتے انہوں نے ایسی تند اور تلخ نظروں سے مجھے دیکھا کہ میرا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا- میں نے تعجب سے نادیہ کو دیکھا مگر آپی نے اسے آواز دے کر بلا لیا-
''پتا نہیں کیا بات ہے؟'' میں سوچتی اور کھانا کھاتی رہی-

ہاتھ دھو کر دوپٹے سے پونچھتی ہوئی جب میں باہر نکلی- روشن آپا زینے پر کھڑی تھیں- میری اس عادت سے اماں بہت چڑتی تھیں- انہیں دوپٹے پر چکنے دھبے دیکھ کر کراہیت آتی تھی- مگر مجھے عادت سی پڑ گئی تھی- میں روشن آپا کی طرف چلی گئی- وہ چپکے سے بولیں-

''صبح سے آئے ہوئے ہیں وہ لوگ-''

''اچھا!'' میں خوش ہو گئی- ''کیا کہتے ہیں؟''

''اونہہ! اماں کو بھی بس جھوٹ موٹ خوشامد کرانے کا شوق ہو رہا ہے- کر لیں اقرار-''

''اچھا آ.....'' یہ وجیہہ کی آواز تھی- جانے کب میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا-

''ہاں- اور کیا بیکار دیر لگانے سے فائدہ؟ ہائے اللہ کتنا شوق ہے مجھے شادی کا-''

روشن آپا کھلا کر ہنس دیں- ''معلوم بھی ہے وہ کیوں خوشامد کر رہے ہیں؟''

''انہی کو وجہ معلوم نہ ہو گی بھلا؟'' وجیہہ تلخ لہجے میں بولا- ''شادی کا اتنا شوق ہے-''

''ارے نہیں- یہ تو پگلی ہے-'' روشن آپا پیار سے بولیں- ''مجھے یقین ہے اسے قطعی خبر نہ ہو گی کہ اسی کو مانگنے کے لیے صبح سے وہ دو پہر تک وہ بیٹھے رہے-''

''کیا؟'' میرا سر گھوم گیا- بے تابی سے ان دونوں کے چہرے تکنے لگی-

''مگر..... میں تو..... ان لوگوں کے سامنے گئی تک نہیں سچی- انہوں نے تو آپی کو ہی دیکھا تھا-''

میں ہکلانے اور رونے کے قریب تھی-

''جس لڑکے کا رشتہ لینے آئے تھے وہ- اس کے سامنے تو گئی تھیں؟'' وجیہہ نے طنز کا تیر چلایا-

''بیٹھ کر باتیں بنا کر اپنا شیدا بنا لیا- اب کیسی معصوم بن رہی ہے-''

''اف میرے خدا'' میں بے بسی سے ان کو دیکھ کر رہ گئی روشن آپا نے پیار سے کہا- ''ارے انجانے میں وہ وہاں چلی گئی تھی- ماں بہن نے تو فوزیہ کو پسند بھی کر لیا تھا مگر وہ کہتا ہے کہ جس کو میں نے دیکھا ہے اسی سے کروں گا- اس بے چاری کا اس میں کیا قصور؟''

روشن آپا صفائی پیش کرنے لگیں-

وجیہہ بے حد خفا لگ رہا تھا اور میرا سانس رکا جا رہا تھا- ''ہائے رب- یہ کیا ہوا؟''

''آپا! تمہیں کچھ خبر نہیں- یہ تو ہمیشہ سے فوزیہ سے خار کھاتی ہے- اپنی اماں سے وعدہ کر لیا اور وہاں جا کر ڈٹ گئی- لاکھ میں اشارے کر رہا ہوں کہ کسی طرح وہاں سے ٹلے مگر تو سمجھتی ہی نہیں- فوزیہ کے مقابلے میں اس کے پاس نہ عقل ہے نہ شعور- ڈھنگ ہے نہ سلیقہ- نت نئے طریقوں سے اسے زک پہنچانا جانتی ہے- اماں ابا کا بھی خیال نہیں- ننھی بچی تو ہے نہیں-''

وجیہہ بے حد سنجیدہ اور قدرے رنجیدہ نظر آ رہا تھا دکھ سے میرا سینہ جلنے لگا- گلا کسی نے جیسے پکڑ لیا- میں بول نہ سکی اور بولنے کا فائدہ بھی کیا تھا- میں اسے ہرگز یقین نہیں دلا سکتی تھی کہ میں

بے قصور اور انجان تھی- نادان تھی-

جب وجیہہ نے جھلا کر کہا ''اب بسور کیوں رہی ہو- تمہیں تو خوش ہونا چاہیے- تمہاری تو خواہش پوری ہو گئی- فوزیہ کو رد کر کے وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں- اور تمہیں شادی کا کتنا شوق ہے-''

آنسو میری آنکھوں میں بھر آئے اور گالوں پر لڑھکنے لگے- چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر میں رونے لگی- ''دل پر چوٹ لگی تھی بے قصور ہوتے ہوئے خطاوار ٹھہرائی جا رہی تھی- اپنی آپی کے راستے کا روڑا بن گئی تھی- اماں ابا کی فکروں میں اضافہ کر رہی تھی- کیسی بدنصیب تھی میں- جب وجیہہ کو اتنا احساس ہے تو اماں تو- اماں سو فیصد مجھے ہی ذمہ دار ٹھہرا رہی ہوں گی-

''اب میں اماں کا سامنا کیسے کروں گی؟ آپی کو کیسے بتاؤں گی- میں نے کچھ نہیں کیا- نہیں- میری بات کا کسی کو یقین نہیں آئے گا- ہائے کمبخت- میں وہاں گئی ہی کیوں-'' روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی- روشن آپا چپ کرانے کی کوشش کرتے کرتے تھک گئیں-

''لے میری بہنا- ایک گھونٹ پانی پی لے- ذرا جی ٹھہرے سیما ذرا سا گلوکوز تو لانا- ہائے اللہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے ارے نازی خدا کے لیے چپ ہو جا- وجیہہ تو بے وقوف ہے میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں-''

میں سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی..... وجیہہ وہیں بیٹھا مجھے کچوکے لگاتا رہا-

''بن بن کے رو رہی ہے- جھوٹ موٹ ہچکیاں لے رہی ہے- اندر سے تو خوش ہو گی- اس کو گدگدی کرو- دیکھو فوراً ہنسے گی-''

روشن آپا نے ڈانٹ کر کہا ''اچھا- تم چپ ہو جاؤ اور تم نے ہی اسے رلایا ہے- تمہی چپ کراؤ- بے چاری کے سر میں درد ہو جائے گا-''

وجیہہ بڑے نخروں سے کراہتا ہوا میرے پاس آیا گلاس ہاتھ میں لیے- کہنے لگا-

''اچھا، اب چپ ہو جاؤ ورنہ یہ پانی تمہارے سر پر ڈالتا ہوں- سیما! اس کو گدگدی کرو-''

سیما نے کہا- ''ماموں یہ سچ مچ رو رہی ہیں-''

''اچھا'' بڑی حیرت سے فرمایا گیا ''تو اس کا ایک ہی علاج ہے- لوٹا بھر کر پانی لاؤ سر پر تیتڑا جائے- ٹھنڈک پڑ جائے گی تو آنسو بند ہوں گے- چلو سیما- لوٹا-''

میں چپ ہو گئی- وجیہہ سے کچھ بعید نہ تھا- کہ لوٹے کے بعد بالٹی بھر پانی منگاتا- وہ اور سیما مسلسل بولتے رہے میں سر نیچا کیے دری کے دھاگے توڑتی رہی- آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی- اور سر بھاری تھا- اماں کا سامنا کیسے کروں گی؟ یہ فکر بدن کپکپانے کو کافی تھی- آپی پر رحم آ رہا تھا- اپنے اوپر غصہ- میں اتنی کم عقل کیوں تھی-

شام ہو گئی تو میں چوروں کی طرح نیچے آئی- اماں کی نظر بچا کر پچھلے برآمدے میں جا بیٹھی-

افروز وہاں گڑیوں کا سامان سمیت رہتی تھی- میں اس کی مدد کرنے لگی- افروز کے جانے کے بعد میں اکیلی بیٹھی ڈرتی رہی- آج اماں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گی- میں کوئی بہانہ بھی تو نہیں بنا سکتی تھی جھوٹ بولنے کی میری عادت نہ تھی اور ابا جھوٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے-

ابا کو بری عادت سے نفرت تھی- وہ بے حد شفیق نرم دل، نرم گفتار اور اصولوں کے معاملے میں سخت انسان تھے- وہ اولاد پر بے جا پابندیوں کے خلاف تھے اور بے جا آزادی کو بھی ناپسند کرتے تھے- وہ لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے مگر شادی کے معاملے میں ماں باپ کے فیصلے کو ترجیح دیتے تھے- خود وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے- مگر ان کے والدین نے اماں جیسی جاہل عورت سے ان کی شادی کر دی اور انہوں نے کبھی اس کا شکوہ نہ کیا- البتہ شادی کے بعد خود اماں کو لکھنا پڑھنا سکھایا- وہ کہتے تھے عورت کو حساب کتاب میں ماہر ہونا چاہیے- گھر ہستن عورت کے لیے سب سے ضروری حساب کا آنا ہوتا ہے- اور اگر وہ ماہر ہو تو نہایت عمدگی سے گھر چلا سکتی ہے- قابل تعریف بچت بنا سکتی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی کر سکتی ہے- ابا کبھی اماں سے بحث نہیں کرتے تھے- خصوصاً اولاد کے سامنے وہ اماں پر اعتراض نہیں کرتے تھے- اور اگر کبھی اکیلے میں کرتے بھی تھے تو الفاظ بے حد نرم اور لہجہ گداز ہوتا- کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ نکتہ چینی کر رہے ہیں- وہ ہم لوگوں سے بھی دھیمی آواز میں بولتے تھے- گھر بھر میں سب سے زیادہ مجھے اپنے ابا عزیز تھے- ان کے بعد بھیا-

رات ہوگئی- ابا کے آنے کے بعد کھانے کے لیے سب کو پکارا جانے لگا- میں ڈرتے ڈرتے اندر گئی تو سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے- سوائے میرے اور بھیا کے- بھیا میرے پیچھے آ رہے تھے- سر پر دھپ لگا کر بولے-

''قدموں کے نیچے زمین نہیں ہے کیا- بادلوں پر چل رہی ہو یا اڑ رہی ہو؟''

میں ابا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی- اتنی مہلت نہ تھی کہ نظر اٹھا کر آپی یا اماں کا چہرہ دیکھتی- بے حد خاموشی سے کھانا ختم ہوا- رات مجھے نیند بھی نہ آئی- پتا نہیں بارہ بجے تھے یا اس سے بھی زیادہ کا وقت تھا- اماں ابا کی باتوں کی آواز آئی- آپی بے خبر سو رہی تھیں- ان کے برابر افروز کا پلنگ تھا- نادیہ اماں کے کمرے میں سوتی تھی- سناٹے میں ابا کی دھیمی آواز صاف سنائی دی-

''حد کرتی ہو بانو- ابھی اس نے میٹرک بھی نہیں کیا ہے ارے وہ بچہ ہے-''

اماں نے آہستہ سے کچھ کہا- ابا نے پھر ذرا تیز لہجے میں کہا-

''چھوڑو چھوڑو- مجھے بے سروپا قصوں سے دلچسپی نہیں ہے- مجھے کچھ نہ سناؤ-''

''بھئی- اچھا- ہوگا- ہوگا- تم نے اسے جانے کیا سمجھا لیا ہے- میں اسے محض ایک بھولی بھالی بچی سمجھتا ہوں-''

''تم سمجھتے رہو-'' اماں غصے میں اونچی آواز سے بول اٹھیں- ''مگر وہ بچی نہیں ہے- اس عمر میں

میری بھی تو شادی ہوئی تھی- ایک اچھے رشتے کو محض اس لیے ٹھکرانا مناسب نہیں کہ ہماری لڑکی نے میٹرک نہیں کیا- ارے وہ کھلنڈری سے اگر بیس برس میں میٹرک نہ کرے تو کیا اس کی شادی ہی نہ ہو گی- دوسرے یہ کہ لڑکے والوں کو تو کم تعلیم پر اعتراض نہیں ہے-''

''میں تو لڑکی کو جاہل رکھنے کے خلاف ہوں-'' ابا نے پھر کہا- ''اور شادی کے بعد تو تعلیم کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے مگر تم یہ بات نہیں سمجھو گی- میں نازی کو بی اے کرانا چاہتا ہوں- وہ چاہے گی تو اور آگے پڑھ لے گی- بس- اب اس بات کو چھوڑ دو-''

میں سانس روکے سن رہی تھی- کہیں کوئی آواز نہ تھی- جھینگر بھی خاموش تھے- میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں اس کی آواز بخوبی سن رہی تھی- جیسے کہیں کوئی گھڑیال وقت کا اعلان کرتا ہے، اسی طرح دل بھی خوف اور تجسس کے اظہار میں پوری قوت سے بج رہا تھا- دھڑ دھڑ- دھک دھک-

''لڑکا خوبصورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے- اپنا کاروبار ہے- پتا نہیں دو چار سال بعد پھر ایسا رشتہ آئے نہ آئے-'' اماں نے پھر ذکر چھیڑ دیا- ''ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو- چار لڑکیاں بیاہنی ہیں- نہ جن کے پاس حسن کی نعمت، نہ جہیز- نہ ہی غیر معمولی تعلیم- ہم جیسوں کے لیے تو ایسا رشتہ نعمت ہے نعمت-''

''تو فوزیہ کی باری ہے- اسی کے لیے سوچو-'' ابا قدرے دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے-

''اس کا- بعد میں دیکھا جائے گا- ویسے بھی نازی کی موجودگی میں فوزیہ کا رشتہ آنا مشکل ہے-''

''کمال کرتی ہو بانو-'' ابا چڑ گئے-

''کمال میں نہیں تمہاری لاڈلی کرتی ہے-'' اماں بھی بھنا کر بولیں- ''جب بھی فوزیہ کے لیے لوگ آتے ہیں نازی کو پسند کر لیتے ہیں- اب کیا کروں میں- میری تو کوئی بات وہ مانتی نہیں- خرد ماغ- جو بھی آئے گا اسے ہی مانگے گا- کہاں تک کمسنی کے بہانے کروں- سوچتی ہوں یہ قصہ پہلے ہی ختم کر دوں بعد میں فوزیہ کے لیے جو بھی آئے گا جلدی کر دیں گے- ان لوگوں نے تو جہیز کی شرط بھی نہیں نہ کہی- کہہ رہی تھیں ہمیں لڑکی چاہیے صرف لڑکی- کچھ سوچیے-''

''اچھا- اچھا-'' ابا نے بارمان لی- ''صحیح تو ہونے دو- ارشد سے بھی مشورہ کر لو-''

اس کے بعد جانے اور کیا باتیں ہوئیں- دل دھڑک دھڑک کر اوسان خطا کیے دیتا تھا- ابا رضامند سے ہو گئے میرے کان دل کے شور نے بند کر دیے- سر چکرانے لگا- رات کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی اور شادی کے خوف نے مجھے پاگل بنا دیا تھا-

''ارے- کس سے کہوں- مجھے آپی کی شادی کا شوق ہے- اپنی شادی کا نہیں- میں تو پڑھنا چاہتی ہوں- ابا کی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھی سی نوکری کروں- افسر کہلاؤں- اور سلیمہ بھابھی کی طرح ٹھاٹھ کی زندگی گزاروں- کیسے رعب سے دفتر میں کام کرتی ہیں- چپراسی

دروازہ کھولتا ہے۔کلرک کرسی کھسکاتے ہیں۔منیجر آگے پیچھے گھسیاتے پھرتے ہیں اور وہ تلخی سے۔ غصے سے بلند آواز میں سب کو جھڑکتی ہیں۔ذرا کسی سے نہیں ڈرتیں۔ایم۔ڈی کہلاتی ہیں۔بڑے بڑے اعلیٰ آفیسران کی دعوت کرتے ہیں۔کاریں تو۔آس پاس رہتی ہیں جیسے۔''

صبح دیر سے جاگی۔اسکول بھی نہیں گئی۔سر میں سخت درد تھا۔جب ابا دفتر اور بھیا کالج چلے گئے۔ نادیہ اور افروز بھی اسکول چلی گئیں۔میں اٹھی۔منہ ہاتھ دھویا اور تیر کی طرح زینے پر چڑھی۔بر آمدے میں وجیہہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ایک ابرو اچکا کر مجھے دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگے۔ روشن آپا اپنے کمرے میں تھیں۔بستر تہ کر رہی تھیں۔ان کے میاں بھی آفس اور بچے اسکول جا چکے تھے۔مجھے دیکھ کر حیران ہوئیں میں حواس باختہ سی کھڑی تھی۔وہ گھبرا کر بولیں۔

''اسکول کیوں نہیں گئیں؟ بیمار ہو گیا کیا؟''

میں ہکلا کر رہ گئی۔''اماں۔وہ روشن آپا۔اماں.....''

''وہ۔ہوا تو کچھ نہیں مگر اماں۔'' منہ سے بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔جیسے کسی نے گلا بند کر دیا تھا۔انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور بستر پر بٹھا دیا۔

''اب بتاؤ کیا ہے گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

میں ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔پہلے ہی کچھ بولا نہ جاتا تھا۔اب جو روشن آپا نے ہمدردی کی تو دل بھر آیا۔کیسے کہوں۔الزامات کی فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے اور سزا کا وقت قریب آ رہا ہے۔میں مجرم نہیں ہوں مگر فیصلہ میرے خلاف ہی دیا جا رہا ہے۔

''ہائے اللہ تم تو کچھ بتاتی ہی نہیں ہو۔'' روشن آپا مجھے جھنجھوڑ کر بولیں۔''ٹھہرو۔میں خود نیچے جا کر پوچھتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر جانے لگیں تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔بامشکل دل قابو میں کیا اور اٹک اٹک کر رات کی ساری باتیں روشن آپا کو بتائیں۔آنسو بے تابی سے بہتے رہے۔بات ختم ہوئی تو روشن آپا متفکر سی بیٹھی تھیں۔میں آنکھیں رگڑ رہی تھی۔تبھی وجیہہ نے اندر قدم رکھے اور ٹھٹھک کر ہمیں دیکھنے لگے۔

''کیا بات ہے آپا؟ اس قدر سوگواری۔'' وہ حیران اور پریشان باری باری ہمیں دیکھنے لگے۔

روشن آپا نے کہا۔'' یہ لڑکی ہر روز ایک نئی بات سناتی ہے۔'' کہہ کر مختصر الفاظ میں اماں کے ارادے۔ابا کی نیم رضامندی کا بتایا۔وجیہہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔''پھر اب؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''اب نازی کی شادی ہوگی۔فوزی کی بعد میں۔'' روشن آپا کچھ سوچ رہی تھیں۔وجیہہ نے دیوار پکڑ کر سہارا لیا اور عجیب لہجے میں کھینچی ہوئی آواز سے کہا۔

''آپا..... آپا.....!'' روشن آپا اسے سخت نظروں سے گھورنے لگیں۔وہ باہر چلا گیا۔میں اپنے

خیالوں میں گم ہو گئی۔

''تم کیا چاہتی ہو اب؟'' روشن آپا نے پوچھا۔''تمہارے والدین کے فیصلے ہیں۔ظاہر ہے میں دخل نہیں دے سکتی'' میں نے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔مجھے رونا آ رہا تھا۔

''آپا! بس ایک بار آپ اماں کو بتا دیں یا سمجھا دیں۔میں..... پڑھنا چاہتی ہوں۔کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ابھی تو میں اتنی بڑی بھی نہیں ہوں۔انہیں میری فکر نہیں ہوئی چاہیے۔بس کسی طرح بھی آپی کی شادی کر دیں۔میں انہیں کبھی پریشان نہیں کروں گی۔ان کی ہر بات مانوں گی۔''

''مگر کیوں۔وہ مجھ سے میری ہمدردی کی وجہ پوچھیں گی۔میں تم سے پوچھتی ہوں۔بتاؤ۔ تمہارے انکار کی وجہ کیا بتاؤں؟''

''کہہ تو رہی ہوں میں شادی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی مجھے طریقہ نہیں آتا۔کام وام نہیں کر سکتی۔کسی کو خوش نہیں رکھ سکتی۔میں تو پڑھ لکھ کر افسر بننا چاہتی ہوں۔'' میری نظروں میں سلیمہ بھابھی کا شاہانہ طرز زندگی تھا۔کیا رعب سے رہتی ہیں۔

''اچھا؟ ایک بات تو بتاؤ۔کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟''

''ایں؟'' میں بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھنے لگی۔

''ضرور ایسی ہی کوئی بات ہے۔'' وہ ہنسنے لگیں۔میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔بڑی شرم آئی اور میں ان سے خفا ہو گئی۔انہوں نے فوراً اپنے بھائی کو پکارا۔

''وجیہہ! وجیہہ: جلدی آؤ۔!''

میں باہر بھاگی مگر دروازے سے وجیہہ اندر آ رہے تھے میں ٹکرا گئی۔انہوں نے میرا بازو تھام لیا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔روشن آپا کہہ رہی تھیں۔''وجیہہ اسے پکڑ لاؤ۔'' وہ مجھے دھکیلتے ہوئے اندر لائے۔روشن آپا ہنسی سے بے تاب ہوئی جا رہی تھیں۔وجیہہ کو دیکھنے لگیں۔ دونوں بہن بھائی نے آپس میں نظروں سے اشارے کیے۔

''تو پھر کیا خیال ہے نازی۔تمہاری اماں سے بات کروں؟'' وہ مسکرا رہی تھیں۔اور وجیہہ سے مخاطب تھیں۔حالانکہ نام میرا لے رہی تھیں۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔'' وجیہہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر وہ فوزیہ۔''

''ارے وہ اتنی اچھی لڑکی ہے۔اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔اگر یہ (میری جانب اشارہ) سامنے نہ جائے تو یوں چٹکی بجاتے شادی ہو۔'' مجھے غصہ آنے لگا۔ہر وقت سامنے جانے کا ذکر۔ غلطی ہو گئی۔اس سے پہلے بھی تو جب میں واقف تک نہ تھی آنے والی خواتین مجھ پر رشک کی تھیں۔

''اب جو بھی رشتہ لائے گا- میں خود ان سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ اللہ میری آپی کو پسند کرلو- وہ بہت خوبیوں والی ہیں اور میں- نہایت بدتمیز، جاہل، پھوہڑ، بے عقل-''

روشن آپا نے مجھے گلے سے لگا کر کہا- ''ارے نہیں- میری نازی تو بہت اچھی ہے بھولی بھالی- پیاری-''

''بس بس-'' وجیہہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا- ''زیادہ تعریف نہیں کریں- نہیں تو شیخی میں پھول کر کپا ہو جائے گی- اور تمہیں پتا ہے مجھے پھولی ہوئی بکوری پسند نہیں-''

وجیہہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے- روشن آپا مجھے بٹھا کر چلی گئیں- کچھ دیر بعد وجیہہ آئے-

''آپا کہاں ہیں؟''

میں نے بتایا ''نیچے گئی ہیں-''

''افوہ!'' انہوں نے مجھے بغور دیکھا- ''سفارش لے کر گئی ہیں- خوب خوشامد ہو رہی ہے آپا کی-''

''میں خوشامدی نہیں ہوں-'' میں بھنا گئی-

''مجھے تو ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے- ان کی عقلوں پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو فوزیہ کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں بھلا کہاں وہ کہاں تم-'' وجیہہ میرا مستخراڑانے کے درپے تھے-

''خوب!'' میں نے جھلا کر کہا- ''اتنی ہی آپی پسند ہیں تو خود کیوں نہیں ان سے شادی کر لیتے؟''

''بھئی، اصل میں-'' وہ ٹپٹا کر بولے ''مجھے تو خالہ جان بے چاری کا خیال آتا ہے- وہ اس قدر پریشان ہیں- کہتے ہیں جوان لڑکی بھاری پتھر ہوتا ہے جو جتنی جلدی اتارا جائے اچھا ہے-''

''تو اتار دیں ان کا بوجھ- اتنی ہمدردی ہے تو.....''

وجیہہ نے بھنا کر مجھے مارنے کو ہاتھ اٹھایا- پھر رک گئے اور سختی سے بولے ''خبردار- آئندہ ایسی بات نہ کرنا- میں اسے بہن سمجھتا ہوں-''

''تو کیا ہوا- سگی بہن تو نہیں- ہیں نا- اتنی سلیقہ مند- سمجھدار- اور- اور- کیا؟'' میں انہیں دیکھنے لگی تاکہ وہ خود وہ الفاظ مجھے یاد دلائیں جو آپی کی تعریف میں ہر وقت ان کی زبان پر رہتے تھے-

''دیکھ- دیکھ نازی کی بچی!'' وہ بے چینی سے گردن ہلانے لگے- ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے پریشان لہجے میں کہنے لگے ''آئندہ یہ ذکر نہ ہو- سنا-''

''کیوں؟'' میں تعجب سے پوچھ بیٹھی-

''اس لیے- اس لیے کہ مجھے اتنی زیادہ مہذب، باشعور سلیقہ مند لڑکی راس نہیں آ سکتی- ارے بابا- میں خود بہت بے ڈھنگا ہوں- سیدھا سادا اور معصوم ہوں- اپنے لیے، اپنے جیسی لڑکی ہی

پسند کروں گا-''

''معصوم؟'' میں بے ساختہ ہنسی- ''اور اگر وہ لڑکی جناب کو پسند نہ کرے تب؟''

''کیوں نہیں کرے گی؟ کوئی عیب تو مجھ میں ہے نہیں ہے نا؟''

روشن آپا آ گئیں اور آتے ہی باورچی خانے میں گھس گئیں- وجیہہ کے ناشتے کے لیے وہ دودھ چولہے پر چھوڑ کر گئی تھیں- جو ابال ابال کر آدھا بھی نہیں رہا تھا- شاید وہ مجھ سے کہہ گئی تھیں- میں بھول گئی- وجیہہ نے مجھے گھورا- پھر ہنس دیے-

اس دن کے بعد کافی دن روشن آپا کے گھر جانا نہ ہو سکا- اسکول میں ڈرامے ہونے والے تھے- مجھے بھی ایک کردار دیا گیا تھا- میں تو ایکٹنگ جانتی نہیں تھی مگر مس فاخرہ نے مجھے لڑاکا پڑوسن کا رول دیا اور ریہرسل پر ہی وہ میری اداکاری کی قائل ہو گئیں-

میں اب گھر اور اسکول میں زیادہ مصروف رہنے لگی افروز چپکے سے بتایا کہ ''وہ لوگ ابھی تقاضا کر رہے ہیں- اور ابا نے تحقیق کے بہانے سوچنے کی مہلت مانگ لی ہے مجھے اب آپی پر ترس آنے لگا- اماں ان کی وجہ سے بے حد پریشان رہنے لگی تھیں- یہ بات بھی افروز ہی نے بتائی- مجھے خود پر غصہ آتا- کہ جانے لوگوں کو مجھ میں کیا خوبی نظر آتی ہے بس ذرا رنگ ہی تو سفید ہے اور قد لمبا- بال کچھ سنہری اور باریک جب کہ آپی کے بال سیاہ تھے- آنکھیں بھی مجھ سے بڑی بڑی- کتنی اچھی لگتی تھیں جب نہا کر بال سکھاتی تھیں-

اماں یوں تو میری بچپن سے ہی مجھ سے نالاں رہتی تھیں مگر آج کل ان کی خفگی آپی کی وجہ سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی- اور میں اسے کم کرنے کے لیے ان کی ہر بات مانتے کو تیار تھی مگر ایک جھجک سی اماں کے سامنے آنے لگی اور میں ان کی نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر پھرتی- یا ان کے آگے آنے سے گریز کرتی- ایک دن نادیہ اور افروز کو میں نے ادھر ادھر لپ جھپ پھرتے اور کاموں میں مصروف دیکھا پتا چلا اماں کی طبیعت بہت خراب ہے- ڈاکٹر نے آرام کی ہدایت کی ہے- میں پریشان ہو کر کمرے میں جانے لگی تو آپی نے روک لیا- ''چلو ہٹو- ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی کمرے میں جائے-''

''تو آپی! تم بھی تو جاتی ہو- نادیہ اور افروز بھی جاتی ہیں-''

''میں ان کے کام کرتی ہوں-'' آپی کے سانولے چہرے پر فکر کی سرخی چھانے لگی- ''سر دباتی ہوں- دوا پلاتی ہوں- نادیہ افروز ہاتھ بٹاتی ہیں-''

''آپی- میں بھی ہاتھ بٹاؤں گی- نادیہ کی جگہ-'' میں لجاجت سے انہیں دیکھنے لگی-

''ہاں ضرور بٹاؤ گی-'' تلخی سے بولیں- ''اماں کی حالت یہ ہے کہ زور کی چاپ برداشت نہیں کر سکتیں اور تم جس چیز کو ہاتھ لگاؤ گی وہ زمین پر گرا دو گی- میز کرسی کو ٹھوکر مارو گی پلنگ

کو دھکا دو گی۔''

آپی سچ کہہ رہی تھیں۔ مگر میں یہ سب جان بوجھ کر تو نہیں کرتی۔ سب کو میز کرسی، پلنگ کی فکر ہوتی ہے۔ میرے گھٹنے کے نیل یا پیر کے انگوٹھے کے زخم کی پروا بھی نہ تھی۔ صحن میں گھنٹوں بیٹھی رہی اور موقع پاتے ہی چپکے سے کمرے میں گھس گئی۔ نادیہ چمچے سے اماں کو جوس پلا رہی تھی۔ اماں کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ بے حد کمزور لگ رہی تھیں۔ میں ان کے سرہانے کھڑی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار یا حرارت جاننے کی کوشش کی۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ انہیں کیا بیماری ہے۔ اماں نے کمزور ہاتھ سے میرا ہاتھ ماتھے سے ہٹا دیا اور خفگی سے بولیں۔

''اب بھی کیوں آئی ہو؟ ابھی میں زندہ ہوں۔ مر جاؤں تو آنا رونے کے لیے۔''

دل دھک سے رہ گیا۔ جیسے کسی نے مجھے دھکا دے کر گہرے کنویں میں گرا دیا ہو۔ میں آنسو روکے چپ چاپ کھڑی رہی۔ کہہ نہ سکی آپی نے مجھے روکا تھا اماں۔ ابا کمرے میں آئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ جوس ختم ہوا تو اماں نے کمزور آواز میں تولیہ مانگا۔ نادیہ بیٹھی تھی۔ میں کھڑی تھی۔ میں نے کرسی کے ہتھے سے تولیہ اٹھا کر اماں کو دے دیا۔ وہ رو کے لیجے میں بولیں۔

''رہنے دو۔ کیوں تکلیف کرتی ہو۔'' میں سن ہو گئی۔ دل پر چوٹ لگی۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اماں نے دیکھ لیا۔ پھر اسی خشک لہجے میں بولیں۔

''اب ٹسوے تو بہاؤ نہیں۔ مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے نہ تمہارا احسان ہی میں اٹھا سکتی ہوں۔ نفرت ہے مجھے تمہاری صورت سے۔'' میرا سر چکرانے لگا۔ اس قدر نفرت کے اظہار کی توقع نہ تھی۔ اپنے مجھے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔

لڑکھڑاتے قدموں اور امڈتے آنسوؤں کے ساتھ میں باہر آئی اور پچھلے برآمدے میں جا کر تخت پر گر گئی بے بسی، محرومی اور اپنی بدنصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنی بدقسمت ہوں میں۔ میری ماں مجھ سے نفرت کرتی ہے اور مجھے آج تک اس نفرت کو کم کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں اپنی جنت سے بہت دور تھی۔

''اماں! اماں!'' میرا روواں روواں اماں کو پکار رہا تھا اپنی جنت کو آواز دے رہا تھا۔

جانے روتے روتے کب میں تھک کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا تھا۔ شاید صحن میں کھانا ہو رہا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر بغیر بلائے کیسے جاؤں اور کس سے کھانا مانگوں۔ آپی فوراً کہیں گی۔ اسے اماں کی بیماری کی فکر نہیں۔ میرا کھانا دیسے ہی بدنام تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کس ترکیب سے کھانا مانگا جائے ... کہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی ابا کی محبت بھری آواز۔

''نادیہ!'' میرا دل بھر آیا۔ رکے ہوئے آنسو پھر آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ ابا نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ''بیٹی! اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ کھانا کھایا تم نے؟''

میں نے گردن کے اشارے سے انکار کیا۔ ہلکی سی روشنی برآمدے میں آ رہی تھی۔ شاید انہوں نے میری آنکھیں دیکھ لیں جن سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے سینے سے لگا کر بہلانے کے انداز میں کہنے لگے۔

''ارے ارے۔ میرا بیٹا تو رو رہا ہے۔ کیا ہوا، کس نے مارا؟'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ''ابا! سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں؟''

میرے سر پر ابا کا سہلاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ کہنے لگے۔ ''کیا تم کو اپنی اماں کے الفاظ سے اتنا رنج پہنچا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا احساس اتنا مردہ نہیں جتنا وہ سمجھتی ہیں۔ دیکھو بیٹی! تمہاری اماں بہت زود رنج اور زود حس ہیں۔ تم اپنی بہنوں میں الگ مزاج اور طبیعت کی ہو اس لیے وہ تم سے شاکی رہتی ہیں۔ اب تو بیماری کی وجہ سے چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ اسی لیے کچھ سخت سست کہہ دیا۔ تم ان کی بات کا برا نہ ماننا۔ تمہاری کوشش ہونی چاہیے کہ ان کو تم سے شکایت نہ ہو اور کوئی دکھ نہ پہنچے۔''

''ابا! میں تو چاہتی ہوں کہ میری ذات سے کسی کو بھی تکلیف نہ ہو مگر پھر بھی۔''

''اور سب کہتے ہیں کہ تم کسی کو راحت نہیں پہنچا سکتیں۔'' ابا کا مشفق چہرہ مسکراہٹ سے منور ہو گیا۔ ''اسی لیے سب تم سے ناراض رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں اس میں تمہاری لاابالی طبیعت اور بے نیازی کی عادت کا بھی دخل ہے۔ دیکھو بیٹا: سب سے مل جل کر دکھ سکھ میں شریک بن کر ہی ہم دوسروں کے دل میں جگہ بنا سکتے ہیں۔ ذرا سا اپنی طبیعت پر جبر کر کے کسی کو آرام پہنچانے میں بے اندازہ مسرت ہوتی ہے۔ والدین تو اولاد کے لیے بہت سی قربانیاں دیتے ہیں۔ اولاد کو اس وقت اندازہ نہیں ہوتا۔ اور ماں تو بہت سی تکلیف اٹھا کر ایثار قربانی کے بے شمار پہاڑ سر کر کے بچوں کو پالتی ہے۔ ان کی بہبود کے لیے ہر دم کوشاں رہتی ہے۔ تمہاری اماں تو دشمن سے بھی نفرت نہیں کر سکتیں۔ ان کی فطرت میں نفرت نہیں ہے۔ محبت، شفقت کی نرمی ہے۔ بس وہ زود رنج ہونے کی وجہ سے چڑچڑی اور جھنجلاہٹ کی ہوئی رہتی ہیں۔ محض الفاظ ادا کرنے سے کوئی نفرت نہیں کرتا۔ یہ تو دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ ہے۔ بس۔ تم ان کو آرام پہنچانے ان کا حکم ماننے کی کوشش کرو۔ وہ تم سے بھی ویسا ہی سلوک کریں گی۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔''

''ابا! کیا وہ سچ مچ سخت بیمار ہیں؟''

''نہیں بیٹا: گھر خطرہ تھا۔ شکر ہے ٹل گیا۔ انہیں خوش کرنا اب تمہارا فرض ہے۔''

میں نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ وہ مجھے پکڑ کر باہر لے آئے۔ پھر کھانے کے کمرے میں لے جا کر آپی پر بہت خفا ہوئے۔ وہ برتن سمیٹ چکی تھیں۔ میز صاف کر رہی تھیں۔

''بہت افسوس کی بات ہے فوزی۔ تم سب نے کھانا کھا لیا اور نازی کو بلایا ہی نہیں۔ میں تمہاری

اماں کے پاس بیٹھا تھا۔تم بڑی تھیں۔تمہیں احساس نہیں ہوا کہ چھوٹی بہن موجود نہیں ہے اسے بلانا چاہیے۔ایک تو ماں کی بیماری کی پریشانی۔دوسرے بھوک۔وہ وہیں سوگئی تھی۔میں نہ جاتا تو صبح تک پڑی رہتی۔

بیٹی! سب کو اپنے فرائض کو احساس ہو تو کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہ رہے۔چھوٹوں سے رواداری اور شفقت کا سلوک کرنا چاہیے۔''

میں نے ابا کے ساتھ کھانا کھایا۔آپی نظریں جھکائے بیٹھی رہیں۔مجھے یقین ہے ان کی آنکھوں میں تھرکی بجلیاں تڑپ رہی ہوں گی میرے لیے۔میری وجہ سے ان پر ڈانٹ پڑی۔شاید پہلی بار۔

اماں ٹھیک ہوگئیں۔ڈاکٹران کی دیکھ بھال اور دواؤں کا سلسلہ قائم تھا۔ابا ان کی دواؤں کا خیال رکھتے۔وقت پر گولیاں کھلاتے اور آپی ان کے لیے جوس،سوپ وغیرہ کا اہتمام کرتیں۔میں نے بھی خود کو کافی بدل لیا تھا۔اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔جو لوگ عیادت کو آتے وہ آپس میں باتیں کرتے اماں پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ہلکا سا تھا مگر ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کسی بھی بڑے رنج،صدمے یا کسی تکلیف کے پہنچنے سے دوسرا حملہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ تو میں نے کئی لوگوں سے سنا تھا کہ ہارٹ اٹیک کے تیسرے حملے کو برداشت کرنا انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے۔میں سوچتی میری وجہ سے اماں کو کوئی دکھ پہنچا۔اور ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تو آپی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گی۔اس خوف سے میں اماں کے کام بھی کردیتی۔آپی کا ہاتھ بھی بٹاتی برتن ہاتھوں میں لیتی تو اتنی مضبوطی سے پکڑتی کہ انگلیاں سفید ہوجاتیں۔سب سے مشکل مرحلہ کھانے پینے میں کمی کا تھا مگر میں اسے بھی سہار گئی۔جب بھی بھوک بے وقت لگتی اور زبان چٹخارے کی طلبگار ہوتی میں اماں کی اجازت سے خود بھی کھاتی اور نادیہ اور افروز کو بھی دیتی۔اماں کی خفگی بہت کم ہوگئی۔آپی بھی مجھے کام کرتے دیکھ کر مسکراتیں۔ابا بے حد خوش رہنے لگے تھے۔میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش جو کررہی تھی۔

☆☆

میٹرک کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔اسکول میں کافی سختی سے پڑھائی ہورہی تھی۔گھر پر بھی میں دیر تک پڑھتی۔ایک روز اسکول سے باہر آنے میں مجھے کچھ دیر ہوگئی۔تانگے والا نادیہ اور افروز کو لے گیا تھا۔اب اس کا آنا غیر یقینی تھا۔میں پیدل ہی گھر کی طرف جانے لگی۔کچھ ہی دور گئی ہوں گی کہ اچانک ایک سفید کار میرے پاس آکر رک گئی۔میں ٹھٹھک گئی۔کار میں صرف ڈرائیور تھا۔ابھی میں نے اسے ڈانٹنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا چہرہ شناسا لگنے لگا۔غور کرنے پر یاد آگیا۔یہ تو وہی حضرت تھے جس سے میں نے بھیا کے کمرے میں باتیں مٹھاری تھیں اور وجیہہ مجھ سے خفا ہوگئے تھے اور بعد میں اماں۔وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔مجھے بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔کہنے

لگے۔

''پیدل جارہی ہو۔''

میں نے بتایا اسکول والا تانگہ چھوٹ گیا۔میں لیٹ ہوگئی۔''

بولے۔''چلو۔میں تم کو پہنچادوں۔''

''میں خود چلی جاؤں گی۔''میں نے قدرے رکھائی سے کہا۔

''تکلف مت کرو۔''انہوں نے اصرار کیا۔''گھر کافی دور ہے۔پانچ منٹ میں پہنچادوں گا۔''

''نہیں!''میں نے بے مروتی کا اظہار کیا اور آگے بڑھ گئی کار میرے پیچھے تھی۔پھر آگے آگئی۔

''دیکھو مان لو۔میں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں ہوں۔''انہوں نے پھر کہا۔

اماں نے تعریف تو کی تھی ان کی۔مجھے بھوک بھی..... بہت لگی تھی اور بالکل اجنبیت بھی نہیں تھی۔بھیا اور وجیہہ کا کلاس فیلو تو تھا ہی۔میں قدرے تکلف سے ان کے برابر بیٹھ گئی۔وہ بھیا اور وجیہہ کی خیریت پوچھنے لگے۔پھر ایک ہوٹل کے سامنے جاکر کار روک دی اور نیچے اترنے کو کہا۔میں گھبرا گئی میں تو کبھی کسی ہوٹل میں نہیں گئی تھی اور پھر وہ بھی اس شخص کے ساتھ۔مجھے تامل ہورہا تھا۔وہ تسلی دینے لگے۔

''بس پانچ منٹ میں کچھ پی کر آتے ہیں۔''

''مجھے جلدی سے گھر پہنچادیں۔''میں نے گھبرا کر کہا۔''کوک مجھے پسند نہیں۔وہاں سب۔''

مگر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔لوگ گزرتے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے۔میں سٹپٹا کر اتر گئی۔ڈرتے ڈرتے ہوٹل کے اندر گئی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔کسی جان پہچان والے سے سامنا ہوا تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔مگر شکر ہے۔کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔سب لوگ کھانے پینے اور باتوں میں مصروف تھے۔کیبن میں بیٹھ کر انہوں نے آئس کریم منگائی اور مطلب کی باتوں پر آگئے۔کریدکرید کر پوچھنے لگے کہ ان کے بارے میں ابا کا کیا خیال ہے۔

میں نے صاف کہہ دیا کہ بھئی،مجھے کیا خبر۔میرے سامنے تو وہ لوگ کچھ بھی نہیں کہتے۔

''اور تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔''وہ میز پر آگے جھک گئے۔میں پیچھے ہٹ گئی۔بناوٹی حیرت سے میں نے کہا۔

''جی؟میرا خیال؟ارے یہ بات تو آپ کو آپی سے پوچھنی چاہیے۔''

وہ قدرے تردد سے بولے۔''نہیں۔تم ہی بتاؤں نا۔''

جلدی جلدی آئس کریم ختم کرکے میں کھڑی ہوگئی۔

''گھبراؤ نہیں۔ڈرو نہیں۔''وہ تسلی دینے کے انداز میں کہنے لگے۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتی۔''میں نے لاپروائی سے کہا۔''بس آپ اب مجھے گھر پہنچادیں۔''

انہوں نے مجھے گھر کے نزدیک لا کر چھوڑ دیا- ''اب کب ملوں گی؟'' بڑے یقین سے پوچھ رہے تھے-

''لو بھلا- میں کیوں ملوں گی اب- آج تو تانگہ نہیں ملا تھا- روز تو ایسا نہیں ہوگا- میں کل تانگے والے کی خبر لوں گی نا-'' گھر میں گھستے ہی اماں نے قہر آلود نظروں سے گھورا میری جان نکلنے لگی-

''کہاں رہ گئی تھیں؟ اتنی دیر کہاں ہوئی؟ نادیہ افروز کب کی آ گئی ہیں-''

میں تانگہ والے کا رونا روتی ہوئی باورچی خانے میں گھس گئی- سخت بھوک لگی تھی- شام کو میں صحن میں کھڑی کنگھا کر رہی تھی- بھیا اور وجیہہ ایک ساتھ اندر داخل ہوئے- بھیا نہانے کے لیے چلے گئے- وجیہہ میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے- نظریں میرے چہرے پر جما کر بولے-

''اسکول سے کس کے ساتھ گئی تھیں؟'' میرا رنگ فق ہو گیا- ہولناکوں کی طرح دیکھنے لگی-

''آنکھیں نہ پھاڑو-'' وجیہہ نے سختی سے مگر آہستہ آواز میں کہا- ''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم تانگے میں نہیں آئیں- کسی کے ساتھ کار میں گئی تھیں- کون تھا وہ؟ اگر خالہ جان کو خبر ہو گئی نا- پھر تم.....''

''نا..... نہیں-'' میں جھجک گئی- ''ان کو نہ بتانا- وہ تو..... بس-''

''جلدی بتاؤ-'' وجیہہ نے میرا بازو پکڑ کر مروڑا- تکلیف سے میری جان نکلنے لگی- بھیا کی آواز آ رہی تھی-

''وہ- وہی تھے جن کا پیام آپی سے آیا ہوا ہے- غیر تو نہیں تھے-''

''غیر کی بچی-'' وہ غصے اور سختی سے بولے اور میرا بازو چھوڑ دیا- اس کا مطلب ہے کسی نے مجھے دیکھا اور وجیہہ کو بتا دیا- اور وہ بھیا یا اماں کو بتانا نہیں چاہتے تھے- مجھی پر غصہ اتاریں گے- آئی شامت- میں نے کوئی گناہ تو کیا نہیں- میں تو پیدل گھر آ رہی تھی- تانگے والا جو موجود نہ تھا تو کیا کرتی- ساری خطا تانگے والے کی ہے- میں یہی کہہ دوں گی- جو کچھ کہنا ہے تانگے والے سے کہیں- میرے پیچھے کیوں پڑ گئے-

لیکن پھر وجیہہ نے کچھ پوچھا نہ ڈانٹا- میں امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئی- بھیا نکلے کے دم میں ہوتے تو مجھے دیر تک پڑھاتے- آپی بھی پوچھنے پر بتا دیتیں- رات دیر تک جاگ کر پڑھتی رہتی- نیند آتی تو پانی کے چھپکے منہ پر مار مار کر خود کو ہوشیار کرتی- آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیند بھگاتی ٹہل ٹہل کر یاد کرتی-

رات کے سناٹے میں اماں بے چینی سے پلنگ پر کروٹیں بدلتیں اور ہر کروٹ پر ان کے منہ سے ہائے- یا اللہ کی صدائیں بلند ہوتیں- کبھی جی چاہتا پوچھوں- ''اماں- آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' ان سے لپٹ کر روؤں- انہیں نیند نہیں آتی تھی-

کروٹیں بدل بدل کر صبح کرتی تھیں- ایک رات میں دیر تک جاگی- اماں تہجد کی نماز کے لیے اٹھیں- نماز کے بعد وہ سجدے میں گڑگڑا روکر فریاد کرتی رہیں- دعائیں مانگتی رہیں-

''میرے مولا- میرے گناہ بخش دے- میری غلطیاں معاف کر دے- پروردگار میری فوزی کے لیے اچھا سا رشتہ بھیج- اس کا بوجھ میرے سر سے اتار دے مولا- اس کا نصیبہ اچھا کرنا- مالک میری بچی کو اس کا گھر دے- بر دے- وہ اپنے گھر کی ہو جائے- پروردگار وہ اپنے گھر کی ہو جائے-''

اماں ٹوٹے پھوٹے فقروں میں بس یہی دعا کرتی رہیں میں حیران رہ گئی- افوہ اماں کو آپی کی اتنی فکر ہے- انہوں نے اپنے دوسرے بچوں کے لیے تو اللہ سے کبھی کچھ نہ مانگا- وہ اس قدر محبت آپی سے کرتی ہیں- آدھی رات سے زیادہ کا وقت، سناٹا، تنہائی، تاریکی اور اماں کو صرف آپی کا خیال- ان ہی کی فکر- ان ہی کا ذکر- بے چاری آپی- جانے کب ان کا گھر انہیں ملے گا- کئی دن میں اماں کے جذبے کی گہرائی پر غور کرتی رہی-

امتحان شروع ہو گئے تھے- پہلا پیپر دے کر آئی تو وجیہہ کو گھر میں موجود پایا- میرے ہاتھ سے پیپر چھین کر بولے-

''کیا کر کے آئی ہو؟'' اور وہیں بیٹھ کر سوال کرنے لگے- بھیا اور آپی بھی آ گئے- سب مجھ سے سوال حل کرانے لگے- تینوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ زیادہ نہیں تو پچاسی فیصد نمبر تو مار ہی لیے ہیں- کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا- مجھے شاباشی ملی تو مارے خوشی کے بھوک ہی اڑ گئی-

اگلا پیپر بھی اچھا ہوا- وجیہہ اور بھیا مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے اور اگلے پیپر کی تیاری کراتے- مجھے کھانے کے لیے بھی اٹھنے نہ دیتے- بھیا نے کہا- ''ایک دن نہ کھاؤ گی- تو کوئی نقصان نہ ہوگا- امتحان ہیں- مذاق نہیں-''

''آج کھانے کی چھٹی کرو-'' وجیہہ نے بھی تائید کی-

''آنتیں خالی ہوتی ہیں تو دماغ روشن ہو جاتا ہے- فاقہ تو امتحان کے زمانے میں بہترین غذا ہے- ہم بھی بھوکے رہ کر امتحان دیتے تھے-''

پڑھا پڑھا کر دونوں نے مجھے حواس باختہ کر دیا- حقیقت تو یہ ہے کہ سال بھر میں اتنا علم حاصل نہیں کر سکی تھی- جتنا ان چند دنوں میں بھیا اور وجیہہ کی بدولت حاصل ہوا- پڑھنا الگ چیز ہے اور بھوک بالکل علیحدہ- مجھے بھوک کی برداشت نہیں تھی- لاکھ خود پر جبر کرتی مگر جب ان دونوں جلادوں سے جان بچا کر بھاگتی تو سیدھی باورچی خانے میں پہنچتی پھر کچا پکا جو بھی ملتا مار بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑتی- ان دنوں اماں بھی مجھ پر مہربان ہو گئیں- میرے لیے کھانے کی چیزیں الگ رکھ دیتیں- ابا بھی بہت خوش تھے- سب انہیں رپورٹ دیتے کہ پیپر آج بھی اچھا ہوا ہے- وہ مسکرا

کر مجھے دیکھتے اور میرا سر جھکتے - میں شرما جاتی - نادیہ اور افروز منہ چھپا کر ہنستیں -

موسم بہت خوشگوار تھا ماحول بھی بے حد حسین اور دلکش - ہر طرف خوشیاں لہراتی رہتیں - بہار کا موسم اتنا حسین اتنا دلنشین میں نے کبھی نہیں پایا تھا - ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے - ہوا میں خوشبو تھی اور فضا میں نغمے سے گونجا کرتے - جب میں نے نادیہ اور افروز کو اپنے محسوسات سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی رائے پوچھی تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگیں - بے وقوف -

مگر آپی نے کہا ''تم اب بڑی ہوگئی ہو اس لیے موسم اتنا حسین لگ رہا ہے - ورنہ موسم تو ہر سال آتا ہے - اتنا ہی حسین، اتنا ہی دلکش لیکن جوانی میں ہر موسم حسین لگتا ہے - مجھے بھی - پہلے پہل سب کچھ نیا اور پیارا لگا تھا - اور اب - اب تو کہیں بھی نیا پن نہیں رہا - ویسی ہی بہار، ویسی ہی خزاں - ہر سال کی طرح -''

میں ہونق بنی دیکھتی رہی - کیسی مایوس لگ رہی تھیں آپی - ان کی افسردگی کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اس سال زیادہ خوبصورت بہار آئی ہے - سب مجھ سے، میں سب سے خوش تھی، یہ ہی بات تھی نا -

اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا - دھوپ میں قدرے تمازت تھی - میں اپنے سینٹر سے نکلی تو بے حد مسرور تھی - آج کا اردو کا پیپر تو بہت شاندار ہوا تھا - میں گیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف لپکی جہاں پہلے ہی لڑکیوں کا ہجوم تھا - ایک بس آ کر چلی گئی - رش میں پھر بھی کمی نہیں ہوئی - میں اپنے محلے کی لڑکیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی - کہ کسی نے پیچھے سے مجھے پکارا -

''نازی -!''

بغیر سمجھے میں مڑ کر دیکھنے لگی - خیال ہوا کہ شاید بھیا آج مجھے لینے آ گئے ہیں - مگر نہیں - وہی حضرت تھے - اشارے سے مجھے بلا رہے تھے - خوف کی لکیر سر سے پیر تک مجھے دو حصوں میں کاٹنے لگی - وجیہہ کی دھمکی - اماں کا قہر - میں مڑ مڑ کر انہیں تکنے لگی - وہ کار بالکل قریب لے آئے اور پھر بلانے لگے - لڑکیاں مجھے دیکھنے لگیں - میں ٹس سے مس نہ ہوئی - بس آ ہی جاتی - تو اس امتحان سے جان بچ جاتی -

''آؤ - میں چھوڑ دیتا ہوں -'' وہ پکار کر بولے -

ایک لڑکی نے ٹہوکا مارا - ''جاؤ نا - وہ تمہیں بلا رہا ہے -'' دوسری نے ہنس کر تیسری کی کمر میں چٹکی لی - کئی لڑکیاں منہ چھپا کر مسکرائیں - میں مریل چال چلتی ان کے قریب گئی -

''کیا ہے؟'' میں بھنائی ہوئی تھی -

''پیپر ہو گیا - کیسا ہوا؟'' لو - اس قدر بے قراری سے پوچھ رہے تھے جیسے ان کو میرے امتحان کی

پریشانی تھی - میں نے سر ہلا کر اقرار کیا -

''چلو - بیٹھو - بس میں تو بہت دیر سے گئی - میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں -''

لڑکیاں متجسس نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں - کئی تو ہجوم سے باہر نکل کر مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں - ٹپٹپا کر میں دروازہ کھول پچھلی سیٹ پر پر بیٹھ گئی - لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنسیں -

''ہاں تو کیا رپورٹ ہے، تمہارے ابا کسی نتیجے پر پہنچے -؟''

''مجھے نہیں پتا -'' میں جھلا گئی - صرف یہیں پوچھنے یہاں آئے تھے - اپنی نظروں میں مجھے شرمندہ کر کے رکھ دیا -

''بھئی - پھر پتا کرنا تھا - اس دن اسی لیے تم کو پکڑا تھا - لو - اب پھر انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑے گا - اب تم کسی طرح معلوم کرنا - اچھا - میں پرسوں پھر آؤں گا -''

''ارے رے - یہ کس طرف جا رہے ہیں - پلیز میرے گھر کے قریب اتار دیں مجھے -'' میں گڑگڑائی -

''پہلے تمہیں آئس کریم کھلا لاؤں اور چند خصوصی باتیں بھی کرنا ہیں - ہیں؟''

وہ آئینے میں مجھے دیکھ رہے تھے - مجھے اس شخص کی مسکراتی ہوئی صورت ذرا جو بھلی لگی ہو - براؤن آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی اور چہرے پر مسکراہٹ - مجھے اماں اور وجیہہ کا خوف مارے ڈال رہا تھا - وہاں سب میری آمد کے منتظر ہوں گے - مگر چلتی گاڑی سے کودنے کی ہمت نہ کر سکی - پچھتانے لگی کہ کیوں بیٹھی کار ایک اسٹور کے سامنے رکی - وہ خود آئس کریم لینے اندر چلے گئے جی میں آیا تر بھاگ جاؤں مگر یہاں سے گھر کا راستہ نہیں جانتی تھی - بس اسٹاپ کا بھی علم نہ تھا - چند منٹ بعد وہ آئس کریم لیے آ گئے - کار ادھر ادھر گھومتی رہی اور وہ مسلسل بولتے رہے - میرے کان تو اپنے گھر میں سفر کر رہے تھے - جہاں اماں کی غضبناک آنکھیں اور شعلے اگلتی زبان میری پذیرائی کے لیے شدید منتظر ہوگی - تہجد کی نماز کے بعد یہ زبان آپی کے لیے کس قدر میٹھی ہوتی تھی - خوشامدانہ بے کلی اور حسرتوں کی آئینہ دار - مگر میرے لیے شاید کبھی وہ لمحہ نہ آئے جب اماں خدا سے کچھ مانگیں -

اچانک اماں کو خوش کرنے کی تدبیر آ گئی - میں نے آپی کی وہ تعریفیں کیں - ان کے کھانا پکانے، سینے پرونے، گھر کی آرائش اور سلیقہ مندی کی اتنی توصیف کبھی کاہے کو کی ہوگی - وہ مسکراتے رہے - کبھی کوئی سوال کر دیتے - میں شد و مد سے جواب دیتی -

''بس اب تو آپ بارات لے کر آ جائیے - دیر نہ کریں - آپی سے اچھی بیوی آپ کو کہیں نہیں ملے گی - اور پھر مجھے کس قدر شوق ہے آپی کو دلہن بنا دیکھنے کا - ان کے جانے کے بعد شاید میری

کچھ قدر رہو۔''

میں کہتی رہی۔ وہ ہنستے رہے۔ انہیں آپی کی تعریف بھی پسند نہیں تھی کہنے لگے۔

''ایسی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ سب گن پوری۔ پوری اماں جان بن کر آتی ہیں۔ بیوی کے لیے اپنی پسند کی لڑکی منتخب کرنی چاہیے۔ اتنی خوبیوں والی بیوی کے بجائے کوئی ورزن، بادر چن یا آیا ہی نہ رکھ لی جائے۔ چند سکوں کے عوض جب جی چاہا نکال باہر۔ دوسری لے آئے۔ شادی کا خرچ اور کھڑاگ کون پالے۔ بیوی پیر تسمہ پا کی طرح چمٹ جاتی ہے دل نہ ملے تو آئے دن دنگا فساد، نیندیں حرام، زندگی دشوار۔''

میں صفائیاں دیتی رہی۔ ''میری آپی دسوں انگلیاں، دسوں چراغ ہیں۔'' یہ محاورہ آج ہی میں پیپر میں دے کر آئی تھی۔ ''چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تب بھی ان جیسی نہیں ملے گی۔''

بولے ''سورج کی روشنی میں ڈھونڈ لیں گے۔'' غرض میں نے بھی آپی کی وکالت میں حد کر دی اور انہوں نے انکار میں۔

گھنٹہ بھر بعد آ خر کار میرا گھر نظر آیا۔ گلی کے سامنے ہی کار کھڑی کی۔ میں لپک کر اتری اور بھاگی گھر کی طرف۔ مگر میرا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سامنے گلی میں ابا کھڑے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ مجھے کار سے اترتا دیکھ کر سرخ ہو گیا۔ میں مری ہوئی چال سے دروازے میں داخل ہوئی۔ ابا میرے پیچھے ہی آ گئے۔ اندر آتے ہی دروازہ انہوں نے دھڑ سے بند کیا اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کر شاید گلا گھونٹنا چاہا۔ میں خوف سے بے جان ہو گئی۔ وہ دھکیلتے ہوئے اندر لائے ساتھ ہی وہ غیظ و غضب کے عالم میں چیخ رہے تھے۔ چنگھاڑ رہے تھے جانے کیا کہہ رہے تھے۔ الفاظ ان کے منہ سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ میں تو خود ہی ادھ موئی ہو رہی تھی۔ ان کے الفاظ سے بڑھ کر آواز مجھے ڈرا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا تھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی ابا کے دھکوں سے آگے بڑھ رہی تھی برآمدے کے در میں اماں کھڑی ہوئی حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ابا برابر چلا چلا کر کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ اماں کے پاس مجھے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند پھیلنے لگی۔ اس دھند کے پیچھے وجیہہ کا سراپا تھا جو پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں زینے کے پاس آپی ساکت و صامت ابا کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ابا نے دھکا دے کر مجھے اماں کے قدموں میں گرا دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

''لو۔ سنبھالو اپنی اولاد۔ آج یہ خاندان کی عزت خاک میں ملا آئی ہے۔ میری زندگی بھر کی محنت خاک میں مل گئی۔ آج۔ آج۔''

ابا کی آواز جوش غضب سے پھٹ گئی تھی۔ میں اماں کے قدموں میں اوندھی گری ہوئی

تھی۔ میرے احساسات سن ہو گئے تھے۔ پھر بھی ابا کی ہر آواز جو ہوش و حواس سلب کرنے والی تھی مجھے حیرت میں ڈال رہی تھی۔ مجھے ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی ایک سرد لہر آہستہ آہستہ میری رگ رگ میں اترتی جا رہی تھی۔ شاید میرا دم نکلنے والا تھا۔ ابا کی چیخ پکار اور چنگھاڑوں کے مقابلے میں اماں کا طرز عمل بالکل جدا تھا۔ انہوں نے ٹھہری ہوئی آواز میں ابا سے کہا۔

''اچھا۔ ٹھہرو۔ دم تو لو۔ کالجے کو اتنا شور کر رہے ہو۔ لڑکی ذات ہے۔ ذرا سے اشارے میں آپ اترتی ہے۔ تم تو اسے بے ہوش کیے ڈال رہے ہو۔''

ابا زور سے چلائے۔ ''میں۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔ خاتمہ کر دوں گا اس کا۔ اس نے میرے اعتماد کو چکنا چور کر دیا۔ میرے یقین، میرے فخر کو مٹا دیا۔ ملیامیٹ کر دیا۔ مجھے مجھے۔ جھٹلا دیا ہے۔''

ابا پھٹی پھٹی آواز میں جانے اور کیا کہتے رہے۔ اماں نے مجھے زمین سے اٹھایا اور ابا سے بولیں۔

''اچھا۔ تم بیٹھو۔ مگر ایک بات کہوں گی۔ میری لڑکی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ میرے اعتماد کو نہیں مٹا سکتی۔''

وہ مجھے سہارا دیتی ہوئی آمدے سے چھوٹے کمرے میں آئیں۔ جہاں ہمارے بستر اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان رکھا جاتا ہے۔ پاس سے گزرتے ہوئے میری نظر وجیہہ پر پڑی اور میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ ان کا رنگ پیلا ہو رہا تھا جن انگلیوں سے انہوں نے ستون پکڑ رکھا تھا وہ سفید ہو رہی تھیں۔ وہ اندھوں کی طرح سامنے دیکھ رہے تھے۔ اماں نے مجھے کمرے میں لا کر پلنگ پر بیٹھا دیا۔ اور وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر جانے لگیں تو میں نے ان کا دامن تھام لیا اور پوری قوت جمع کر کے بمشکل کہا۔

''اماں۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' ان کا طرز عمل حیرت ناک طور پر بدل گیا۔ نفرت نے ان کے چہرے پر سیاہی سی پھیلا دی۔ آنکھیں سکوڑ کر اور دانت پیس کر کہنے لگیں۔

''بے قصور ہوتی تو سر جھکا کر نہ چلتی۔ میں پہلے ان کو دیکھ آؤں۔ کہیں انہیں کچھ ہو نہ جائے۔ پھر تجھ سے نمٹوں گی۔''

یہ کہہ کر دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ ''اسے آرام کرنے دو گھبرا گئی ہے۔'' انہوں نے باہر کسی سے کہا۔

میں نمٹلا کر تکیے سے سر پھوڑنے لگی۔ مجھے ڈر تھا اماں جو بیمار ہیں کہیں انہیں میری وجہ سے کچھ نہ ہو جائے۔ مگر وہ ابا کی وجہ سے ذرا رہی تھیں۔ شاید ابا نے زیادہ ہی اثر لیا تھا۔ انہیں کچھ معلوم بھی تو نہیں تھا۔ بس مجھے کار سے اترتے دیکھا اور جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ میں کمرے سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بھوکی پیاسی آنسو بہاتی رہی اور منتظر نظریں دروازے پر جمائے رہی۔ شام

ہوئی - رات ہوئی - کوئی میرے پاس نہ آیا - باہر سناٹا تھا - لگتا تھا گھر میں کوئی موجود نہیں یا موت ہوگئی ہے - ایک بار اٹھی - دروازے تک آئی - نقاہت سے میرے پاؤں کانپنے لگے - دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے بند تھا - میں نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا تھا - کوئی پوچھ ہی لیتا - مگر باہر خاموشی تھی - مجھے خوف نے آلیا - کہیں ابا یا اماں کو کچھ ہو نہ گیا ہو - کہاں کی بھوک، کیسی پیاس - خوف پورے وجود میں سما گیا تھا - نہ جانے کب تک تاریکی میں آنکھیں پھاڑے پھاڑے کسی چاپ کسی آواز پر کان لگائے میں تھک کر سو گئی -

اور اس قدر ہولناک واقعے کے بعد بھی بے خبر سوئی - صبح آنکھ کھلی تو کمرہ اسی طرح بند تھا - چند لمحے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کہاں ہوں - پھر صبح کی اجلی روشنی میں، میں نے دیکھا - کمرے میں میں اکیلی نہیں روشن آپا بھی موجود ہیں - میں ذرا سی سستی دکھائے بغیر اٹھ کر ان سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - آنسو آبشار کی طرح دونوں آنکھوں سے بہنے لگے -

''مجھے تو رات ہی نادیہ نے بتا دیا تھا کہ تم نے کوئی بڑی غلطی کی ہے -'' روشن آپا تھوڑی دیر بعد بولیں -

''مگر مجھے یہ خبر نہ تھی کہ کل سے تم کمرے میں بند ہوگی - وجیہہ بھی رات کو گھر نہیں آیا - صبح آیا تو اس قدر بھونچکا سا تھا - کہ بس - میں نے اس سے کہا نیچے جا کر نازی کی خیر خبر تو لا مگر اس نے سنا بھی نہیں - آخر خود نیچے آئی - فوزی سے پوچھا - تب پتا چلا -''

''روشن آپا آپ کے سوا کوئی یقین نہیں کرے گا - میں سچ کہتی ہوں - میں نے کوئی قصور نہیں کیا -''

میں نے انہیں پورا واقعہ بتایا - آپی کی تعریفیں - بارات لانے کا تقاضا، آپی کو دلہن بنا دیکھنے کی تمنا - سب سے زیادہ دکھ تو مجھے اس بات کا تھا کہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں - سب نے مجرم بنا کر قید کر دیا - روشن آپا نا شتہ لائیں - مجھے اصرار سے کھلا یا پلا یا - پھر اماں سے بات کرنے چلی گئیں - مجھے اب امتحان کی فکر نے پریشان کر دیا - آج اور کل تو خیر چھٹی تھی مگر ابھی کئی پیپر باقی تھے - پریکٹیکل تھے - کیا مجھے اسی طرح قید رکھ کر سزا دیں گے یہ لوگ -

روشن آپا آئیں - بے حد افسردہ اور فکر مند - ان کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی - انہوں نے بتایا کہ ابا میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے اور یہ کہ مجھے اب گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں - ابا روشن آپا کو اس کمبخت کے پاس بھیج رہے تھے تا کہ باقاعدہ وہاں سے سلسلہ جنبانی ہو اور میری رخصتی -

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے روشن آپا کو دیکھنے لگی - پھر بلک بلک کر رو دی - میرے پیپر اتنے شاندار ہوئے تھے کہ فرسٹ ڈویژن لازمی تھی - دوسرے یہ کہ ایک الزام اور بہتان کے ساتھ میری

شادی ہو - وہ بھی اس شخص کے ساتھ جسے میں اپنا بہنوئی بنانا چاہتی تھی - ابا سے کس طرح کہوں - میری بھی تو سنو میں اس کو آپی کے لیے ہموار کرتی رہی - اس کی یہ سزا؟ بے شک میں نے غلطی کی تھی مگر اس چھوٹی سی غلطی کی یہ ہولناک سزا - میری تعلیم، میرا مستقبل تاریک کیا جا رہا تھا -

میرے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی - آنسو بھی اس آگ کو بجھانے سے قاصر تھے - ابا کے خیال میں میں نے ان کے اعتماد کو دھکا پہنچایا تھا - ان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا - ابا آپ ایسے تو نہ تھے - انصاف بھی کوئی چیز ہوتی ہے - یا بس ایک نظریہ قائم کر کے جلاد کو حکم دے دیا جائے کہ یہ مجرم ہے - سر قلم کرو - جانے یہ کیسا اعتماد تھا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں انہیں بتاتی - اگر میرا جرم ثابت ہو جاتا تو وہ سزا سناتے مگر وہ مجھ سے مخاطب ہونے میں ہتک محسوس کرنے لگے تھے -

کاش ابا نے مجھے مارا ہوتا - زخمی کر دیا ہوتا - مگر اب جو گریز اور نفرت کا اظہار کر رہے تھے وہ مجھے جان سے مار ڈالنے کو کافی تھا - مایوس ہو گئی اور ڈھٹائی پر آمادہ ہو گئی - جب کمرہ کھول دیا گیا اور باہر نکلنے پر پابندی نہ رہی تب بھی میں اسی طرح بیٹھی رہی - امتحان کا جو بھوت مہینے بھر سے سوار تھا اب غم اور پچھتاوے میں بدل گیا تھا - رو رو کر تکیہ بھیگ جاتا تو پلٹ جاتا مگر میں نے کسی سے کوئی شکوہ نہ کیا - کیسا کھانا اور کیسا آرام - کئی کئی وقت بھوکی رہ کر گزارتی - روشن آپا ہی خوشامد کر کے مجھے کھلا دیتیں - مگر مجھے کھانے کی طلب تھی نہ پیاس کا احساس روشن آپا دن رات جانے کس مصروفیت میں محو رہتیں - اماں سے سرگوشیاں اور نادیہ افروز پر احکامات صادر کرتیں -

ایک ہفتے میں میرا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور میری اپنی قمیص جسم پر اتنی ڈھیلی ہو گئی کہ مجھے خود ہنسی آ گئی - لگتا تھا میں نے اماں کی قمیص پہن لی -

روشن آپا نے مجھے تفصیل بتائی جو یوں تھی - وہ اس کا روالے کے پاس گئیں - اسے اس تازہ روداد کے بارے میں بتایا اور اس ظلم کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا - اس نے کہا کہ وہ آج فوراً ہی شادی کرنے کو تیار ہے - میں نے کہا - روشن آپا نے چپکے چپکے بتایا - ''تمہاری ہی وجہ سے اس بچی پر آفت آئی ہے - اسے مجرم سمجھا جا رہا ہے - اگر تم سے شادی ہوئی تو..... زندگی بھر وہ اس الزام سے بری نہ ہو سکے گی کہ کسی برے ارادے سے تمہارے ساتھ گئی تھی - جب کہ وہ تو اس خیال میں تھی کہ فوزیہ سے تمہارا رشتہ ہو گا - اس لیے بے تکلفی سے تمہاری کار میں بیٹھ گئی - اگر تم چاہتے ہو کہ ساری زندگی والدین اسے قصوروار سمجھتے رہیں اور وہ دامن پر شکوک کے داغ لگائے عمر گزارے تو بے شک تم اس سے شادی کر لو - لیکن اگر مرد ہو - خود داری اور مردانگی کے جو ہر رکھتے ہو تو اس بے گناہ بچی کو ناکردہ گناہی کے الزام سے بچا لو - اس نفرت سے نجات دلواؤ جو تمہارے اقدام کی بدولت اس بے چاری کو برداشت کرنی پڑ رہی ہے - وہ بہت حساس اور معصوم ہے - اس کو گھر میں قید کر دیا گیا

ہے اور اس کا سال ضائع ہو گیا- صرف تمہاری وجہ سے- ایک چھوٹی سی فروگزاشت- معمولی سی غلطی نے اس بچی کا کردار سب کی نظروں میں مشکوک کر دیا ہے- وہ مرد سے سے بدتر ہو گئی ہے- غرض میں نے اتنا اندوہ ناک نقشہ تمہاری اس حالت کا کھینچا کہ بے چارہ پریشان ہو گیا- غریبکہ آج اس کے گھر والے فوزیہ کو انگوٹھی پہنانے آ رہے ہیں- اب تم اپنا حلیہ درست کر لو-''

روشن آپا کی یہ دور اندیشی اور ذہانت بھی میری سوگواری کم نہ کر سکی- آپی کی شادی ہو بھی گئی- مگر ابا جو مجھ سے اس درجہ بدظن اور شاکی ہیں کبھی مجھ پر اعتماد نہ کر سکیں گے- میں ان کی نظروں کا سامنا نہ کر سکوں گی- شاید- کسی کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہی- نادیہ افروز بھی میرا مذاق اڑائیں گی- اور اماں- اماں کو تو مجھے چھیڑنے- زخمی کرنے کا موقع مل ہی گیا ہے-

''آصف خود تمہارے ابا کے پاس آیا تھا ان کی غلط فہمی کے ازالے کے لیے، فوزیہ کو مانگنے کے لیے- اس نے کہا میں کسی بری نیت سے نازیہ کو کار میں بٹھاتا تو کیا دن دہاڑے گھر کے سامنے لا کر اتارتا- ایک بار نازی کے بارے میں خیال آیا تھا مگر گھر والے نہیں مانے- آپ لوگوں نے بھی بہت لیت و لعل سے کام لیا تو میں چپ ہو گیا- رشتہ کرنا ہی میری عزت افزائی ہو گی- اس لیے آپ میری غلطی کو معاف کر دیں- گرمی اور دھوپ میں نازی کو بس اسٹاپ پر کھڑے دیکھا تو شناسائی اور متوقع رشتے کی امید میں اسے گھر پر لا کر چھوڑ دیا- غرضیکہ اس نے سارا الزام اپنے اوپر لے کر تمہیں بچا لیا ہے- تمہارے ابا اپنے فوری اشتعال اور جلد بازی پر افسوس کر کے رہ گئے-''

☆☆

آپی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی- گھر میں اچانک بے حد چہل پہل ہو گئی- میں کمرے سے پھر بھی نہ نکلی- میرا ولولہ اور امنگ ختم ہو گئے تھے- خوشی یا اطمینان کی ذرا سی لہر بھی میرے وجود میں داخل- نہ ہو سکی- میں پتھر کے بت کی طرح ایک جگہ نصب تھی- چھوٹے سے سامان کے کمرے میں- جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ تھا- اس طرح میں سب کی نظروں سے اوجھل تھی اور کسی کو میرا خیال بھی نہ آتا تھا- کبھی نادیہ کبھی افروز ناشتہ کھانا لا کر رکھ جاتیں- کئی کئی وقت مجھ سے کچھ کھایا ہی نہ جاتا- تو کوئی یہ بھی نہ پوچھتا کہ میں کیوں بھوکی رہنا چاہتی ہوں؟ روشن آپا بے حد مصروفیت کے باوجود کبھی کبھی آ کر زبردستی مجھے کھلا پلا جاتیں- میں کمرہ بند ہی رکھتی تھی- بس نادیہ افروز اور روشن آپا کے لیے ہی دروازہ کھلتا- ویسے یہ توقع بھی رائیگاں گئی کہ کبھی تو ابا یا اماں مجھے دیکھنے آ جائیں گے- کبھی تو ان کا دل میرے لیے بے چین ہو گا- اپنی جلد بازی فوری اشتعال کا افسوس ظاہر کرنے ہی آ جائیں- لیکن یہ آس بھی دھواں بن کر رگوں میں پیوست ہو گئی-

ایک دن نادیہ نے بتا کہ روشن آپا نے مجھے وجیہہ کے لیے مانگ لیا ہے اور وجیہہ گاؤں گئے ہیں تا کہ اپنی اماں کو لا سکیں- یہ سن کر بھی میں چپ رہی- نہ خوشی ہوئی- نہ غم میرا اپنا غم اتنا بڑا تھا

جو میرا خون جلا رہا تھا- اب اس کے سامنے کوئی دکھ، کوئی پریشانی مجھے متاثر نہ کر سکتی تھی- خیال آتا کہ چلو- اماں کی پریشانی ختم ہو جائے گی- آپی کی شادی کی خوشی ہو گی کہ ان کا گھر بسے گا- میری شادی سے وہ چین کا سانس لیں گی کہ ایک بلا دفع ہوئی- پھر نادیہ نے انکشاف کیا کہ آپی کی شادی کے دن ہی میری بھی رخصتی ہو گی- میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا- حلق میں پھندا سا لگنے لگا-

''بچی آپی! میں نے خود سنا- اماں نے کہا بھی کہ رہنے دو میٹرک تو کر لینے دو- مگر ابا نے کہا جو فرض جتنی جلدی ادا ہو وہی بہتر ہے- وجیہہ کو جہیز کی طلب نہیں- اس سے بہتر موقع کب ملے گا- ابا چلے گئے تو اماں بستر پر لیٹ کر رونے لگیں-''

میں بھی سامان سے بھرے اس چھوٹے سے کمرے میں بستروں کے انبار پر گر کر رونے لگی- اتنی بے زاری، ایسی نفرت ابا کو مجھ سے ہو گئی تھی- بغیر کسی گناہ بلا قصور مجھے سزا دی جا رہی تھی- ابا میری صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے ورنہ اتنے دن میں ایک بار ہی آ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو میں ہلکی پھلکی ہو جاتی- مگر وہ تو اب اپنے گھر میں بھی میرا وجود دیکھنا نہیں چاہتے تھے- انہیں اب بھی میری بے گناہی کا یقین نہیں- مجھ پر بھروسا نہیں- اب شاید کبھی بھی وہ مجھ پر اعتماد نہ کر سکیں-

اف! ایسی زندگی سے تو موت اچھی ہے- مجھے مر جانا چاہیے شاید اس طرح میں ان کے دل میں جگہ پا سکوں- میری بے گناہی کا ان کو یقین آ جائے- ہر قیمت پر ابا کی محبت جیتنے کے لیے موت سے بہتر کوئی راستہ نہ تھا- زہر تو مجھے کون لا کر دے گا- کمبخت گھر بھی ایسا ہے کہ جہاں کوئی شے موجود نہیں جس سے انسان مر سکے- مٹی کا تیل پینے سے تو شاید موت آتی نہیں- البتہ تیل چھڑک کر آگ لگانے سے- لیکن سنا ہے بہت تکلیف ہوتی ہے اگر بچا لیا جائے تو مقصد پورا نہیں ہوتا- اور سارا جسم جھلس کر بدہیئت ہو جاتا ہے- مگر وہ- ابھی کوئن مجھ سے محبت کرتا ہے جل جھلس گئی تو سب اور بھی نفرت کرا ہیت کریں گے- نیند کی گولیاں کوئی کھاتا نہیں- اماں کے لیے دو گولیاں آئی تھیں- اس کے بعد انہوں نے منع کر دیا کہ موئی گولیاں تو نشے کا عادی کر دیں گی- اب افیم رہ جاتی ہے- اماں کی دواؤں کی پٹاری میں ایک ڈبیہ میں کچھ کالی کالی گھناؤنی گیلی گیلی چیز تھی جسے اماں نے افیم کہہ کر کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی- بس وہ کسی طرح دستیاب ہو جائے- تو کھا کر ایسا سوؤں- ایسا سوؤں کہ جاگنے کے انتظار میں سب بیٹھے کے بیٹھے رہ جائیں- اور شادی کا گھر- ماتم کا گھر بن جائے- اماں سر پیٹ پیٹ کر روئیں- ابا دیوار سے سر ٹکرائیں اور کہیں-

''ہائے یہ میں نے کیا کیا؟''

اور آپی- آپی چیخیں مارتی ہوئی میری لاش سے لپٹ جائیں-''میری بہن- منی بہن- تو نے یہ کیا کیا- تو کہاں چلی گئی؟''

ایک فلم میری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی- میری موت کا منظر- مگر میرے خدا..... میری موت کے بعد آپی بے چاری کی شادی نہ ہوئی تو اماں کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور جتنے دن آپی زندہ رہیں اماں مجھے ہی گالیاں دیں گی کہ کمبخت مر کر بھی کوزندہ درگور کر گئی- اور جب آصف بھائی آپی سے شادی پر راضی نہ ہوں گے تو میری خطا ثابت ہو جائے گی- اف- میں زندہ رہوں یا مر جاؤں- یہ گھر والے مجھے کسی الزام سے بری نہیں کر سکتے- میری موت کا فائدہ ہی کیا جب سب کی نفرت بڑھ جائے- اور جب بھی میرا ذکر ہو اماں کہیں اچھا ہوا جو مر گئی-'' مرنے کا پروگرام کینسل-

☆☆

کتنے برس کیوں نہ گزر جائیں میں اپنی شادی کا منظر نہیں بھول سکتی- صدمے، بے یقینی اور بے بسی نے مجھے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا- میں ایک مشینی کھلونا تھی- جس سے سب لوگ کھیل رہے تھے- کوئی کپڑے پہننے پر اصرار کر رہی تھی کوئی سنگھار پر- مجھے شاید سلیمہ بھابھی نے دلہن بنایا تھا- اور ان کی صورت دیکھ کر مجھے اپنے خوابوں کی تباہی پر رونا آنے لگا-

جب آپی رخصت ہو رہی تھیں تو کسی نے انہیں مجھ سے ملانے کی ضرورت محسوس نہ کی- میں برآمدے میں بیٹھی تھی- سرخ دوپٹے کے ستارے جگمگا رہے تھے اور پھولوں کے ہار اور گجروں میں مجھے گرمی لگ رہی تھی- گھر میں بے شمار لوگ موجود تھے- بس جیسا شادی کا گھر ہوتا ہے- مگر یہ آپی کی شادی تھی اسی لیے سب مہمان انہیں رخصت کرنے دروازے پر چلے گئے- میرے پاس روشن آپا اور سیما تھیں- سلیمہ بھابھی میرا میک اپ درست کر رہی تھیں جو آنسوؤں کی لڑیوں سے خراب ہو رہا تھا ابا آپی کو سہارا دے کر دروازے کی طرف لے جا رہے تھے اماں ان سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں- مہمان خواتین اماں کو سمجھا بجھا رہی تھیں اور ساتھ ہی آپی کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے- ''ایسی کارگزار، ایسی فرماں بردار بیٹی کی جدائی- سچ ہے ماں باپ کا آنگن تو لڑکی کے لیے مہمان خانہ ہوتا ہے- ہاہاہ- چڑیاں ہوتی ہیں بیٹیاں-''

آپی جب سجی بنی کار میں بیٹھ کر آصف بھائی کے ساتھ چلی گئیں تو اماں دروازے پر ہی گر گئیں- سب نے انہیں اٹھایا- ''ارے ہمت کرو- حوصلہ رکھو- ساتھ خیر کے عزت کے ساتھ رخصت ہوئی ہے تم تو بدشگونی کر رہی ہو آپا- چلو ابھی تو دوسری بیٹی کو رخصت کرنا ہے-''

عورتیں اماں کو سہارا دے کر اندر لائیں تو وہ بے حال تھیں- آپی کی جدائی کا غم- ان کی شادی اور گھر بسنے کی خوشی سے زیادہ تھا شاید-

''ہائے مجھے کچھ ہو رہا ہے- کچھ ہو رہا ہے-'' انہیں کمرے کے اندر لے جایا گیا- ''گلوکوز- کورامین- پانی دو- دودھ لاؤ-'' آوازیں برابر آ رہی تھیں- جب کسی نے انہیں دوسری بیٹی کی

رخصتی یاد دلائی تو وہ تڑپ کر بولیں-

''ارے مجھے سہارا نہیں ہے- رخصت کر دو تم سب اسے-''

ابا تو باہر ہی سے شامیانوں کی طرف چلے گئے تھے- ان کے آفس کے لوگ مع باس کے عین رخصتی کے وقت آئے تھے اور ابا ان کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئے- میری رخصتی کے وقت نہ ابا میرے قریب آئے نہ اماں- اماں کا جی اچھا نہ تھا- ابا کو باس کی خاطر عزیز تھی-

نادیہ اور افروز آپی کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی تھیں- ان کی سہیلیاں انہیں سمجھا بجھا رہی تھیں- انہیں میرے پاس آنے کی فرصت نہ تھی- صرف بھیا نے میرا بازو تھاما تھا اور وجیہہ کو سمجھانے لگے-

''اس کی حماقتیں معاف کر دیا کرنا- نادان اور بھولی ہے اسے ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے-'' بھیا کی قہر اور ہمدردی نے میرے دل کو طاقت عطا کی تھی- میں ان کے ہاتھوں کو منہ سے لگا کر بلک کر روئی- بھیا اسٹیشن تک ساتھ آئے اور پھر ایک ٹرین مجھے ان سے دور لے گئی-

روشن آپا کا پورا کنبہ اور چند اور عزیز جو بارات میں آئے تھے- سب لوگ گاؤں پہنچے جہاں وجیہہ کی والدہ رہتی تھیں- وہاں بھی میلے کا سا سماں تھا- خاطر تواضع- رونمائی- تعریفیں، عزت افزائی- مجھے سب یاد ہے- گاؤں کے لوگ بے حد سادہ ہوتے ہیں- انہیں میں کسی حور پری کی طرح حسین نظر آ رہی تھی- روشن آپا نے شادی کا جوڑا بہت خوبصورت بنوایا تھا شاید اسی لیے مجھے وجیہہ پر غصہ آ رہا تھا جو موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھے..... رات کو روشن آپا مجھے کمرے میں لٹا کر چلی گئیں- میں تھکی ہوئی تھی- نیند آ رہی تھی کہ دروازہ کھلا- وجیہہ اندر آ رہے تھے- میں چونک کر اٹھ گئی- رنج والم، غصہ- تکان-

''آپ..... یہاں کیوں آئے ہیں- اس وقت؟ مجھے نیند آ رہی ہے- یہ میرا کمرہ ہے-''

''سونے کے لیے..... مجھے بھی نیند آ رہی ہے- یہ میرا کمرہ ہے-''

''یہ- یہاں؟ اس کمرے میں؟'' میں نے تعجب سے انہیں دیکھا- انہوں نے سر ہلا کر اقرار کیا-

''ارے-'' میں نے کہا- ''میں سوؤں گی- یہاں تو.....''

''تم ہم بھی سو جائیں گے-'' انہوں نے ڈھٹائی سے کہا-

مجھے عجیب سا لگا- میں پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی- میں تو آپی کے ساتھ سوتی تھی- جانے روشن آپا کہاں تھیں-

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''روشن آپا کو.....''

''بلاؤں؟ کوئی مسئلہ ہے؟ ہوا کیا ہے تمہیں- اتنی پریشان کیوں ہو؟ شادی ہوئی ہے پھانسی نہیں-''

''میں روشن آپا کے پاس سوؤں گی۔'' شادی اور پھانسی کے نام پر میرے آنسو نکل آئے۔ پھانسی ہی تو ہوئی تھی۔

وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئے اور مسخرے پن سے بولے ''ارے واہ۔ شادی مجھ سے ہوئی ہے کہ روشن آپا سے۔'' مجھے رونا آ رہا تھا۔ آنسو رک نہ سکے۔ وہ جھلا گئے۔ ''رونا کیوں آ رہا ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔''

میں بتا نہیں سکتی کہ اب تو ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔

''سنا ہے نکاح کے وقت تم نے فوراً ہی بستخط کر دیے تھے اور زور سے ہاں بھی کی تھی۔ بے چاری فوزیہ تو رو رو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ سب عورتیں کہہ رہی تھیں کہ نازی نے خوشی خوشی ہامی بھر لی مگر فوزیہ کو ماں باپ کی جدائی کا بہت غم تھا۔''

میں تن کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ سر بانے رکھا تھا اور غصے میں مجھے خیال نہ رہا کہ میں نئی دلہن ہوں۔ آپی کی تعریف اور وجیہہ کی منہ سے۔ ضبط کا یارا نہ رہا۔

''وہ۔؟'' میں نے بھنا کر کہا ''میں ان جیسی نہیں ہوں یا تو شادی کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ روز مہمانوں کی خاطر ہو رہی ہے یا رخصتی کے وقت پچھاڑیں کھانے لگیں۔ جیسے زبردستی باہر نکالی جا رہی ہوں۔ ہائے اماں۔ مجھے خود سے جدا نہ کرو۔ ارے ابا۔ میں مر جاؤں گی۔''

میں منہ بگاڑ کر آپی کی نقل کرنے لگی۔ وجیہہ کو ہنسی آ گئی۔ مگر غصے نے مجھے اتنا بے قابو کر دیا تھا۔ جی چاہتا تھا ان کا ہنستا ہوا چہرہ نوچ لوں۔

''بھئی، سب لڑکیاں ماں باپ سے بچھڑتے وقت روتی ہیں۔ البتہ تمہاری آواز میں نے نہیں سنی۔ تم روئی تھیں کہ نہیں؟''

''اونہہ۔ میں کیوں روتی۔ میری بلا روتی ہے۔'' میں نے آگ بگولہ ہو کر تکیہ اٹھا کر دوسری طرف پٹخ دیا۔ ''روئیں وہ جن کی شادی مشکل سے ہوتی ہے۔ جن کے ماں باپ ان سے محبت کرتے ہیں۔'' میرا کلارندھ گیا۔ اور آنکھیں نمکین پانی میں ڈوبنے لگیں۔ ''اگر میں کوشش نہ کرتی تو قیامت تک نہ ہوتی ان کی شادی۔ بیٹھی ہوتیں وہ گھر میں۔ اور میں ان کی جگہ رخصت ہوتی۔ میں جب بھی نہ روتی۔ آیا۔ سمجھ میں؟''

گرم لہو کی تیز و تند دھاریں میرے جسم میں آگ بن کر ایک رہی تھیں۔

''ارے۔ ارے۔ ارے۔'' وجیہہ میرے غم و غصے کے اظہار سے گھبرا گئے۔ ''اچھا یہ بتاؤ۔ ان کی جگہ رخصت ہو کر آصف کے ساتھ جاتیں تو زیادہ خوشی ہوتی یا اب۔؟''

''مجھے کیا پتا۔'' میں نے تیزی سے چڑ کر کہا۔ ''اونہہ۔ اس شخص کی باتیں کس قدر بے موقع ہیں۔ مجھے کیا خبر میں جب خوش ہوتی یا اب۔ اور ابھی کون سی خوشی کی پھلواریں نکلی پڑ رہی ہیں۔ جس لڑکی

کے ماں باپ اسے شادی کے بہانے گھر سے نکال دیں وہ کیسے خوش ہو سکتی ہے۔

''ویسے ایک بات تو ماننی پڑے گی۔'' وجیہہ نے اکڑ کر کہا۔

''وہاں سب عورتیں ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔''

''کہ دونوں دولہاؤں میں وجیہہ کا جواب نہیں۔ نام کی طرح ہی دولہا بنا ہے۔'' وجیہہ نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

اوئی اللہ میں نے اس نظر بے سے تو ان کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ آصف بھائی اندر آئے تھے تو میں نے گھونگھٹ سے جھانک کر دیکھا تھا۔ رنگ گورا اور بال براؤن تھے مگر قد میں بھیا سے کم تھے۔ اوپر سے انہوں نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ نہ پھولوں کا سہرا ان کے سر پر تھا نہ زرتار لڑیوں کا۔ مقابلے کے خیال سے تو دیکھا نہیں تھا۔ وجیہہ پر نظر ڈالی تو وہ اور بھی تن کر کھڑے ہو گئے۔ سفید سرج کی شیروانی اور چست پاجامے میں ان کا قد کچھ زیادہ ہی لمبا لگ رہا تھا۔ گندمی رنگت کے چہرے پر سیاہ بالوں کی لٹیں بہت نمایاں اور کالی آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے۔ وہ داد طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔ وہ فوراً بے تکلفی پر اتر آئے۔

''ارے میں نے پھولوں کا ہار تار دیا ہے ورنہ تم دیکھتیں تمہارا دولہا کتنا شاندار ہے۔ فخر کرو گی ہمیشہ۔ تمہیں کچھ خبر تو ہے نہیں۔ بتاؤں گا کس طرح فخر سے۔ اکڑ کر۔ دھونس جما کر رہنا ہے تمہیں۔ یہ آنسو انسو پونچھ لو اور بھول جاؤ کہ اس نام کی کوئی گیلی گیلی چیز تمہارے پاس ہو سکتی ہے۔ ارے سیاں بھئے کوتوال۔ اب ڈر کاہے کا۔ اب ہم تمہارے محافظ ہیں تمہارے باڈی گارڈ۔ مجال ہے کسی کی جو تمہیں ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ آنکھیں نکال دیں گے۔ ہاں مگر ساس.....؟ تمہاری ساس جو ہیں نا۔ بس انہی سے ڈرتی رہنا۔ اس ساس سے تو ہم بھی ڈرتے ہیں اور ان کے حکم کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی ہماری۔''

سچی بات ہے، وجیہہ نے اس رات مجھے بہت ہنسایا اور روز ہنساتے رہے میں تو دیدے پھاڑے بیٹھی رہتی۔ وہی بولتے اور اس ہفتے میں اتنی نئی نئی باتوں سے واقفیت ہوئی کہ میں اپنی بے خبری اور بے وقوفی پر خاصی شرمندہ رہتی ساس کا ڈراوا ہر روز دیا جاتا مگر وہ تو اس قدر بامحبت، نرم دل اور نرم گفتار تھیں کہ میری ساری محرومیوں کو اپنی شفقتوں کی آغوش میں سمیٹ لیتیں۔ مجھے ماں کی آغوش کا بیاہ مل گیا تھا۔

ساتواں دن تھا۔ بھیا مجھے لینے آ گئے۔ ہر لڑکی شادی کے فوراً بعد میکے جاتی ہے۔ میں بھی اس دن کی منتظر تھی جب بھیا نادیہ اور افروز کے ساتھ مجھے لینے آئیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد صرف بھیا آئے۔ شاید خود ہی آ گئے تھے۔ میں نے ان سے کسی کی خیریت نہیں پوچھی۔ خود ہی بتانے لگے

کہ اماں تو تمہاری شادی کے بعد سے جو بستر سے لگی ہیں تو ابھی تک اٹھ نہیں سکیں- تکان ہوگئی ہے- نادیہ افروز ہی گھر داری کر رہی ہیں- بہت مصروف رہتی ہیں- فوزیہ اور آصف بنی مون کے لیے سوات گئے ہیں- ابا کا آفس میں بہت کام بڑھ گیا ہے وغیرہ-

روشن آپا بھی اب واپسی کے لیے تیار تھیں- انہوں نے اگلے دن روانگی کا پروگرام بنایا- بھیا کو کرکٹ ٹیم کے ساتھ دوسرے شہر جانا تھا- وہ رک نہیں سکتے تھے- مجھے روشن آپا کے ساتھ آنے کی تاکید کر کے چلے گئے- میرا دل دکھ سے بھر گیا- بھیا مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے- روشن آپا اور وجیہہ چاہے کسی دن جاتے- مگر وہ بھی شاید دنیا داری نبھانے کے لیے آئے تھے- ورنہ وہاں کون میرا منتظر تھا- اگلے دن ہم اسٹیشن پہنچ گئے- میں ٹرین میں روتی رہی- ہائے یہ دنیا کے دستور- روشن آپا نے سمجھایا تھا کہ میرا میکے جانا ضروری ہے ورنہ لوگ شک کریں گے- نام دھریں گے- بھلا لوگوں کو دوسروں کے مسائل کی کیا خبر-

ٹرین آگے ہی آگے جا رہی تھی اور میرا دل اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا- مجھے اس میکے سے اپنی سسرال زیادہ عزیز ہوگئی جہاں میری عزت تھی اور محبت تھی- میرے والدین کا شہر آ گیا تھا- بڑا شہر- لوگوں سے، سواریوں سے، مکانوں سے اور سڑکوں سے بھرا ہوا- عمارتیں اور سڑکیں اور لوگ جیسے جلوس جا رہا ہو سب ایک دوسرے کے دکھوں سے بے خبر- ان کی خوشیوں سے لاتعلق- میں اسٹیشن پر جم کر کھڑی ہوگئی-

''میں وہاں نہیں جاؤں گی-'' میں نے کہا-

روشن آپا سمجھاتی رہیں- دنیا کے دستور، اونچ نیچ قاعدے قانون، مگر مجھے اپنی بے عزتی اب گوارا نہ تھی- بھیا جا چکے ہوں گے- میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھی- کہ ان سب کی نظروں میں مجرم تھی- کوئی میری صورت دیکھنا نہ چاہے اور میں اسے زبردستی اپنا چہرہ دکھاؤں اور پھر ردعمل کے طور پر ان کی تحقیر و تذلیل برداشت کروں-

''اب آ ہی گئی ہو تو چلی چلو- نیچے نہ جانا جب تک کوئی بلانے نہ آئے میرے پاس رہنا-'' روشن آپا نے کہا- میں روتی رہی اور انکار میں گردن ہلاتی رہی- ''وہ گھر بھی انہی لوگوں کا ہے-''

وجیہہ جز بز ہو رہے تھے- تھک کر بولے ''آپا! تم گھر جاؤ- بچے پریشان ہو رہے ہیں- یہ میرا مسئلہ ہے-''

انہوں نے روشن آپا کو ٹیکسی میں سوار کرا دیا اور مجھے تانگے میں بٹھا کر پارک آ گئے- کھانے پینے کی بہت سی چیزیں وجیہہ کی اماں بی نے ساتھ بھیجی تھیں- سارا دن پارک میں گھومتے رہے- وجیہہ فکر مند تھے کہ روشن آپا نے نیچے والوں تو کیا جواب دیا ہوگا- اور وہاں سب کیا سوچ رہے ہوں گے رات ہم ایک ہوٹل میں تھے- وجیہہ چپ تھے اور ناراض بھی میں نے انہیں منانے خوش کرنے

کی بہت کوشش کی اور اپنا مطمع نظر سمجھانے کی ناکام سعی بھی کی وجیہہ کو خدشہ تھا کہ اماں ابا ان سے بھی ناراض اور بدظن ہو جائیں گے-

اگلے دن روشن آپا کے میاں کو ان کے دفتر فون کر کے وجیہہ نے دریافت کیا کہ روشن آپا نے وہاں کیا بتایا ہے- انہوں نے بتایا کہ ہنی مون کے لیے کوئٹہ گئے ہیں- روشن آپا کے میاں نے ہنس کر کہا اور یہ بھی کہا کہ دو ماہ کی چھٹی لے کر گئے ہیں- اب تو خوش ہو- ایک بوجھ سر سے اتر گیا-

وجیہہ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے گئے- دو تین دن ہم انہی کے گھر رہے اور پھر دو دن ہوٹل میں، غرضیکہ کسی طرح ایک ہفتہ پورا ہوا اور بہت سے پھل اور مٹھائی وغیرہ لے کر وجیہہ نے مجھے بتایا کہ میں اپنی سسرال میں یہ میکے کی مٹھائی اور پھل ظاہر کروں- میں چپ ہوگئی- دل سے ہوک سی اٹھی- گاؤں میں اماں بی سادگی کی تصویر بنی ہماری منتظر تھیں..... چند دن میں ہی وہ مجھے بے حد چاہنے لگی تھیں- وجیہہ کی چٹھیاں..... ختم ہو گئیں اور وہ چلے گئے-

جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے آئندہ کے بارے میں دریافت کیا- کہ کیا دو ماہ بعد میں میکے جاؤں گی- میں نے کہہ دیا-

''میں ابا کے لیے مر چکی ہوں اور مردے زندہ نہیں ہوتے-'' وجیہہ کا خیال تھا کہ شاید بھیا پھر آ جائیں اور ممکن ہے اماں بھی روٹھی بیٹی کو منانے آ ہی جائیں مگر میں ان کی خوش فہمی سے متفق نہ تھی- گھر میں اماں بی کے علاوہ ایک ملازمہ بھی رہتی تھی- اماں بی کے بھائی اسی گاؤں میں رہتے تھے- ان کی بیٹیاں بھی آ جاتی تھیں اور میرا وقت اچھا گزر جاتا مگر ویسے عام طور پر میں تنہا ہی تھی- اماں بی خالصتاً دیہاتی عورت تھیں شہری زندگی کے طریقوں سے ناواقف- لیکن وہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں- کبھی کبھی مجھ پر بیزاری کا حملہ ہوتا وہ طرح طرح سے بہلاتیں اور کبھی مشورہ دیتیں- کہ بہت گھبرا رہی ہو تو تھوڑے دن کے لیے میکے ہو آؤ-''

انہیں اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا کہ میرے میکے والے کیوں میری خبر نہیں لیتے- دو ماہ کی مدت ختم ہوگئی اور میرا دل زیادہ فکر مند اور پریشان ہوگیا- رات کو تنہائی میں چپکے چپکے روتی- اماں کا چہرہ- ابا کا سراپا- نادیہ اور افروز کی باتیں- گھر کی تمام گزری ساعتیں یاد آ کر بالپل سی مچاتیں اور میں بے بسی سے تکیے میں سر گھسا کر روتی- جانے کب اماں بی نے دیکھ لیا اور چپکے سے خط لکھ کر وجیہہ کو بلوا لیا- وہ آئے تو ان سے کہا-

''بہو کو اپنے ساتھ لے جا- کیسا آدمی ہے تو- نئی دلہن کو چھوڑ کر چلا گیا اور خیر خبر تک نہ لی-''

انہوں نے کہا ''خیر خبر کی کیا ضرورت ہے اماں بی- مجھے یقین تھا سب خیر ہے-''

''اچھا، اب ساتھ ہی لے جانا- یہاں اس کا دل گھبرا تا ہے- کوئی ساتھی نہیں، سہیلی نہیں-''

وجیہہ نے بہانے تراشے ''روشن آپا کا گھر بہت چھوٹا ہے- شہر میں مکانوں کی قلت ہے وغیرہ-''

اماں بی نے کہا-''وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہ لے گی تو اس کے رہنے کی فکر مت کر-''

رات کو تنہائی میں وجیہہ نے مجھے خوب ڈانٹا کہ میں رودھو کر ان کی اماں کو پریشان کرتی ہوں-

''تم نے مجھے اس قابل تو چھوڑا نہیں کہ کسی کا سامنا کر سکوں-ہر وقت ڈرتا ہوں کہیں ارشد سے ملاقات نہ ہو جائے-دفتر میں ہی دن رات رہ لیتا ہوں- آڑا ٹیڑھا سوتا ہوں-روشن آپا دفتر آ کر مل لیتی ہیں اور افسوس کرتی ہیں اس طرح ارشد یا تمہارے ابا بھی ملنے آ سکتے ہیں-وہ تو روشن آپا نے ہی بہانے بنا کر انہیں روکا ہوا ہے-ایک روز بازار میں آصف اور فوزیہ ملے تھے-فوزیہ نظروں سے سوال کر رہی تھیں-میں نہ سمجھنے کی ایکٹنگ کرتا رہا-اور کام کا بہانہ بنا کر بھاگا-تمہاری ضد نے مجھے سب کے سامنے شرمسار کر دیا ہے-اف نہ چین رہا نہ آرام-''

میں تاسف کے عالم میں ان کی برہمی کا عالم دیکھتی رہی-

اماں بی نے وجیہہ کی ایک نہ سنی-زبردستی مجھے ان کے ساتھ بھیج دیا-میں وجیہہ کا منہ دیکھتی رہی کہ کوئی بہانہ ایسا بتائیں کہ کار گر ہو-اماں بی مجھے خاموش دیکھ کر گڑبڑ گئیں-

''اے بہو-چپ کیوں ہو-منہ سے بولو کہ ساتھ جانا چاہتی ہو-یہ تو الو ہے-بدھو ہے-ارے بیوی کو ساتھ نہیں رکھ سکتا-تو شادی کی کیا پڑی تھی-''

اماں بی کے سامنے کوئی بہانہ نہ چلا-ہم شہر آ گئے-اسٹیشن پر کھڑے وہ دانت پیستے رہے کہ جائیں کہاں-پھر وجیہہ کا دوست کام آیا-ان کے گھر دو دن رہے-

روشن آپا مجھ سے ملنے آئیں اور حسب توقع مجھے سمجھانے لگیں-''ماں باپ سے روٹھ کر کبھی کوئی خوش نہیں رہا-ماں باپ اگر کسی غلطی پر سزا دیں یا غلط فہمی میں کوئی بات کہہ دیں تو اس کا اتنا اثر نہیں لینا چاہیے-وہ سب مجھ سے پوچھتے ہیں نازی کب آئے گی-''

''آپ ان سے کہہ دیں-نازی مر گئی ہے-ان لوگوں کے لیے تو.....مر ہی گئی ہوں میں-''

روشن آپا مجھے گھورتی رہیں-خفگی ان کے چہرے سے عیاں تھی-''اب تک تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ بناتی رہی تھی مگر اب.....سچ مچ کہہ دوں گی-نازی کا انتظار مت کریں-''

☆☆

وجیہہ نے بہت تگ و دو کے بعد دفتر کے اوپر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا-بہت تکلیف دہ تھا-کھڑکی نہیں تھی-باتھ روم بہت دور اور مشترکہ تھا-اس بلڈنگ میں سب ہی کنوارے مرد رہتے تھے-اور باری باری باتھ روم استعمال کرتے مجھے بہت دقت ہوتی-وجیہہ کی موجودگی میں ہی جا سکتی تھی اس طرح کہ دروازے کے باہر وہ پہرہ دے رہے ہوتے-

روشن آپا ہی نے اس وقت بھی مدد کی اور ایک چھوٹا سا مکان ڈھونڈ نکالا-شہر سے دور مگر صاف ستھری آبادی تھی-ایک کمرہ تھا-باتھ روم کچن، صحن بھی کچھ تھا-روشن آپا اور ان کے بچے گھر کو

سیٹ کرتے رہے-میں تو وجیہہ کی خفگی سن سن کر ادھ مری ہو رہی تھی-کیونکہ یہ جگہ دفتر سے بہت دور تھی اور ان کے لیے وقت پر دفتر پہنچنا خاصا مشکل نظر آتا تھا-اور وجیہہ کی رات کی ڈیوٹی بھی ہوتی تھی-لیکن اپنی ضد اور-ہٹ دھرمی کے باعث مجھے بہت کچھ سہنا تھا-اور ابھی تو ابتدا تھی-پھر بھی مجھے امید تھی میں مضبوطی سے ہر مشکل-سہہ لوں گی-قوت ارادی کے بھروسے پر-

چند دن میں اس گھر اور اس فضا سے مانوس ہو گئی-گھر کے دائیں بائیں کے مکانوں میں بہت نیک اور شریف لوگ رہتے تھے-وجیہہ نے بھی ٹرانسپورٹ کا کوئی حل نکال ہی لیا-اور قدرے سکون ہوا تو انہوں نے مجھے میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لیے زور دینا شروع کیا-گھر میں کوئی خاص کام نہ تھا اس لیے میں نے پڑھائی شروع کر دی-رات کو وجیہہ بھی میری مدد کرتے-مہینوں سے ایک حرف نہ پڑھا تھا اور اب نئے سرے سے تیاری کرنی تھی-مجھے کھانا پکانے میں دقت ہوتی-جو کام کبھی کیا ہی نہ ہو-اندازہ ہی نہ ہو-وہ بغیر کسی مدد کے کیسے ہوتا-

چنانچہ روز نئی نئی قسموں اور عجیب عجیب مزے اور ذائقے کے کھانے کھائے گئے-پھر روشن آپا نے کھانوں کی ترکیبیں لکھ کر مجھے دیں-چارٹ بنایا کہ کس دن کیا پکے-وجیہہ نے کبھی مجھے کھانا بدمزہ پکانے یا نہ پکانے پر نہیں ڈانٹا-وہ بس میرے بے ڈھنگے پن پر ہنستے رہتے-بستر سارا دن الجھے پڑے رہتے-جہاں تہاں میلے اجلے کپڑے پڑے رہتے-جھینگروں نے میرے دوپٹے چاٹ لیے-شلواریں چوہوں نے کتر لیں-

آتے آتے عقل آ ہی گئی-اتنی آمدنی نہ تھی کہ کوئی نوکر رکھتے-جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا-شاید میری بدسلیقگی اور کام نہ سیکھنے کی عادت سے ہی اماں خفا ہوتی تھیں مگر انہوں نے کبھی پیار دلار سے مجھے کچھ سکھایا ہی نہیں-کہتی تھیں-

''سیکھنے والے خود ہی سیکھ لیتے ہیں-سب کو بیٹھ کر تو نہیں سکھایا جاتا-فوزیہ کو بھی خود ہی کام کا شوق ہوا-''

خیر وہ تو تھیں ہی بقراط..... روشن آپا کتنی نرمی اور پیار سے طریقہ بتاتی تھیں کہ ذہن نشین ہو جاتا تھا-

میٹرک کی تیاری زوروں پر تھی-داخلہ جا چکا تھا اور وجیہہ بھی مجھے ہر وقت پڑھانے پر تلے ہوتے-رات دیر تک پڑھاتے ٹیسٹ لیتے-پھر کبھی ڈانٹتے کبھی شاباشی-

اتنے عرصے میں صرف ایک بار وجیہہ کی رات کی ڈیوٹی ہوئی-اس کے بعد انہوں نے رات کی ڈیوٹی سے معذوری ظاہر کر دی-یوں لگتا تھا کہ روشن آپا نے میرے بارے میں اماں ابا کو سچ بات بتا دی-اس کے بعد انہوں نے اماں ابا کا کوئی ذکر نہیں کیا-نہ ہی وجیہہ نے کبھی ان کا نام لیا-حالانکہ وہ جب روشن آپا کے گھر گئے تو نیچے بھی گئے تھے اور کافی دیر بیٹھے بھی تھے-یہ بات مجھے

روشن آپا کے بیٹے نے بتائی تھی۔ مگر وجیہہ نے خود ذکر نہیں چھیڑا۔ میں بھی خاموش رہی۔

امتحان شروع ہو گئے۔ حسب توقع پرچے شاندار ہو رہے تھے۔ مجھے گھر کا کوئی کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ پڑھنا اور صرف پڑھنا۔ کھانا بازار سے آتا تھا۔ ناشتہ وجیہہ خود بنا لیتے اور مجھے گھنٹہ بھر مکمل آرام کا وقت ملتا۔ کبھی کبھی ہم شام کو ٹہلنے نکل جاتے۔ میں صبح اٹھتے ہی جلدی جلدی بستر ٹھیک کرتی۔ اب مجھے کچھ عقل آ گئی تھی۔ وجیہہ کی طبیعت مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا انہیں گندگی اور بکھرے ہوئے سامان سے وحشت ہوتی تھی۔

انہوں نے میری وجہ سے ایک موٹر سائیکل قسطوں پر لے لی۔ یہ پہلی عیاشی تھی۔ امتحان سے پہلے ہی میں جاگ جاگ کر اور پڑھ پڑھ کے نیم جان ہو چکی تھی اور روشن آپا کی تاکید تھی کہ سوتے وقت میں دودھ ضرور پیا کروں۔ مگر میرے سونے کا وقت ہی کہاں تھا جب تھک جاتی ادھر ادھر لڑھک جاتی۔ مہربان نیند پلکوں پر بیٹھ کر دنیا کی فکر ہی بھلا دیتی۔

سارے امتحان ختم ہوئے۔ سکھ کا سانس لے کر میں نے بستر سنبھالا تو سہ پہر تک سوتی رہی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ نیند کے نشے میں بدمست لڑکھڑاتی جھومتی میں دروازہ کھولنے گئی۔ روشن آپا کا کنبہ۔ ہنستا مسکراتا گھر میں داخل ہوا شوکت بھائی نے کئی ڈبے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے۔ سیما نے بھی اور خود روشن آپا بھی خالی ہاتھ نہ تھیں۔ ڈبے، ٹفن بکس باسکٹ، تھیلے، انواع واقسام کی چیزوں سے بھرے ہوئے۔

''یہ سب کیا ہے روشن آپا؟'' میں سٹپٹائی انہیں تک رہی تھی۔

انہوں نے ہنس کر کہا ''آج تمہاری دعوت ہے۔ رات کے کھانے کی میری طرف سے۔ ٹفن بکس میں کھانا ہے کھول کر رکھ دو۔ اور یہ تھیلے۔ تمہارے بہنوئی نے شام کی چائے اپنے ذمے لے لی ہے۔ یہ خود اپنی پسند کی چیزیں لائے ہیں۔''

لیکن..... مگر..... یہ'' میری سمجھ میں کچھ آ یا ہی نہیں۔

وہ مجھے لپٹا کر پیار سے بولیں۔ ''مجھے پتا تھا۔ میری پگلی نازی کو یاد ہی نہ ہو گا کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ ہے۔'' میں آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

''تو۔ تو آپ نے تکلیف کیوں کی؟'' میں ہکلا کر رہ گئی ''میں پکا لیتی رات کا کھانا۔''

''اور تیرا وہ خاوند ہمیں جو کچا کھا جاتا۔ امتحان جو ہوا بنا کر سر پر بٹھا گئے تھے۔''

وجیہہ آ گئے تھے۔ حیران اور خوش ہو کر پوچھنے لگے۔ ''بھئی یہ فوجیں کہاں دھاوا مارنے آئی ہیں؟''

''آپ کے گھر پر ہی دھاوا ہے فی الحال۔ کچھ یاد ہے جناب۔'' سیما ماموں کے بازو سے لپٹ گئی تھی۔ ''آج آپ کی شادی کو پورا ایک سال ہو گیا ہے۔''

''اررے ... میں تو سوچ رہا تھا آپ سب کو ہوٹل میں شاندار ڈنر دوں گا۔ پہلی سالگرہ ذرا دھوم دھام سے منانی چاہیے۔''

''کیا آپ کو یاد تھا ماما..... یہ دن.....؟ مامی کو یاد نہیں تھا۔''

وجیہہ نے ہنس کر مجھے دیکھا۔ ''ان کے سر پر امتحان کا بھوت سوار تھا۔ سدھ بدھ بھلا دی تھی اس نے۔''

میں باورچی خانے میں آ کر چائے بنانے لگی۔ روشن آپا کی لائی ہوئی چیزیں پلیٹوں میں رکھ رہی تھی۔ وجیہہ چپکے سے اندر آ گئے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر شوخی سے بولے۔

''پہلا سال خیریت سے گزر جانے کی مبارکباد۔'' میری آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اپنی یادداشت کی کمزوری اور لاپروائی پر میں خود سے ہی خفا ہو گئی۔

''سالگرہ کا تحفہ۔'' وجیہہ نے ایک سنہری زنجیر میری گردن میں پہنا دی جس میں دل کی شکل کا لاکٹ تھا اور جس پر سرخ نگوں سے ''مائی لو'' لکھا تھا۔ میرے چہرے پر خوشی اور شرم کی سرخی چھانے لگی۔ وجیہہ نے بھی زبان سے میرے لیے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''یہاں کیا کرنے لگے ماما؟'' سیما بولتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ میں تشکر کے آنسو اور محبت کے جذبات کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک دبیز سی زمین پڑی تھی جسے پھلانگنے کے ارادے سے وجیہہ اور قریب آنے ہی والے تھے کہ سیما اندر آ گئی۔

''ارے..... میں تو شادی کی سالگرہ کا تحفہ نازی کو دینے آیا تھا۔ تم کہاں ٹپک پڑیں۔ بے وقوف۔ وہ میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا۔'' وجیہہ سیما کو پیار سے ڈانٹنے لگے۔

روشن آپا اور شوکت بھائی ہم دونوں کے لیے بے شمار تحائف لائے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے جڑواں بیٹوں اختر، اطہر نے بھی ایک ڈبہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سنہری بالوں نیلی آنکھوں والی دو گڑیاں تھیں۔ بہت پیاری تھیں۔ مجھے ان پر اس قدر پیار آیا کہ سینے سے لگا کر چومنے لگی۔ دونوں بچے تالیاں۔ بجانے لگے۔

''یہ بہت شیطان ہیں۔ اپنی پسند سے خریدی ہیں یہ گڑیاں دیکھو نازی۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔ ایسی ہی چیتی جاگتی دو گڑیاں میرے بچوں کے لیے۔''

انہوں نے شرارت سے اشارہ کیا۔ ''اور ذرا جلدی۔ ورنہ عمر کا بہت فرق ہو جائے گا۔ پھر تمہاری نیت بدل جائے گی۔ کہو گی کہ آپ کے بیٹے بڈھے ہو گئے ہیں۔ میری بچیاں ابھی کم سن ہیں۔''

وجیہہ جھینپ کر بولے۔ ''کیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے ہمیں۔''

''جلدی.....'' روشن آپا کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ''تم کو نہ ہو گی۔ نازی کو تو ہے۔''

''نہیں..... نہیں۔'' وجیہہ گھبرا کر مجھے دیکھنے لگے۔

''امتحان میں گڑبڑ نہ کر دینا۔'' وہ ایک دم مجھے ڈانٹنے لگے۔ ''ابھی پریکٹیکل باقی ہیں۔''

''میں پرسوں آ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔'' روشن آپا نے کہا۔ ''اب تک تو امتحان کے خاتمے کی منتظر تھی۔ اب ذرا سا اسے بھی چین کا سانس ملا ہے۔''

''اچھا میری مبارکباد واپس کر دو۔'' وجیہہ اچانک سنجیدگی سے بولے۔ میں ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہی۔

''لاؤ..... لاؤ..... واپس کرو۔'' وہ چٹکی بجا کر جانے کیا مانگ رہے تھے۔ ''میں نے کہا تھا۔ پہلا سال خیریت سے گزر جانے کی مبارکباد۔ نہیں واپس کرو تی مجھے۔ وہ پہلا سال بھی خیر سے خالی تھا۔''

''ارے چپ!'' روشن آپا ڈانٹنے لگیں۔ ''بے چاری کو پریشان کر دیا۔ اللہ نے خیر ہی کی ہے۔ اور انشاءاللہ سب خیر ہی ہوگی۔ اپنی شکل دیکھی ہے۔ قسمت والا ہے وجیہہ۔ شکر ادا کر۔''

شام کی چائے کے بعد سب لوگ باہر نکلے۔ کافی دیر پارک میں ٹہلنے کے بعد گھر واپس آئے۔ رات کا کھانا کھا کر روشن آپا اور ان کی فیملی واپس گئی۔ انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر وجیہہ اندر آئے تو مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ کچھ شرم۔ کچھ فخر۔ نئی سی امنگ مدھم مدھم غم کی کسک۔ وجیہہ نے مجھے گود میں اٹھا کر ایک چکر دے ڈالا۔

''یہ کیا کر دیا تو نے؟'' وہ سرگوشی میں پیار سے بولے۔

''میں نے نہیں کیا۔ مجھے تو خبر بھی نہیں۔'' میں سچ مچ بے خبری پر حیران تھی۔

''جانے تیری بے خبری اور کون سے گل کھلائے گی۔''

اس رات پھر جاگنے کی رت آئی تھی۔ کورس کی نہیں جو کتاب محبت وجیہہ کے پاس تھی۔ اور وہ مجھے ایک ایک لفظ پڑھا رہے تھے۔ امرت کی بوندیں میری رگ رگ میں زندگی بن کر دوڑ رہی تھیں اس رات پہلی بار وجیہہ نے کھل کر اظہار محبت کیا۔ میں سرسے پیر تک ایک سرخوشی اور آسودگی میں ڈوب گئی۔ فخر و مسرت، حیا و بے خودی نے مجھے اس رات ایک نیا اور انوکھا احساس عطا کیا۔ اہمیت۔ میری اہمیت آج ظاہر ہو رہی تھی۔ شادی کے دن کی وہ کیفیت جو ابھی تک مجھے بھولی نہ تھی۔ وہ محرومی۔ غم و غصے کی زیادتی۔ اماں ابا کی نفرت اور بے نیازی۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ میری آنکھوں میں وجیہہ کی محبت کے سائے تیر رہے تھے اور ان کا نرم ملائم لہجہ میرے کانوں میں شہد ٹپکا رہا تھا۔ ان کی وہ محبت، چاہت۔ اعتماد اور یقین سے پر سلوک۔ اور ریشم کی طرح نرم، پھسلواں رویہ نئی لذت سے ہمکنار کر رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرح چھو رہے تھے جیسے میں چھوئی موئی کا پودا ہوں۔

''مجھے پتا نہیں تھا۔ تم شادی کی سالگرہ پر مجھے اتنا بڑا، ایسا انوکھا، اچھوتا اور اس قدر قیمتی تحفہ دو

گی۔''

انہوں نے محبت سے پر جذبات میں ڈوبے لہجے میں چپکے سے کہا۔ میں نے ان کو شادی کا تحفہ دیا ہی نہیں تھا۔ اور اپنی اس کوتاہی پر مجھے خاصا ملال تھا۔ جب انہوں نے مجھے لاکٹ پہنایا میں تبھی سے اپنی یادداشت کو کوس رہی تھی۔

''یہ تحفہ جو ابھی محض خوشخبری کی صورت میں ملا ہے اس قدر پیارا ہے۔'' وہ سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔ ''تو جب جیتی جاگتی صورت میں ملے گا میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔''

اے کاش۔ کسی نے مجھے بتایا ہوتا کہ جب کوئی مرد عورت سے کسی ایسے تحفے کے بارے میں اظہار مسرت و تشکر کر رہا ہو۔ تو وہ عورت کی زندگی کا سب سے خوبصورت سب سے قیمتی لمحہ ہوتا ہے۔ محبت کی معراج ہوتی ہے۔ ان کے اس قدر حسین خیالات سے پرسوالوں کے جواب میں کیسے دیتی۔ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ صرف اس محبت کے جواب میں میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ خود بخود۔

☆☆

دن ایسے گزر رہے تھے جیسے اڑتے جا رہے ہوں۔ میرا ایک امتحان ختم ہو گیا تھا اور دوسرے کی تیاری تھی۔ ''اے خدا مجھے اس میں کامیاب کرنا۔'' میں اللہ سے دعا کرتی۔

وجیہہ کی تمناؤں کو پورا کرنا میں فرض سمجھتی تھی۔ اسی لیے روشن آپا کی ہدایتوں پر پابندی سے عمل کرتی۔ اف..... ان دنوں کی بے پایاں مسرت و آسودگی۔ وجیہہ کی بے تابانہ کیفیت۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ مجھ پر گہری نظر رکھتے۔ میں کیا کھا رہی ہوں۔ کتنا کھا رہی ہوں۔ دوا پھینک تو نہیں دیتی۔ دوا مجھ سے واقعی پی نہیں جاتی تھی مگر وجیہہ کے لیے تو میں جان بھی دے سکتی تھی۔ ان کی خواہش پر دوا اپنا کون سا بڑا کام تھا۔ ان کے سوا اور مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ یہی ان کی اپنی حالت تھی۔ ہر دم میری فکر۔ ہر وقت میرا خیال۔ میں سوچتی کیا کوئی کسی سے اتنی محبت کر سکتا ہے۔ کم از کم مجھ سے جس کی بے وقوفی کی حد نہیں۔ بے ڈھنگے پن کی انتہا نہیں ''اے خدا میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ مجھے کس نیکی کے صلے میں اتنی محبت اور عزت عطا کی ہے تو نے؟''

اس دن ہاسپٹل میں زندگی اور موت کا مقابلہ تھا۔ اذیتوں کے کارواں در کارواں مجھے پچھاڑنے کے لیے آتے درد کے قافلے میری ضبط کی طنابیں کھینچ رہے تھے۔ سارا جسم پھوڑا بن کر پھوٹنے کے قریب ہو گیا۔ کرب کی لہریں رونیں رونیں میں پیوست ہو گئیں۔ تو زندگی کی نوید بن کر ایک چیخ فضا میں بلند ہو گئی۔ آسمان کی وسعتوں میں، فضا کی پہنائیوں میں۔ ہواؤں کے دوش پر لہراتی گونجتی۔ خدائے بزرگ و برتر کے دربار سے سرخرو ہو کر زندگی فخر و غرور کا ایک تاج مجھے پہنا گئی۔ زندگی۔ زندگی کا جنگی نعرہ بلند ہوا تو خوشی کی بے اندازہ یورش سے میں بے ہوش

ہوگئی- ہوش میں آ کر میں نے روشن آپا کو دیکھا- ڈاکٹر کہہ رہی تھی-

''بچہ بہت ویلد کی تھا اور یہ کمزور ہیں-''

ڈاکٹر کو علم نہیں مجھے وجیہہ کی محبت کی طاقت حاصل ہے روشن آپا میری تیمارداری میں مصروف ہو گئیں- وجیہہ بہت خوفزدہ سے کمرے میں آئے- شاید انہیں میری زندگی سے مایوسی ہوگئی تھی- وہ ڈرتے ڈرتے قریب آئے اور بے تابی سے میرا ہاتھ چومنے لگے- ان کی آنکھوں میں بیچارگی کیفیت تھی- مجھے ایک بار پھر اس پرانے درد نے گھیر لیا- زندہ ماں سے محرومی کا درد- ماں کی محبت سے ناشناسی کا غم- روشن آپا اور وجیہہ کے سوا کیا اور کوئی بھی میری خیریت اور زندگی کا طلبگار نہیں؟ میری دنیا کیا صرف انہی تک محدود رہے گی-

جی چاہا روشن آپا سے پوچھوں- اماں کو آپ نے میری اس حالت کی اطلاع دے دی ہے؟ مگر جواب بھی مل گیا- وہ بچے کو گود میں لے کر کہہ رہی تھیں-

''پہلی بار تو نانی یادادی کی گود میں دیا جاتا ہے بچہ- مگر میرے لاڈلے- اس وقت تم مجھی کو نانی دادی سمجھ لو- دادی تمہاری ضعیف اور سفر سے معذور ہیں- نانی شہر میں موجود نہیں وہ تمہاری خالہ کے پاس مری گئی ہوئی ہیں- تمہاری خالہ بھی سنا ہے بہت بیمار ہیں-'' شاید وہ مجھے سنانے کو کہہ رہی تھیں- میں نے آنکھیں بند کر لیں اور غیر ارادی طور پر آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے- روشن آپا دور بیٹھی کہہ رہی تھیں-

''نازی! تمہارے ابا بھی تمہاری طرف سے فکرمند ہیں- تمہاری خیرت پوچھتے رہتے ہیں- میری مانو- ہاسپٹل سے میرے گھر چلو- سب کے دل نرم ہو جائیں گے اور تمہیں لینے بھاگے آئیں گے- ہاں یقین کرو- میں نے خود انہیں روکا ہوا ہے-''

''آپ..... آپ ان سے کہہ دیجیے گا- میں مرگئی- مجھے کسی نرمی گرمی کی ضرورت نہیں-'' رندھی ہوئی آواز میں کچھ اور نہ کہہ سکی-

''مری جاسکتی ہیں آپی کے حکم پر- میرے پاس آ جائیں تو میں گھر سے تو نہ نکالتی انہیں- میری غلطی کی سزا تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خطا تو صرف چھوٹے ہی کرتے ہیں نا- بڑے تو کبھی کوئی غلطی نہیں کرتے- ضدی اور گستاخ کس نے بنایا مجھے؟ بزرگوں کی غلطیوں نے- اماں کے غلط سلوک اور رویے نے-''

میرے پیدا ہونے پر اماں جو بہت بیمار ہوگئیں- کئی ماہ بستر پر پڑی رہیں- ماموں انہی دنوں بی بی کا شکار ہو کر مر گئے انہی دنوں ابا کو کاروبار میں گھاٹا ہوا- اور وہ نوکری کرنے پر مجبور ہوئے-

ان تمام نقصانات کی ذمہ داری میری پیدائش پر ڈال دی گئی- میں منحوس تھی یا بدبخت- تھی تو اماں کی اولاد مگر انہوں نے مجھے لاپروائی کا نشانہ بنایا اور میں نانی کی گود میں پلنے لگی- وہ مجھے بہلانے

کے لیے اوپر لے جا رہی تھیں- زینے سے گر گئیں- مجھے کچھ نہیں ہوا- نانی کی ٹانگ ٹوٹ گئی- اس کی ذمہ دار بھی میں تھی- پھر ٹانگ کے زخم کے سلسلے میں بے چاری نانی آخر کار مر ہی گئیں- ان کی موت میرے جرائم کے خانے میں فٹ کر دی گئی جیسے یوں تو وہ کبھی نہ مرتیں- قیامت کے بورے سمیٹتیں-

پھر چند سال بعد نادیہ اور افروز پیدا ہوئیں- میں جو اماں کی نظر کرم کی ترسی ہوئی تھی ان کو اماں کی گود میں برداشت نہ کر سکی- دشمنی پر اتر آئی- ابا کو ایک بہت ہی اچھی ملازمت مل گئی- اماں نے فخر سے کہا- ''یہ نادیہ- افروز کی قسمت سے ملی ہے-'' گویا میں ہی بدقسمت تھی- میں ان کی اور بھی دشمن ہوگئی- موقع ملتے ہی دونوں کے گال نوچتی- انہیں دھکا دے کر گرا دیتی- اماں مجھ کو جواب آں غزل کے طور پر خوب مارتیں، کوستیں- بس یہی تو کر سکتی تھیں وہ- آج بھی- ان کی نظروں میں میں مجرم ہوں-

☆☆

گاؤں سے اماں بی کی بیماری کی خبر آئی- روشن آپا اور وجیہہ نہایت افراتفری اور پریشانی میں گاؤں چلے گئے- وجیہہ میری وجہ سے پریشان تھے- کہنے لگے-'' جا کر دیکھوں گا- اماں کی طبیعت بہتر ہوئی تو شام تک آ جاؤں گا-''

وہ چلے گئے اور میں بالکل تنہا رہ گئی- وجیہہ اس دن کیا تین دن تک نہیں آ سکے- شاید ان کو موقع نہیں ملا- اماں بی کی حالت ٹھیک نہیں ہوگی- ادھر ڈاکٹر مجھے ڈسچارج کرنا چاہتے تھے میں گھبرا گئی اور مجھے اپنی اماں کی ضرورت کی اہمیت کا احساس ہوا- نادیہ افروز یاد آئیں- وہی ہوتیں- مجھے اتنی تنہائی تو نہ ہوتی- میں خوب روئی- یہاں تک کہ بخار ہوگیا- ہاسپٹل میں رہنے کا استحقاق مل گیا- پانچویں دن وجیہہ آئے- بہت تھکے ہوئے تھے- اماں بی کو رخصت کر کے آئے تھے- بہت افسوس ہوا- انہوں نے مجھے بہت چاہا تھا- اے کاش وہ اپنا پوتا دیکھ لیتیں- میں وجیہہ کو کن الفاظ میں تسلی دیتی روشن آپا گاؤں میں رہ گئی تھیں-

مجھے اپنے گھر آئے دوسرا دن تھا- شوکت بھائی نے آ کر بتایا کہ ان کو دبئی میں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے- اسی ہفتے وہ جا رہے ہیں- ایک مہینے بعد روشن آپا کو بلا لیں گے- وہ خود گاؤں جا کر انہیں بتا آئے ہیں- وہ وہاں گھر کے سامان تقسیم کر رہی تھیں- کیونکہ اب وہاں کسی کو رہنا تو نہیں تھا- خاص خاص چیزیں محفوظ کر کے آئیں گی جو ہم لوگوں کے کام آ سکیں- میں یہ خبر سن کر پریشان ہوگئی- روشن آپا بھی چلی جائیں گی میں تنہا رہ جاؤں گی- اس شہر میں میرے کتنے عزیز ہیں- پھر بھی تنہائی میرا مقدر- مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ اگر یہی سلسلہ محبتوں سے بچھڑ جانے کا قائم

رہا تو کہیں میں وجیہہ کی محبت سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔

اچانک وجیہہ کو پنڈی میں بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ وجیہہ کو اگلے دن ہی دفتر میں حاضر ہونا تھا۔ ہم بہت افراتفری اور جلدی میں روانہ ہوئے۔ روشن آپا سے بھی نہ مل سکے پنڈی میں کافی سردی تھی۔ میں بچے کی نگہداشت میں مصروف رہتی۔ پھر بھی وجیہہ کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی کہ ان کو شکوہ نہ ہو کہ میں ان سے غافل ہو گئی ہوں۔ ویسے وہ خود بھی مجھے تاکید کرتے کہ میں بچے ہی کا کام کروں۔ اپنے کام وہ خود کر لیتے۔

''میرے گلشن حیات کی بہار ہو تم۔''

وجیہہ مجھ سے اور گل سے مخاطب ہو کر گنگناتے۔ ان کے دفتر میں بہت کام تھا۔ مصروفیت بھی زیادہ اور مہنگائی بھی بہت تھی۔ وجیہہ کا بس نہ چلتا کہ بچے کے لیے کون کون سی نعمتوں کا ڈھیر لگا دیں مجھے جینا پرونا نہیں آتا تھا مگر گل کی خاطر یہ بھی سیکھا۔ اور تب مجھے معلوم ہوا انسان جو کام کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ خصوصی طور پر کسی سے سیکھنا ضروری نہیں۔ میں اس کے لیے خوبصورت بش شرٹ اور کرتے سیتی۔ ان پر پھول بناتی۔ منے منے موزے بناتی اور اکثر اپنے کام میں ایسی غافل ہو جاتی کہ وقت گر جاتا اور مجھے خبر نہ ہوتی۔ غرضیکہ چوئیس کھاتے کھاتے وہ سال بھر کا ہو گیا۔

روشن آپا دوبئی جاتے ہوئے مل کر گئی تھیں اور وہاں سے برابر تحائف بھیجتی تھیں۔ ہر دیکھنے والا اسے پیار کرتا۔ ہمارا تو وہ بیٹا تھا مگر غیر لوگ بھی اس کی تعریف کرتے۔ تندرست تو تھا ہی۔ میں تو دن بھر اسے سنبھالے سنبھالے تھک جاتی۔ شام کو وجیہہ آتے تو میری جان میں جان آتی۔ پھر..... وہی اسے لیے پھرتے۔

ہمارے پڑوس میں ایک سیدانی بی بی رہتی تھیں۔ بیوہ تھیں اور بے حد خوددار۔ ان کی بیٹی..... جوان تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اب کوئی کورس کر رہی تھی۔ وہ دونوں میرے پاس اکثر آ جاتیں ان کی بیٹی حو بے بی کہلاتی تھی گل سے کھیلتی رہتی تھی کبھی اسے اپنے گھر بھی لے جاتی۔ تو وہ گھنٹوں وہاں رہتا۔ روتا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن وجیہہ نے آ کر پوچھا۔

''نازی، تم کالج میں داخلہ لوگی؟'' میں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔ میرے خواب کیا کبھی شرمندہ تعبیر بھی ہوں گے۔؟ اب مجھے اس کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی۔

''پچھیلی گلی میں کالج ہے۔ صبح آٹھ بجے سے دن کے ایک بجے تک کی جدائی اگر منظور اور گوارا ہو تو بیٹے کو بے بی کے حوالے کر کے جا سکتی ہو۔'' گویا میرا امتحان تھا۔

''مگر ایک شرط۔ دوسرے گل کی تیاری نہ کرلینا۔ میرے ارادے خاک میں مل جائیں گے اور کلاس فیلوز مذاق اڑائیں گی۔''

وہ میرے کالج میں داخلے کے لیے سنجیدہ تھے۔ میں نے داخلہ لے لیا۔ صبح سویرے سارا کام نپٹا

کر گل کے کپڑے، دودھ کی بوتل وغیرہ بیگ میں رکھتی۔ ناشتہ بناتی۔ میں اور وجیہہ ناشتہ کر کے ایک ساتھ نکلتے۔ میں ایک بجے واپس آتی تو بے تابی سے گل کو لے کر گھر میں گھستی اور اتنی دیر کی جدائی کی خوب کسر نکالتی۔ اس کا منہ چوم چوم کر گال سرخ کر دیتی۔ لپٹا لیتا کر بھینچتی۔ میری ممتا کی تسکین ہوتی تھی۔ میں بہت مصروف ہو گئی تھی۔ پڑھائی اور گھر کے کام۔ کبھی کبھی تو مجھے لباس کا ہوش بھی نہ رہتا۔ وجیہہ دیکھ کر پوچھتے۔

''اتنے میلے کپڑے؟ بات کیا ہے؟ کوئی فکر ہے؟'' میں بمشکل انہیں یقین دلا پاتی کہ بس لاپروائی ہے فکر نہیں۔

اس دن وجیہہ نے یاد دلایا کہ گل کی سالگرہ ہے۔ ایک بار پھر..... تنہائی کا احساس پچھتاوے کے درد کو جگا گیا۔ میرے بیٹے کی سالگرہ۔ اور اس کی خوشی منانے کے لیے میرا یا وجیہہ کا کوئی عزیز موجود نہیں۔ میں کتنی بدبخت تھی اور کیسے لاپروا میرے والدین تھے۔ وہ جنہوں نے مجھے جنم دیا۔ پرورش کی۔ محض میری ضد کی وجہ سے آج کوسوں دور تھے۔ خوشی منانے والا تھا ہی کون؟ گل کو نئے کپڑے پہنائے اور شام کو بے بی کے ساتھ سیر کے لیے نکلے۔ گل کے ہاتھ سے یتیم خانے میں چندہ دلوایا۔ پارک میں گل اور بے بی نے جھولا جھولا۔ کچھ تصویریں اتاری گئیں۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور گھر آ گئے۔ ایک پیارا اور حسین دن تمام ہوا۔

بے بی بہت خوش تھی۔ وہ ایک غریب گھر کی بچی تھی۔ مگر تعلیم اور خاندانی شرافت نے اسے ایک باوقار شخصیت بنا دیا تھا۔ سیدھی، سادی معمولی لباس میں ملبوس، چہرے پر تمکنت اور حیا کی آمیزش، بہت سنجیدہ، بردبار اور خاموش لڑکی تھی۔ میری اس سے خوب نبھتی۔ اس کی اماں بھی مطمئن تھیں۔

مجھے بے بی بہت پسند تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، ذہانت دوسروں کے کام آنے کا جذبہ، اپنی حالت، غربت اور قناعت۔ جو سب سے منفرد رکھتی تھی اسے۔ اس دن شام کو حسب معمول میں کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بے بی سے کہا۔ ''دیکھو شاید دودھ والا ہو گا۔''

کالج سے آ کر میں..... کولھو کے بیل کی طرح کام میں لگ جاتی۔ کپڑے دھونا، بکھرا سامان سمیٹنا، صفائی اور نہا دھو کر شام کے کھانے کی تیاری۔ جو کہ صبح جلد کالج جانے کی وجہ سے نہیں کر پاتی تھی۔ وجیہہ شام کو گھر میں ہی کھانا کھاتے تھے۔ کھانا تیار کر کے کپڑوں کی استری ہی باقی رہ جاتی۔ اس کے بعد کبھی کبھار وجیہہ اور میں گھومنے نکل جاتے گل تو سیر کا عادی ہو گیا تھا۔ باپ کی صورت دیکھتے ہی باہر جانے پر بضد ہوتا۔ اسی لیے میں جلدی جلدی تمام کاموں سے فراغت پا لینا چاہتی تھی کہ وجیہہ کے آنے کے بعد کچھ اور نہ کرنا پڑے۔ بے بی دروازہ کھولنے گئی تھی۔ میں زور لگا کر وجیہہ کی پینٹ استری کر رہی تھی۔ اچانک میرے کان کھڑے ہوئے۔ کوئی شناسا آواز۔ جیسے

دور سے میرا بچپن مجھے بلا رہا ہو- میں صحن میں جھانکنے لگی- پلکیں جھپکیں- ہونٹ چبائے- پھر بھی یقین نہ آیا کہ آپی بے قرار ہو کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں-

''میری آپی.....!'' زن زن کتنے ہی سین تصور میں فلم کی طرح تیزی سے گزرنے لگے-

سن.....سن.....میرا لہو سنسنا رہا تھا چہرہ تپ گیا تھا- سمجھ میں نہیں آتا تھا روؤں یا ہنسوں کبھی نہ کبھی ایسا ہونا ہی تھا- آصف بھائی پیچھے کھڑے مسکرا رہے تھے- کہنے لگے-

''فوزیہ! دیکھو تو لو- تمہاری بہن ہوش میں بھی ہے یا نہیں-''

آپی مجھ سے الگ ہوئیں تو میں نے محسوس کیا میری آنکھیں لبالب پانی سے بھری ہوئی ہیں- آنچل سے آنکھیں رگڑتے ہوئے آپی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا- آصف بھائی کو کرسی دی-

''اف اللہ! میں بتا نہیں سکتی کس مشکل سے تیرا گھر ملا ہے-'' آپی تیز تیز بول رہی تھیں- ''کب سے کوشش میں تھے ہم- آج اتفاقاً یہ ادھر آئے تھے تو وجیہہ کو گلی سے نکلتا دیکھ کر سمجھ گئے- پھر اندر جا کر کسی سے پوچھا- تب صحیح پتا معلوم ہوا- اور جناب اب آتے ہوئے پھر بھول گئے- دو گھنٹے سے پھر رہے ہیں-''

آپی کی آواز بھی تیز تھی اور لہجہ بھی- میں اپنی اس بہن کو یاد کر رہی تھی جو کم گو اور دھیمے لہجے میں بات کرتی تھی- اور یہ- یہ تو میک اپ میں لپی پتی کوئی رنگین گڑیا تھی- جانے کیسا تکلف درمیان میں حائل ہو گیا تھا- میں چپ کھڑی رہی-

''تم نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے؟ میلے کپڑے، اجڑا حلیہ تم اتنی دبلی کیسے ہو گئیں- میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی تمہیں اس حلیے میں دیکھوں گی- اچھے لباس کا تم کو کس قدر شوق تھا- اماں کی ڈانٹ سنتی تھیں پھر بھی باز نہیں آتی تھیں- ہیں؟''

آصف بھائی نے کہا- ''ارے- کچھ نازی کو بھی بولنے دو- آپی رک گئیں- میں شرما سی گئی- اسی وقت بے بی نے مجھے پکار کر پوچھا-

''بھابھی- گل کو میں باہر لے جاؤں؟''

''ادھر ہی لے آؤ بے بی-'' میں نے آہستہ سے کہا- اور جانے میرا دل خود بخود کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا- گل کی پہلی بار اپنے خاندان میں رونمائی ہو گی- بے بی اندر آئی تو اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ اور جسم ڈھانکا ہوا تھا- گل مٹی میں کھیل کر آیا تھا- اس کے گھونگھر پالے بال الجھے الجھے تھے- وہ سفید نیکر گلابی بش شرٹ پہنے ہوئے تھے- نیکر میلا ہو رہا تھا- جب کہ قمیص کی رنگت اس کی جلد کی رنگت سے مل رہی تھی-

''ہائے سویٹ.....!'' آپی استعجابی چیخ مار کر اٹھیں اور میری گود میں اسے دیکھ کر بھی نہ سمجھ سکیں- بے بی اسے چھوڑ کر باہر چلی گئی-

''گل- خالہ امی کو سلام کرو-'' میں نے قدرے شرما کر اس سے کہا-

آپی خوشی سے کھل گئیں- انہوں نے جھپٹا مار کر اسے مجھ سے چھین لیا اور بے قراری سے چومنے لگیں- ''دیکھو تو آصف اسے دیکھو-'' وہ خوش ہو کر آصف بھائی کی طرف بڑھیں- آصف بھائی نے اسے گود میں لے لیا میں نے گھبرا کر کہا- ''ارے اس کا بدن مٹی میں اٹا ہوا ہے- آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے-''

انہوں نے ایک تیز نظر مجھ پر ڈالی- خفگی کی نظر- شکایت سے بھری نظر- وہ مجھے نادم کرنے کو کافی تھی- وہ گل سے تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگے-

''ہائے نازی- کتنی سنگدل ہے تو- ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی- اماں ابا کتنے خوش ہوتے-''

''یہ تو وہیں پیدا ہوا تھا جب تم بیمار تھیں اور اماں تمہارے پاس گئی ہوئی تھیں- روشن آپا نے ضرور بتایا ہو گا-''

''اچھا..... میرے سامنے تو کبھی ذکر نہیں ہوا-'' وہ پہلو بچا گئیں-

آصف بھائی نے سو سو کے نوٹوں کی گڈی جیب سے نکالی اور بغیر گنے گل کے ہاتھ میں دے دی- میں بوکھلا گئی- ''نہیں نہیں یہ نہیں ہو گا- پلیز-''

آپی زور سے بولیں ''کیوں نہیں ہو گا- میں پہلی بار بھانجے کو دیکھوں اور کچھ نہ دوں- اور یاد ہے تو نے میری شادی پر اپنے لیے ایک جوڑے کی فرمائش کی تھی-''

آصف بھائی گل کو میری گود میں دے کر کھڑے ہو گئے-

''دیکھیے- یہ پیسے آپ رکھ لیں- میں وجیہہ کی اجازت کے بغیر نہیں لوں گی-'' میں نے نوٹوں کی وہ کتاب ان کو واپس کرنا چاہی مگر آپی سے میں جیت نہیں سکتی تھی-

آصف بھائی موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگے ''بھئی، یہ تو کسی پہلو ان کا بیٹا معلوم ہوتا ہے- وجیہہ کا تو کہیں سے بھی نہیں لگتا-'' ان کی نظریں گل پر جمی ہوئی تھیں-

''آپ بھی تو بالکل پہلوان لگنے لگے ہیں-'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور بات منہ سے نکلتے ہی میں خود ہی سراسیمہ ہو گئی دراصل عرصے بعد انہیں دیکھا تھا- وہ کافی تندرست نظر آ رہے تھے- میری بات سن کر وہ گردن موڑ کر مجھے دیکھنے لگے- ایک تاریک سایہ ان کے چہرے پر آ کر گزر گیا- آنکھیں شکوہ کرنے لگیں- پھر اپنے جذبات پر قابو پا کر مسکرائے اور بولے-

''ہاں، یہ میرا بھی تو بیٹا ہے- ویسے نازی تم نے یہ دوڑ جیت لی-''

میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا- اسی وقت وجیہہ اندر آ گئے آپی اور آصف بھائی ادھر متوجہ ہو گئے- میری جان بچی-

''کچھ خاطر تواضع بھی کی تم نے؟'' وجیہہ مجھے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے- افوہ یہ چھوٹی

چھوٹی فروگزاشتیں شاید میں کبھی ان سے نجات پا سکوں- دراصل میں اتنی سراسیمہ اور پریشان تھی کہ ان کی خاطر کا تو خیال ہی نہیں آیا- وجیہہ کے سوال پر میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا-

''بھئی، ہم خاطر تواضع کے لیے نہیں، ملاقات کے لیے آئے تھے اور سب سے بڑھ کر گل کو دیکھ کر اس سے مل کر اس قدر خوشی ہو رہی ہے کہ کھانے پینے کا تو دھیان ہی نہیں آیا-'' آپی خلوص دل سے بولیں-'' پھر کسی دن سہی-''

''چائے پی کر تو گھر سے چلے تھے-'' آصف بھائی صفائی پیش کرنے لگے-''اور باتوں سے پیٹ بھر رہے ہیں-''

اچانک میری نظر استری کی میز پر ان نوٹوں پر گئی جو آصف بھائی نے گل کو دیے تھے- میں نے جلدی سے وہ نوٹ اٹھائے اور آصف بھائی کی جیب میں ڈال دیے-

''ہیں؟ ہیں؟ ہیں-'' کرتے ہوئے وہ پیچھے ہٹے- پھر نوٹ نکال کر بولے-''بھئی، گل کو دیے ہیں ہم نے- تم کو نہیں دیے- اور وہ قبول کر چکا- تم کون ہوتی ہو واپس کرنے والی-''

آپی بھی تیز تیز بولنے لگیں- وجیہہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں سمجھایا کہ ہم نے یہ سلسلہ رکھا ہی نہیں یہ تو ایک قسم کا قرض ہوتا ہے اور قرض مجھے پسند نہیں-'' آپی رونے اور قسمیں دینے لگیں وجیہہ نے نوٹوں میں سے ایک نوٹ نکال کر کہا-

''اچھا آپ لوگوں کی خوشی کی خاطر-''

آپی پھر بھی خفا ہونے لگیں مگر آصف بھائی خاموش رہے وجیہہ انہیں چھوڑنے باہر گئے تو مجھے خیال آیا کہ میں نے ان کا پتا تو لیا ہی نہیں- افوہ- خیر- وہ پھر آئیں گے- میں شکر کر رہی تھی کہ جس وقت آصف بھائی کو میں نے پہلوان کا خطاب دیا تھا وجیہہ نہیں آئے تھے- شاید انہیں یہ جملہ ناگوار ہوتا آپی نے بھی سن کر کچھ کہا نہیں- حالانکہ وہ تو آصف بھائی کے معاملے میں مجھ سے بہت شاکی تھیں- پتا نہیں کیسے میں انہیں یاد آ گئی- اور وہ بھول گئیں کہ اگر روشن آپا کی سیاست درمیان میں نہ ہوتی تو ان کے بجائے میں آصف بھائی کی بن گئی ہوتی- اور اس قصے کے درمیان وجیہہ کا وجود بھی تمام تر بلندی اور پھیلاؤ سمیت موجود تھا- کم از کم میری حد تک- جب ابا مجھے آصف بھائی کی کار سے اترتا دیکھ کر مجھے اندر لائے تھے میں نے وجیہہ کو جس حالت میں دیکھا تھا وہ صورت آج بھی میری آنکھوں میں نقش تھی اور اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو مجھ سے محبت کرنے لگے تھے- دوسرے انہیں اس الزام پر یقین بھی نہ تھا- سوئم انہیں میرے امتحان کی بھی بہت فکر تھی- انہیں معلوم تھا میں خود بھی بہت جذباتی ہو رہی تھی اس امتحان کے سلسلے میں-

اور اب- جب کہ میں ان کی بیوی تھی- وہ اپنے سوا میرا نام بھی کسی اور کے ساتھ لیا جانا پسند نہیں کر سکتے تھے- برداشت نہیں کر سکتے تھے- مجھے شبہ سا تھا کہ آصف بھائی کے سلسلے میں ان

کے دل پر اب بھی ہلکا سا غبار موجود تھا- چونکہ انہوں نے کبھی اشارتاً بھی مجھ سے صفائی طلب نہیں کی تھی شاید اس واقعے کو یکسر بھلا دینے، دل سے کھرچ دینے کی خاطر-

وجیہہ ان لوگوں کو رخصت کر کے اندر آئے اور گل سے باتیں کرنے لگے- صحن میں جاتے ہوئے رُک کر انہوں نے جیب سے آصف بھائی کا دیا ہوا نوٹ نکالا اور میری طرف پھینک کر باہر چلے گئے- نوٹ زمین پر پڑا تھا- اور میں اسے گھور رہی تھی- ایک خطرہ سا سر ابھار رہا تھا- اگر آپی نے یہ نوٹ دیا ہوتا تو شاید انہیں خیال نہ آتا- لگتا ہے انہیں یہ لین دین پسند نہیں آیا- میں نے بھی حماقت میں آصف بھائی کی جیب میں ڈال کر بات ظاہر کر دی کہ انہی نے دیے تھے وہ نوٹ آپی کو واپس کرتی تو انہیں شبہ بھی نہ ہوتا کہ کس نے دیے تھے- ہائے میری کم عقلی-

رات کو کھانا کھا کے سر اٹھا کر انہوں نے مجھ سے کہا''تم نے اتنے بہت سے نوٹ ان سے لے کر کیوں رکھ لیے تھے لینا نہیں تھے تو اسی وقت واپس کر دیتیں- مجھے دکھا کر واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی-''

''کچھ نہیں-'' میں پست آواز میں بولی- ٹھنڈی لہری رگوں میں دوڑنے لگی تھی-''میں نے پہلے بھی انہیں روکا تھا کہ میں وجیہہ سے پوچھے بغیر نہیں لے سکتی- مگر وہ مانے ہی نہیں-''

ہاتھ میں لیے لقمے کو وجیہہ نے پلیٹ میں پٹخ دیا- ان کا لہجہ ایک دم بدل گیا-''مطلب؟ انہوں نے تم کو دیے تھے تم ہی لینے نہ لینے کی مجاز تھیں- میرا نام لے کر تم نے ان پر ظاہر کیا گویا میں نے تم پر پابندیاں لگائی ہوئی ہیں-''

میں بوکھلا کر صفائی دینے لگی-''میں تو بہت انکار-''

''یا شاید تم نے اتنے بہت سے نوٹ نہیں دیکھے-'' وہ روانی میں بولے جا رہے تھے-''میں بہت کم پیسے تم کو دیتا ہوں اسی لیے- کم کماتا ہوں نا- اس لیے تم نے مجھے دکھانا چاہا تھا-''

''نہیں- نہیں-'' میں بلند آواز سے چلانے لگی-

تم ہی لینے نہ لینے کی مجاز تھیں- میرا نام لے کر ان پر ظاہر کیا' گویا میں نے تم پر پابندیاں لگائی ہوئی ہیں-'' میں بوکھلا کر صفائی دینے لگی-''نے تو بہت انکار-''

''شاید تم نے اتنے بہت سارے نوٹ نہیں دیکھے-'' وہ روانی میں بولے جا رہے تھے-''میں بہت کم پیسے تم کو دیتا ہوں

''نہیں- نہیں-'' میں بلند آواز سے چلانے لگی-

''چپ رہو اور یاد رکھو- میں ایسی چھچھوری حرکتیں کرنا پسند نہیں کرتا- اپنے رشتہ داروں سے تم خود نپٹ لیا کرو- مجھے آئندہ کسی معاملے میں ملوث نہ کرنا- غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے-''

میرے جسم سے روح کھنچ رہی تھی- خون سرد ہوتا جا رہا تھا- پہلی بار وجیہہ کے اس اجنبی لہجے سے

واسطہ پڑا- میرا دل اندر سے زخمی ہو گیا تھا- اور اس میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں- ایک گرم الاؤ دہک رہا تھا جس کی تپش میرے ہاتھ پیر جلائے دیتی تھی- سینے کی بھڑکتی آگ کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرنے لگی- کچھ دیر بعد وہ اندر آ گئے- کچھ شرمندہ اور خجل- میرے پاس بیٹھ کر نرمی سے مجھے چھوا-

''برا مان گئیں- نازی! میں اتنا چاہتا ہوں کہ تم میں خود اعتمادی پیدا ہو- خود ہی فیصلے کیا کرو- میرے اشارے کی منتظر نہ رہو-''

میں آنسو پونچھ کر خفگی سے بولی ''پہلی بار میرے رشتے دار آئے تھے- آپ اس کا طعنہ دینا نہیں بھولے- کیا میں آپی سے لڑتی جھگڑتی- جب آپ خوش ہوتے میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں کسی سے نہ ملوں- اب آئیں گے تو منع کر دوں گی-''

میری آواز بھاری ہونے لگی- انہوں نے سختی سے میرا بازو پکڑ کر گھما ڈالا اور سختی سے بولے-

''بکواس بند- میرا یہ مطلب تو نہیں تھا- آنسو پونچھ لو- آئندہ میں تم کو روتا ہوا نہ دیکھوں- بزدلی کی نشانی- میں تم کو بہادر دیکھنا چاہتا ہوں- حالات سے لڑنا اور وقت سے نظریں ملا کر مقابلہ کرنا سیکھو- آنسو بہا کر تو انائی ضائع مت کرو-''

میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں آنسو تشک کیے مگر رگوں میں دوڑنے والی ٹھنڈک سینے کی جلن کو نہ مٹا سکی- ایک خوف مجھ پر محیط ہونے لگا-

''تم نے ان کو چائے تک نہیں پلائی- کیا سوچتے ہوں گے آصف- میرا خیال ہے ہم ان کی دعوت کر ڈالیں-'' کئی دن بعد انہوں نے ذکر چھیڑا-

میں گل کو کپڑے پہنا رہی تھی- رک کر بولی- ''نہیں کوئی ضرورت نہیں-''

''تمہاری مرضی-'' انہوں نے شانے اچکائے-

دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ آپی کی آمد و رفت بڑھے اور کسی بھی معاملے میں وجیہہ کو شکایت کا موقع ملے- میں اپنی کمزوریوں سے کافی خوفزدہ تھی اور وجیہہ کی محبت سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی کہ یہ سزا شاید میری جان ہی نہ لے لے- کئی دن گزر گئے- نہ آپی آئیں اور نہ وجیہہ نے ہی کوئی ذکر کیا-

☆☆

اس دن وجیہہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے- موقع غنیمت جان کر میں کمرہ اور صحن دھونے لگی- گھٹنوں تک شلوار چڑھائے کمرے کے بعد اب صحن میں آ گئی تھی- گل کو بے بی لے گئی تھی کیونکہ اسے پانی سے کھیلنے کا بہت شوق تھا اور میرے کام میں حارج ہوتا تھا- محویت کے عالم میں پانی کی دھارا اپنے ننگے پیروں پر ڈالتے ہوئے فرش چمکانے سے زیادہ پیر چمکانے کی کوشش میں غلطاں میں گنگنا رہی تھی-

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجناں
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا- ساحلوں کی-''

دروازہ کھلنے کی آواز آئی- وجیہہ کی توقع میں مڑ کر دیکھا اور پائپ میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا- آصف بھائی اندر آ گئے تھے- میں بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی- کسی کی مدد کی توقع میں- میرا چہرہ تپ گیا تھا اور خون کے بہاؤ میں سنسناہٹ کی آواز بھی سن سکتی تھی- دوپٹہ- میرا دوپٹہ جانے کہاں تھا- میں سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگی ہوئی تھی- جلدی جلدی شلوار کے پائنچے گھٹنے سے کھینچ کر نیچے کرنے لگی-

''اس وقت کیمرہ میرے پاس ہوتا- تو میں تمہاری ایک تصویر ضرور لیتا-'' وہ عین میری آنکھوں کے سامنے میرا دوپٹہ لہرا رہے تھے- میں نے لپک کر ان سے دوپٹہ جھپٹا-

''یہ ایک عورت کا نہایت دلکش روپ ہے- بخدا- تصویر اس روپ کو صحیح اجاگر نہ کر پاتی- جو کچھ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں- نہایت خوبصورت منظر-''

گیلے فرش پر سفید کبوتر جیسے پیر رکھتی میں کمرے میں چلی گئی بھیگ بھیگ کر پیر کپڑے جیسے سفید ہو چکے تھے- چپل پیروں میں ڈالتے ہوئے میں انہیں اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی مگر وہ باہر سے ہی کہہ رہے تھے-

''جلدی میں ہوں- ادھر کام سے آیا تھا- سوچا وجیہہ سے ملاقات کر لوں- اچھا چلتا ہوں-''

''آ..... آپی نہیں آئیں-''

''نہیں- انہیں میرے یہاں آنے کی اطلاع بھی نہیں ہے اور یہ اطلاع کچھ ضروری بھی نہیں- اچھا خدا حافظ- وجیہہ کو بتا دینا- اور ہاں یہ قرض-'' انہوں نے ایک ڈبہ آگے بڑھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا- اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر چلے گئے- میں پوچھ بھی نہ سکی- کہ کیا ہے- ایسی بوکھلاہٹ تھی میں-

ڈبہ کھولا- سیل سے چلنے والی ٹرین گل کے لیے تھی- پتا نہیں وجیہہ دیکھ کر کیا کہیں گے- کہیں ان کو اعتراض نہ ہو گل بہت چھوٹا تھا- مگر اس قسم کے حرکت کرنے والے کھلونوں سے بہت خوش ہوتا تھا- میں کئی بار اس کے لیے یہ ٹرین لانے کا سوچ چکی تھی- مگر اس کی قیمت دیکھ کر دل پر جبر کر کے رہ جاتی آج وہی ٹرین پا کر میں بے اختیار مسکرا دی- خوشی سے ایک آواز نکال کر میں گل کو پکارنے لگی-

اچانک میں ڈر گئی- خوشی مجھے راس نہیں آتی- آپی سے مل کر خوش ہوئی تھی- تو اسی دن وجیہہ کے

سخت رویے نے ساری خوشی کو مٹا دیا- پہلے بھی جب کوئی خوشی ملتی اس کے ساتھ غم بھی ملتے رہے- آپی کی شادی کی کتنی خوشی تھی مجھے- کیسی چاہت تھی مگران کی شادی کی رسم میں شریک نہ ہوسکی- سارا وقت آنسو بہاتی رہی- پھر وجیہہ کی محبت ملی تو اماں ابا کی جدائی کا دکھ ساتھ ساتھ ملا- گل کی پیدائش پہ اماں چل بسیں- وجیہہ کی ترقی ہوئی ان کو اچھی ملازمت ملی تو روشن آپا دوسرے ملک سدھاریں- کوئی میری خوشی کو سراہنے والا ہی نہیں ہے- اب ..... اب اور کسی نئی خوشی کی میں منتظر نہ تھی- طلبگار نہ تھی- بس جیسی گزر رہی ہے بہت اچھی ہے- کہیں کسی خوشی کو پانے کے بعد وجیہہ کی محبت نہ کھو دوں- یہ وہم جڑ پکڑتا جا رہا تھا-

گل کی دوسری سال گرہ بھی ہم نے تفریح گاہ میں جا کر منائی پیشتر کہ طرح یتیم خانے میں کچھ رقم ادا کی- پھر سیر کرتے رہے ہوٹل میں کھانا کھایا- بے بی آج بھی ساتھ تھی اور آج میں نے زبردستی اس کی ماں کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کیا تھا- ہمارے ساتھ وہ بہت خوش تھیں- آپی کئی بار آئیں- ہر بار مجھے شدومد سے اپنے گھر بلاتیں- مگر آصف بھائی نے کبھی نہیں کہا کہ ہمارے گھر آنا- وہ کاروباری آدمی تھے- مگر ساتھ ہی ملازمت بھی کر رہے تھے- ایک فرم میں بہت بڑے عہدے پر تھے- آپی کو بہت فخر تھا- اور ہونا بھی چاہیے-

ایک روز آئیں تو گل کی تاریخ پیدائش کا ذکر ہوا- وہ اچھل پڑیں اور غصے کا اظہار کرنے لگیں کہ تاریخ گزر گئی اور ان کو میں نے بتایا تک نہیں- میں نے ان کو وجیہہ کے نقطہ نظر سے مطلع کیا- کہ وہ اپنی بیٹے کی خوشی سادگی سے اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں- فل نمائش انہیں پسند نہیں- آپی بگڑ گئیں-

''اچھا- تم اپنا نقطہ نظر اپنے پاس رکھو- میں کل ہی گل کی سالگرہ اپنے گھر پر کروں گی- اور تم کو آنا پڑے گا- میں تو کب سے منتظر تھی کہ تم پارٹی کرو گی- تو مجھے بلاؤ گی-''

وجیہہ کچھ ٹال مٹول کرنے لگے- ''ارے فوزیہ! اب تو وقت گزر گیا- چھوڑو- اگلے سال سہی-''

آپی آبدیدہ ہوگئیں- بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کرنے لگیں-

''تم مجھے غیر سمجھتے ہو- جتانا چاہتے ہو کہ مجھے گل کی خوشی منانے کا حق نہیں ..... اگر میرے پاس بھی کوئی گل ہوتا تو میں تم سے اس خوشی کی بھیک نہ مانگتی-''

وجیہہ ان کے جذبات سے متاثر ہو گئے- شرکت کا وعدہ بھی کر لیا- میں نے آپی سے پوچھا- "آپی! ہم گل کی سالگرہ کے لیے کون سا تحفہ لے کر آئیں؟''

وہ بہت شادمان تھیں- ہنس کر کہا ''تم گل کو لاؤ گی- اور وہی سب سے بڑی خوشی ہوگی- میرے لیے- وہی تمہارا تحفہ-''

وجیہہ خلاف معمول چپ چپ تھے- اگلے دن سہ پہر کو آصف بھائی آ گئے- وجیہہ نے کہا-

''میرے پاس موٹر سائیکل تو ہے- ہم آ جاتے- آپ نے کیوں تکلیف کی؟''

آصف بھائی کہنے لگے- ''بھئی فوزیہ نے کہا ہے کہ تمہارا کوئی ملنے والا یا پڑوسی بھی اگر تم انہیں لانا چاہو تو ضرور لانا اور وہ تمہاری ہمزاد-'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئے-

''بے بی بڑھی بھی تو ہے اسے بھی لانا- گل کی خالہ سے زیادہ تو وہ گل سے مانوس ہے-''

آصف بھائی گھنٹہ بھر بعد آنے کا کہہ کر کسی کام سے چلے گئے- میں نے بے بی کو جا کر بتایا- اور اس کی اماں کو پھر رضامند کیا- میری آپی نے گل کی سالگرہ کا فنکشن کیا تھا- میں بہت خوش تھی- اور کسی پڑوسی کو تو معین وقت پر مدعو نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے بے بی اور اس کی اماں کی خوشامد کرتی رہی- ان کی رضامندی کے بعد گھر آ کر جلدی جلدی خود تیار ہوئی-

وجیہہ نے کچھ دن پہلے ایک قوس وقزح کے رنگ کی ساڑھی مجھے لا کر دی تھی- بہت خوش رنگ اور نفیس تھی- میں ایک دفعہ اسے پہن کر ان کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی تو انہوں نے کہا-

''یہ پہن کر باہر نہ نکلو- مجھے ڈر ہے تمہیں نظر نہ لگ جائے- میں نے دیکھ لیا ہے- یہ کافی ہے-''

مجھے وہ ساڑھی بہت پسند اور عزیز تھی- اس سے بہتر کوئی اور کپڑا تھا ہی نہیں- میں نے وہی پہن لی- گل کو بھی نئے کپڑے پہنائے- آصف بھائی کی کار کا ہارن سنائی دیا تو ہم سب تیار تھے- میں پہلی بار آپی کے گھر جا رہی تھی- اضطراب اور مسرت کا ملا جلا تاثر شاید میرے چہرے سے ہویدا تھا- وجیہہ مجھے بار بار گھورنے لگتے- شاید میں اوٹ پٹانگ حرکت کر جاتی تھی-

آپی کا گھر تھا کہ محل- بڑا سا ہال جہاں ہر سمت نظروں کو خیرہ کرنیوالے بلب روشن تھے- جھاڑ فانوس بھی آب وتاب سے جگمگا رہا تھا- شاندار فرنیچر، اعلیٰ درجے کے ڈیکوریشن پیس- جانے کیا کچھ تھا- زینے پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا- پورا ہال ایک رنگ کے قالین سے بھرا بھرا لگ رہا تھا- آپی نے سارا گھر ہمیں دکھایا- ہر کمرہ سجا بنا- اتنے ہی قیمتی ساز وسامان سے آراستہ- اپنے کمرے میں جا کر آپی نے کہا-

''دیکھ نازی! میرے گھر کے فنکشن میں آئی ہے نا تو میری بات ماننا ہوگی میں نے تیرے لیے ایک ساڑھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے- تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا کہ میری شادی پر جوڑا لے گی تو بس یہی سمجھ لے کہ میں اپنا وعدہ پورا کر رہی ہوں-''

وجیہہ اور آصف کی موجودگی میں انہوں نے ایک جھلملاتی سرخ رنگ کی ساڑھی نکالی جس کے چپے چپے پر سنہری تاروں کا جال تھا اور جس کے درمیان میں ننھے ننھے ستارے جگمگا رہے تھے- اس کی خیرہ کن چمک سے میری آنکھیں جھپک گئیں-

''جاؤ- باتھ روم جا کر ساڑھی پہن آؤ- اس کے میچ کے زیور بھی پہناؤں گی میں- میں نے تجھے دلہن بنے دیکھا ہی نہیں- اپنا شوق پورا کروں گی-''

ان کے آخری جملے کے ساتھ ہی مجھے شادی کا وہ دن یاد آ گیا جب میں دلہن بنی برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھی- اور وہ اپنے پیارے ماں باپ اور بہنوں کے جلو میں دعائیں اور پیار سمیٹتی ہوئی رخصت ہو گئی تھیں- پرانا زخم کھرچنے سے ٹیس تو اٹھتی ہی ہے-

میں اب ضبط کرنا سیکھ گئی تھی- چہرے پر ملال کی سرخی ضرور جھلکی ہو گی مگر حوصلے کے ساتھ اسے مسکراہٹ میں چھپا کر میں نے کہا ''ارے آپی کمال کرتی ہو بھلا اس طرح کے کپڑے پہنتی کیا اچھی لگوں گی- گل.... تو ستارے نوچ کر کھالے گا- یہ تو تم پر ہی جچے گی- میں تو ایسے ہی ٹھیک ہوں''

''کیوں- بوڑھی تو نہیں ہو گئی- جو دل پر جبر کرنا سیکھ گئی اچھا- میں دوسری ساڑھی نکالتی ہوں- بنارسی- دیکھ نازی تجھے میری بات ماننا ہو گی-''

وہ وجیہہ اور آصف سے مخاطب ہوئیں کہ وہی مجھے سمجھائیں- آصف بھائی سگریٹ سلگانے لگے- وجیہہ نے شانے اچکا کر کہا ''یہ آپ بہنوں کا مسئلہ ہے-''

وہ پھر میری جانب متوجہ ہوئیں- میں نے آپی کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشامدانہ لہجے میں کہا-

''سچ آپی! تم نے دی- میں نے لے لی- مگر جب میں ایسے کپڑے پہنتی ہی نہیں تو اسے کیڑا لگانے کے لیے گھر لے جانے کا فائدہ؟ اور یہ ساڑھی جو آج میں نے پہنی ہے نا- یہ مجھے بہت پسند ہے- میں خاص طور پر پہن کر آئی ہوں-''

''تمہارے پاس کوئی قیمتی شوخ قسم کی ساڑھی نہیں تھی میں چاہتی تھی اپنے ملنے والوں کو تم سے ملاؤں تو ان پر تمہارا رعب پڑے-''

''شخصیت کا رعب لباس کا مرہون منت نہیں-'' آصف بھائی نے دھیرے سے کہا-

''دراصل آپی!'' میں نے انہیں چین پہ جبیں ہوتے دیکھ کر لجاجت سے کہا- ''یہ ساڑھی وجیہہ کا تحفہ ہے اس لیے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے- بس یہی بات ہے-''

آپی ست ہو کر پیچھے ہٹ گئیں- آصف بھائی کے لمبے سانس کی آواز میں نے سنی- وجیہہ اور وہ باتیں کرنے لگے- آپی نے عنابی کام دار ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور تراشیدہ بال اچھے لگ رہے تھے- ان کی ملنے والیاں انہی جیسے بھڑک دار لباس اور زیورات سے مزین شرکت کے لیے آئیں-

پارٹی شروع ہو گئی تھی- خواتین تیز میک اپ اور بناوٹی قہقہوں سے محفل کو گرما رہی تھیں- کافی مہمان جمع ہو چکے تھے- اور آپی سب سے بے حد تکلفی سے پیش آ رہی تھیں- وہ اس رنگ و نور کی محفل میں مجھے اپنی بہن کو فراموش کر چکی تھیں- نیم عریاں لباس والی خواتین جن کے چہروں پر میک اپ کی بھرمار نے ان کا اصلی روپ بھی چھین لیا تھا اور ان کے مینکتے وجود لنشین قہقہے جو ہر اسر بناوٹی اور مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے بلند کیے جا رہے تھے اور جن کی گفتگو اعلیٰ درجے کے قیمتی

لباس زیور، موتی اور نئے فیشن پر محیط تھی- میں ان سب کے درمیاں ایک مدھم ستارے کی طرح اپنی روشنی کھو چکی تھی- جو کہکشاں کے قریب ہو کر بھی اس کی چمک سے کچھ حاصل نہیں کر پاتا- وہ سب روشن ستارے تھے- میں ذرہ- اسی لیے آپی اور ان کی مہمان خواتین مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی دلچسپیوں میں مگن تھیں بے بی اور خالہ جی ایک کونے کی کرسی پر سمٹی بیٹھی تھیں- مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ دعوت، یہ محفل محض مجھ پر رعب ڈالنے یا دکھانے کے لیے منعقد کی گئی ہے- گل جس کے اعزاز میں یہ ہنگامہ کیا گیا تھا وہ ایک صوفے پر سو گیا تھا اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا-

باوردی بیرے کھانے کی مختلف اقسام ٹرے اور ٹرالیوں میں لے کر مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے- کھانا تمام ایک بڑے ہوٹل سے منگوایا گیا تھا اور تمام مہمان تعریف کر رہے تھے- مرد حضرات زیادہ تر وجیہہ اور آصف بھائی کے ہمراہ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے- کھانے کے بعد ایک لڑکے اور فیشن ایبل لڑکی نے ڈانس بھی کیا- آصف بھائی کا کیمرہ سب کی تصویریں لے رہا تھا- انہوں نے وجیہہ اور گل کی میرے ساتھ ایک تصویر اتاری- پھر وجیہہ دوسری طرف چلے گئے- میں الگ تھلگ ایک صوفے پر جا بیٹھی- کیمرے کا فلیش بار بار چمک رہا تھا اور اچانک مجھے احساس ہوا کیمرہ مسلسل میری جانب تھا اور مسلسل تصویریں لے رہا تھا-

تب میں نے آپی کی آنکھوں میں نفرت کی چمک اور چہرے پر غصے کی سرخی دیکھی- میں بے حد خوفزدہ ہو گئی- آپی خواہ مخواہ بیروں کو برا بھلا کہنے لگیں- مہمان رخصت ہو گئے تو وجیہہ نے ضروری کام کا بہانہ بنا کر کہا کہ میرا انتظار نہ کرنا- تم لوگ چلی جانا- میں رات دیر سے آؤں گا-

ان کے جاتے ہی آپی کے سر میں سخت درد ہونے لگا- وہ کنپٹی دباتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں- خالہ جی کے بھائی یہاں سے بہت قریب رہتے تھے- بے بی نے کہا کہ لگے ہاتھوں وہ دونوں وہاں جانا چاہتی ہیں- اصل میں بے بی کے رشتے کی بات انہی کے ذریعے ہو رہی تھی اور خالہ جی معلومات کے لیے بھائی کے پاس جانا چاہتی تھیں- وہ چلی گئیں اور میں بالکل تنہا رہ گئی- دور کونے میں ایک نقشین میز پر آصف بھائی بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے-

''آپی کہاں گئیں..... میں اب چلوں-'' میں نے جانے کے مخاطب کیا تھا-

''ان کے سر میں درد ہے-'' آصف بھائی وہیں سے بولے 'ہر پارٹی کے بعد ان کو درد کی شکایت ہو ہو جاتی ہے- کمرہ بند کر کے لیٹی رہتی ہیں- دراصل ہر بار انہیں میرے رویے سے تکلیف پہنچتی ہے- کتنا بھی کوشش کروں- کوئی نہ کوئی بات انہیں ضرور ناگوار ہوتی ہے-''

میں ان کے اس شکوے پر، اعتراف پر حیران بھی ہوئی پریشان بھی-

''گھبراؤ نہیں- میں تم کو چھوڑ آؤں گا-'' انہوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی-

آپی کا کمرہ کھلوا کر ان سے مل کر نیچے آئی۔ آصف بھائی گل کو گود میں لیے کھڑے تھے۔ باہر آ کر آنہوں نے کار کا دروازہ کھولا۔ میں بیٹھ گئی تو میری گود میں دے کر اسٹیرنگ کی طرف چلے گئے۔

''تم نے جب آپی کی اس قدر تعریفیں کی تھیں۔'' وہ کار چلاتے ہوئے فوراً ہی بولنے لگے۔ ''تو یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ حد سے زیادہ مغرور، جاہ پرست اور حاسد بھی ہیں۔''

''نہیں نہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا ''یہ غلط ہے۔''

''میں تین سال سے ان کے ساتھ رہ رہا ہوں۔'' وہ تلخی سے ہنسے۔ ''وہ حد سے زیادہ شیخی خوری اور نمائش زندگی کی خواہاں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بے حد خود پسند اور آزاد روش کی مالک بھی ہیں۔''

''شاید آپ کے ساتھ رہ کر ہو گئی ہوں گی۔'' میں نے ہنس کر بات ٹالنی چاہی۔ ''پہلے ایسی نہیں تھیں۔''

آصف بھائی نے کار کی رفتار دھیمی کر دی۔ مڑ کر مجھے دیکھا۔ ''مجھے دولت کی بے جا نمائش اور شیخی پسند نہیں۔ یہ چھچھورا پن ہے۔ خصوصاً تمہارے معاملے میں۔''

میں چونکی ''میرا معاملہ کون سا؟''

''آج کی یہ دعوت محض تمہیں مرعوب کرنا تھا۔ اپنی دولت اور شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے گل کی نام پر انہوں نے تمہیں نیچا دکھانا چاہا تھا۔'' وہ قدرے مسکرائے ''مگر مجھے خوشی ہے کہ تم ان سے مرعوب نہیں ہوئیں۔ ان بڑے بڑے مہمانوں کے تفصیلی تعارف تم نے شاید سنے ہی نہیں جن کی دوستی پر وہ بہت خوش ہیں اور اکثر مجھے بھی مرعوب دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''مرعوب ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے آصف بھائی۔'' میں نے گل کو دوسرے ہاتھ پر بدلتے ہوئے کہا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا اور اس کے سر کی گرمی سے میرا ہاتھ بھیگ گیا تھا۔

''میں اپنی جگہ۔ اپنے گھر میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں پھر کس چیز سے مرعوب ہو سکتی ہوں۔ رہی دولت کی بات تو ابھی تو مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں میری دولت میرا غرور میرا بیٹا جو ہے۔'' سامنے آنے والی گاڑی کی روشنی آصف بھائی کے چہرے پر پڑی وہ بے ساختگی سے مسکرا رہے تھے۔

''اچھا۔ تم کو احساس ہے کہ ایک دولت کے معاملے میں تم کو برتری حاصل ہے۔''

''ارے۔ نہیں توبہ توبہ۔ میرا یہ مطلب نہیں۔'' یہ آصف بھائی میری سادگی کو کہاں لے گئے۔

''اور۔ انہوں نے میری طرف جھک کر قدرے شوخی سے کہا'' تمہیں اپنی اس محبت کی دولت کا احساس ہی نہیں جو وجیہہ نے تمہیں دی ہے۔ سچ وہ تو بہت اناڑی ہے۔ اپنی اس محبت کو چھپا ہی نہیں سکا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں شرما گئی ''کیا آپ آپی سے محبت نہیں کرتے؟''

''اور مجھے کتنی خوشی ہوئی جب تم نے ان کی عطا اس بخشش کو ٹھکرا دیا۔ جو اپنی سخاوت اور دولت کے اظہار کے طور پر وہ تمہیں عنایت کرنا چاہتی تھیں۔'' وہ میری بات سنے بغیر اپنی دھن میں بولے جا رہے تھے اور وجیہہ کے تحفے کی قدر دانی کے اظہار نے تو جہاں فوزیہ کو اس قدر مایوس کیا میں اتنا ہی مطمئن اور مسرور ہو گیا۔'' میں چپ ہو گئی۔ کچھ دیر وہ بھی خاموش رہے۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر کہنے لگے۔ ''سچ بتانا نازی۔ تم دونوں بہنوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟''

میں نے ہنس کر کہا ''ارے آپ کو کیا پتا میں کتنی بری ہوں۔ بدتمیز، ضدی اور گستاخ۔ آپی نے بتایا تو ہو گا۔ وہاں گھر میں سب مجھ سے نالاں رہتے تھے۔''

''بتایا ہے مگر اس دن تم نے مجھ سے اپنی بہن کی جتنی تعریفیں کی تھیں، جیسے وہ انسان نہیں کوئی مافوق الفطرت ہیں، وہ سب تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں تمہاری تلاش میں تھا کہ کبھی ملو گی تو پوچھوں گا۔ تم نے میرے ساتھ ایسی دشمنی کیوں کی؟ میں نے تمہیں دیکھا تھا اور پسند کیا تھا مگر تم نے اپنی بہن میرے سر منڈھ دی۔ نازی۔ میرا کیا جرم تھا جس کی یہ سزا مجھے دی گئی۔''

میں ہیجان میں مبتلا ہو گئی۔ نروس ہو گئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ غالباً آپی نے انہیں بہت تنگ کیا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ سے تھے۔ ''میں نے تم پر رحم کھا کر..... تمہیں الزامات سے بری کرنے کے لیے خود ہی اپنے لیے صلیب کی موت منتخب کر لی اور اب لحہ لحہ مجھے ان کیلوں سے سابقہ پڑتا ہے جو میرے وجود میں اتاری جاتی ہیں۔ ذہنی اختلافات نظریاتی غیر مطابقت کی کیلیں۔

میں اپنی اس غلطی کا کفارہ بھی ادا نہ کر پاؤں گا۔ جس مقصد کے لیے، ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنی زندگی قربان کی تھی وہ بھی تو..... حل نہ ہوا..... تم پھر اپنے والدین سے نہیں ملیں۔ کیوں؟ الزام کی صفائی تو ہو چکی تھی۔ غلط فہمی تو رفع کر دی تھی میں نے۔''

ایک موڑ آیا۔ گاڑی لہرائی۔ بے اختیار میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اور منہ سے نکلا۔ ''دیکھ کر۔''

وہ تلخ لہجے میں بولے۔

''ڈرو مت۔ مجھے تمہاری قیمتی جان اور گل کی زندگی کی بہت قدر ہے۔ تم مجھے کسی ایک بات کا جواب تو دے دو۔ میرے دل میں طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ کسی بات کا کسی ایک سوال کا جواب شاید اس طوفان کی شدت میں کمی ہو جائے۔'' وہ بے حد تلخی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے میں ہونٹ چبانے لگی۔

''کس سوال کا جواب دوں؟''

''اچھا۔ صرف اتنا بتا دو۔ دونوں بہنوں میں اتنا فرق کس لیے؟''

''شاید وہی بدل گئی ہیں-اور ممکن ہے اتنی دولت شان شوکت اور ایسی ہنگامہ پرور زندگی مجھے ملتی-تو میں بھی بدل جاتی-'' بالآخر میں نے جواب دے ہی دیا-انہوں نے بیتابی سے بریک پر پیر جما دیے-کار سڑک کے درمیان رک گئی-وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگے-میں نے سر ہلا کر انہیں یقین دلانا چاہا-

''ایسا ممکن تو ہے آصف بھائی-انسانی فطرت کو بدلتے دیر نہیں لگتی-نفرت محبت میں اور محبت دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے-سنا ہے-''

انہوں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دھیمے اور اداس لہجے میں کہا-''اگر تم کو کہیں سے بہت سی بے شمار دولت حاصل ہو جائے تم اس کو پا کر اتنی مغرور ہو سکتی ہو کہ اپنے سامنے کسی دوسرے کی پروا ہی نہ کرو-صرف ذاتی راحت کا سامان کرو وجیہہ کو نظر انداز کر کے-اس کی خواہشوں کو ٹھکرا کر-اپنی محرومیوں کی تلافی اور اپنی آسودگی کو مدنظر رکھو گی-کیا تم-وجیہہ کو ہلاک کر دو گی؟ گل کو قتل کر دو گی؟ صرف اپنی تسکین کے لیے-خواہش کے لیے-''

میں چیخ پڑی-ناقابل برداشت دورنے میری آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں-

''روکیے-گاڑی روک دیجیے-''

''میں پیدل چلی جاؤں گی-'' آنسوؤں نے ایک پردہ تان دیا-

وہ ہنسنے لگے-''حقیقت سننے میں بھلی نہیں لگتی-اگر میں تم کو بتاؤں-تمہاری بہن نے محض امریکہ جانے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے-امریکہ کی سیر کے شوق میں اپنے بچے کو قتل کر دیا پیدا ہونے سے پہلے مار دیا-سنا تم نے..... میرے منع کرنے کے باوجود دوبارہ بنی امریکہ لے جانے کے وعدے اور قسمیں کھانے کے باوجود انہیں میری بات پر یقین نہ آیا اور انہوں نے دوا کھا کر اس کا خاتمہ کر دیا-امریکہ کی سیر ان کا ایک خواب تھا اس خواب کی تعبیر نے اس بچے کو-میرے اس گل کو ہی ہلاک نہیں کیا مجھے بھی مار ڈالا-کیونکہ وہ خود اس حادثے میں بال بال بچیں اور ڈاکٹر نے پہلے متنبہ کر ہی دیا تھا-پھر بھی اپنے ہاتھوں یہ قتل کر کے وہ خود قدرت کی سزا سے نہ بچ سکیں-اب-اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکتیں-سنا تم نے؟''

میں ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی ان کی بات سن رہی تھی-جانے کب ہونٹ چپڑاڑ اٹھے اور ضبط گریہ کے باعث تسلی کا..... دلاسے کا ایک حرف نہ بول سکی-میرا گھر آ گیا تھا آصف بھائی سیٹ پر بیٹھے رہے-انہوں نے مجھے گل سمیت اترنے میں ذرا بھی مدد نہ کی-بمشکل دروازہ کھول کر میں نیچے اتری تو وہ بڑبڑائے-

''میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گا-'' اور زن سے گاڑی بڑھا لے گئے-رات کی تاریکی میں گل کو گود میں سمیٹے میں حیران پریشان گلی میں کھڑی رہی-

وجیہہ رات کو دیر سے گھر آئے-خاموش خاموش تھے-میرے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے-اتنی ذہنی چوٹیں کھا چکی تھی کہ اب کسی پریشانی کے لیے تیار نہ تھی-بے نیازی دکھانے کا موقع نہ تھا-میں بھی جذباتی طور پر تنہا اور تھکی ہوئی تھی سہارا چاہتی تھی-میں نے انہیں مخاطب کرنے کے لیے ان کے سر میں ٹکریں ماریں-وہ ساکت وصامت بیٹھے رہے-دل دکھ گیا-رونا آنے لگا-میں رونے لگی-

''کیا بات ہے؟ روکس لیے رہی ہو؟ آج تو تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے-'' وہ سپاٹ لہجے میں بولے-میں زور زور سے رونے اور ان کی گردن میں سر گھسانے کی کوشش کر رہی تھی-

''کیا ہے؟'' وہ بیزاری سے بولے''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اب آیندہ تم نہیں رو گی-''

ان کا لہجہ بے حد سخت تھا-میں خوف سے سن ہو گئی-

''میں-میں آیندہ آپ کے گھر نہیں جاؤں گی-''

وجیہہ کا رویہ بدل گیا-بایاں ہاتھ میرے بالوں میں گھسا کر بولے''کیوں بھئی-اس قدر شاندار گھر ہے-کتنی دولت مند بہن ہے تمہاری-اس سے فائدہ حاصل نہیں کرو گی-''

''ہونہہ-آپ کو کیا پتا-'' میں نے چڑ کر کہا-''انہیں اپنی دولت ہی مہنگی پڑی ہے-جو عورت اپنے بچے کو قتل کر دے شوہر کا حکم نہ مانے-اسے ..... اسے دولت سے نقصان پہنچتا ہے نا-''

وہ سناٹے میں آ گئے-''تمہیں کس نے بتایا؟''

''آصف بھائی نے آتے ہوئے-وہ بہت دکھی تھے-''

''کون خوش ہو سکتا ہے-'' وجیہہ نے دھیرے دھیرے میرے بالوں میں انگلیاں پروتے ہوئے کہا-''مجھے تو یہ بات پہلے سے معلوم ہے-جب گل پیدا ہوا ہے تمہاری اماں اسی سلسلے میں فوزیہ کے پاس گئی تھیں-اس نے کچھ کھا لیا تھا-بچہ پیٹ میں مر گیا تو زہر پھیل گیا-کسی طرح جان بچ گئی-اس کے بعد ٹھیک ہونے بھی نہ پائی تھی کہ امریکہ چلی گئی-حالانکہ سفر کے لیے ڈاکٹر نے منع کیا تھا-''

''آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں-کیوں؟''

''میں ہر بات تم کو نہیں بتاتا-''

''میں بے وقوف ہوں-اس لیے.....؟''

''تمہارا دل کمزور ہے اس لیے-'' وجیہہ نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا-میرا دل سکون سے بھر گیا-

''ارے-اے ہوش میں رہو-'' ان کے لہجے میں محبت کی شانتی تھی-پیار کی سوغات نے مجھے نہال کر دیا-

''فوزیہ کی دی ہوئی قیمتی ساڑھی تم نے نچے دل سے واپس کی تھی یا محض مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے۔دل میں تو خواہشوں کے سمندر ابل رہے ہوں گے کہ کس طرح فوراً اس کو پہن ڈالو۔ ہیں.....؟''

''میں ایسی تو نہیں ہوں۔'' میں نے بچوں جیسی معصومیت سے کہا۔''وہ دس ساڑھیاں اس سے بھی قیمتی دیتیں۔تب بھی میں آپ کی لائی ہوئی ساڑھی تو کبھی نہ اتارتی۔اسے اتار کر دوسری کبھی نہ پہنتی۔ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔آیا سمجھ میں؟''

''سچ.....!'' وہ چہک کر بولے۔

''سچ۔'' میں نے یقین دلایا.....

انہوں نے بے تابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا''جان آج تم اتنی۔اتنی خطرناک طور پر حسین لگ رہی تھیں کہ میں ڈر گیا۔کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔میں نے تم کو منع کیا تھا یہ ساڑھی پہن کر کہیں نہ جانا مگر تم نے وہی پہن لی۔میں تم سے خفا ہو گیا تھا۔مگر اب بہت خوش ہوں۔تم نے میری محبت کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے۔''

''آصف بھائی بھی یہی کہہ رہے تھے۔'' میں پر جوش ہو کر بول اٹھی۔(پھر وہی غلط وقت پر نا مناسب کلمہ۔ہائے میری سادگی) وجیہہ کے ہاتھ کی گرفت فوراً کمزور ہو گئی۔''وہ خوش تھے کہ میں نے آپی کی بخشش پر آپ کے تحفے کو ترجیح دی ہے۔''میں نے جلدی سے بات بنائی۔(کچھ عقل استعمال کرنا سیکھ لیا تھا)۔

اطمینان کا سانس لے کر وجیہہ پھر خوش ہو گئے۔''فوزیہ کی حرکتیں آصف کو پسند نہیں۔وہ بہت نادان ہے۔تم اب بہت سمجھدار ہو گئی ہو۔''

''ہاں۔آپ کی خاطر۔'' میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔وجیہہ نے میرے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر گل کو قریب کھینچ لیا۔

''ارے یہ اتنی دور کیوں ہے۔پھر ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے سائے میں لے لیا۔حصار میں۔حفاظت میں۔گل کو چوم کر بولے۔

''آئی لو یو۔'' اور پھر میرے کانوں کے پاس زندگی بڑھانے والا نغمہ گونجنے لگا۔''آئی لو یو۔''

ایک دن آپی پھر آئیں کہنے لگیں''میں کل صبح آئی تھی گھر میں تالا لگا تھا۔''

میں نے بتایا۔''میں کالج جاتی ہوں۔'' وہ متعجب ہو کر بولیں۔''اور گل.....؟''

''اسے بے بی لے جاتی ہے۔گل اس سے بہت مانوس ہے۔''

''مگر تم کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔شادی ہو گئی ہے۔بچہ ہے۔''

''علم ضرورت ہی نہیں فرض ہے آپی۔جب جس کو موقع ملے اس فرض کو اپنا لے۔''

''اچھا۔تو ایسا کرتے ہیں کل سے میں گل کو لے جایا کروں گی۔دوپہر کو بھیج دیا کروں گی۔غیروں کا احسان کیوں لیتی ہو۔میں بھی تنہائی سے گھبراتی ہوں۔دل بہل جائے گا میرا۔''

''نہیں آپی!تمہیں تکلیف ہو گی بے بی نزدیک ہی ہے میں کالج سے آتے ہوئے گل کو ساتھ لے کر آتی ہوں مجھ سے تو ایک منٹ کی برداشت نہیں ہوتی۔''

''تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں۔غیروں پر ہے۔''

''نہیں آپی نہیں۔بس بے بی بہت اچھی نیک لڑکی ہے۔پھر یہ کہ قریب رہتی ہے۔''

''تمہیں اب پڑھنے کی آفت آئی ہے۔بچے کو سنبھالو۔میاں کی خدمت کرو۔گھر دیکھو۔'' وہ جھنجھلا گئیں۔

''سب کچھ کرتی ہوں۔'' میں نے ہنس کر ان کا غصہ کم کرنا چاہا۔''مگر تعلیم کی اہمیت الگ ہے۔''

''کیا نوکری کرو گی بعد میں؟'' وہ قدرے حقارت سے بولیں۔

''کیا تعجب ہے؟'' میں نے پھر مسکرا کر انہیں دیکھا۔''افسرانہ رعب۔دفتر کی شان ہی اور ہوتی ہے۔''

''وجیہہ کو پسند ہے یہ۔؟''

''مجھے پسند ہے۔تو انہیں بھی ہو گا۔'' میں نے سادگی سے کہہ دیا۔وہ مڑ کر آصف بھائی کو دیکھنے لگیں جو دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔

''سنا آپ نے۔'' آپی نے طنزیہ لہجے میں ان کو مخاطب کیا۔

وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔''آپ ابھی بیٹھیں گی۔یا چلیں گی۔؟''

''یہ کیا تماشا ہے؟'' وہ آگ بگولہ ہو کر آصف بھائی پر برسنے لگیں۔''خود تو روز آتے ہیں گھنٹوں بیٹھتے ہیں میں آؤں تو پانچ منٹ کے بعد کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''آپ کو بیٹھنا ہے تو بیٹھیے۔چلنا ہے تو چلیے۔'' وہ بے حد ضبط سے کام لے رہے تھے۔''کچھ دیر بعد آ کر لے جاؤں گا۔اگر آپ چاہیں تو۔''

''کیوں۔میں خود نہیں جا سکتی۔مگر مجھے یہ تو پتا چلے کہ جب اکیلے آتے ہیں تو کیوں گھنٹوں ٹھہرتے ہیں۔خوش وخرم جاتے ہیں واپس۔مسکراتے ہوئے۔اور میرے ساتھ آنے میں جیسے گلے میں پھانسی کا پھندہ۔''

آصف بھائی کا چہرہ سرخ بھبھوکا ہونے لگا۔انہوں نے دھوپ کی عینک آنکھوں پر لگائی۔اور دھیمے لہجے میں بولے۔''یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔بہر حال اب چلیے۔تماشا نہ دکھایئے۔''

آپی کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔آصف بھائی انہیں کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔وہ

مزید کسی کوشش کے بغیر کھنچی چلی گئیں- میں ہونق بنی کھڑی رہی-ایک منٹ بعد آصف بھائی پھر اندر آئے-

''چابی یہیں چھوڑ گیا تھا' انہوں نے جھک کر زمین سے کار کی چابی اٹھائی-''شام کو آؤں گا-'' کہہ کر چلے گئے-

آپی کتنے غلط طریقے سے بات کرتی ہیں آصف بھائی سے وہ کبھی کبھی آتے ضرور تھے-مگر ایک پیالی چائے پی کر چلے جاتے تھے اور ہمیشہ وجیہہ کی موجودگی میں آتے تھے-دونوں صحن میں بیٹھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے تھے- ایک دفعہ میں نے بھی سننے کی کوشش کی تھی- کچھ لڑکیوں کا ذکر تھا-میری سمجھ میں نہیں آیا-آصف بھائی اس شام نہیں آئے-کئی دن تک نہیں آئے پھر ایک روز وجیہہ کے ساتھ آئے' میں گل کو بہلا رہی تھی جو بار بار چولہے کے پاس چلا جاتا تھا-آصف بھائی کے بازو اور سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی-

''کیا ہوا؟'' میں پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی-

''مبارک باد دو-'' وجیہہ نے کہا-''جان بچ گئی ہے.....ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا-''

''ہائے اللہ-'' میرے منہ سے نکلا-''آپ اس دن آئے نہیں؟''

''میں لے کر آیا ہوں آج بھی تمہاری آپی تو روک رہی تھیں-''

''انہیں بھی لے آتے-'' میں نے کہا-

''کیسے لاتے؟ کار ورکشاپ میں پڑی ہے-''

''کس دن ہوا ایکسیڈنٹ؟'' میں ان کے سر بازو کو دیکھنے لگی-

''تمہارے ہاں سے واپسی میں-'' انہوں نے سادگی سے کہا-''اپنا سر ٹکرانے کے بجائے کار ٹکرا دی-شکر ہے کچھ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی-''

''اور آپی.....؟''

''وہ بھی بچ گئی ہیں-'' وہ تلخی سے ہنسے-''مجھے مارے بغیر ان کو کچھ ہو گا بھی نہیں-''

میں چپ چپ باورچی خانے میں آ گئی-بے بی سل پر قیمہ پیس رہی تھی-وہ کوفتے بہت عمدہ پکاتی تھی-بلکہ ہر کھانا بے حد لذیذ پکاتی تھی-کبھی کبھی میں اپنی آسانی کے لیے اس سے پکوا لیتی تھی-

آج تو میرا فرسٹ ایر کا رزلٹ آیا تھا-اور بے بی نے خود ایک شاندار دعوت کی پیش کش کی تھی-کھانا پکانے کی ذمے داری لی تھی-آصف بھائی اور وجیہہ صحن میں ہی بیٹھ گئے-میں نے گل کو وجیہہ کے حوالے کر دیا-

''تم سے ایک بچہ نہیں سنبھلتا-''

''میں کھانا پکا رہی ہوں-''

''اور بے بی-؟''

''وہ بھی-''

''اوہوں-کوئی خاص تقریب ہے کیا-؟''

''ہاں-'' میں نے قدرے شرما کر کہا-''میں فرسٹ ایر پاس کر چکی ہوں-بہت اچھے نمبر لیے ہیں-''

''لیجیے صاحب-'' وجیہہ نے تمسخرانہ انداز میں آصف بھائی سے کہا-''فرسٹ ایر پاس کر لیا-اب کچھ عقل آ گئی ہو گی-لگے ہاتھوں ان کے ہاتھ کے پکے کھانے کا امتحان ہو جائے-''

''آصف بھائی آپ بھی کھا کر جایئے گا-''

''بھئی، منہ دیکھے کی دعوت تو ہمیں منظور نہیں-'' انہوں نے گل کو گود میں لے لیا-مگر ان کے جانے کا ارادہ بھی نہ تھا-مزے سے باتیں کر رہے تھے-کھانے کے لیے صحن میں میز لا کر وجیہہ نے کرسیاں بھی لا کر رکھیں-میں نے ڈشوں میں کھانا نکالا-وہ اٹھا کر لے گئے-میں برتن رکھ آئی بے بی آصف بھائی سے جھینپ رہی تھی-میں اسے زبردستی کھینچ لائی-

''ارے یہ تو آصف بھائی ہیں-ان سے کیا شرمانا-''

''کیا مطلب-'' انہوں نے ایک ابرو اٹھا کر معترض لہجے میں پوچھا-''ہم شرمانے والی مخلوق نہیں دوسرے درجے کے آدمی ہیں-''

''توبہ-کیسی باتیں کرنے لگے- آپ تو کھانا کھایئے کھانا بے بی نے کوفتے پکائے ہیں-اور ایسے پکائے ہیں کہ آپ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے-'' میں نے بات بدل کر انہیں ادھر متوجہ کیا-

''کس کی؟'' انہوں نے شوخی سے کہا-میں جھینپ گئی-

''اپنی-اور کس کی-'' میں کھسیانی ہو گئی-

''اچھا میں سمجھا تھا پکانے والے کی-''

''ایسے کوفتے آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائے ہوں گے-کوئی بڑے سے بڑا خانساماں بھی اتنے لذیذ کھانے نہیں پکا سکتا-بے بی کو ہر قسم کے کھانے پکانے آتے ہیں-'' بے بی نے میرا ہاتھ دبایا-وہ شرمندہ ہو رہی تھی تعریفوں سے-

انہوں نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا-''کھا کر بتاؤں گا-ویسے تم تعریف کے معاملے میں بہت.....ایکسپرٹ ہو-اور نہایت غلط انداز ے میں جناب'' انہوں نے منہ میں لقمہ ڈالا اور چپ کے چپ رہ گئے-

میں رونکھی ہوگئی۔ ''ہائے اللہ کیا مزے کے نہیں ہیں۔؟''

''دراصل تمہاری تعریفوں کا ڈسا ہوا ہوں۔ اس لیے پورا کھانا کھانے کے بعد ہی مطمئن ہوسکوں گا۔'' آصف بھائی سنجیدگی سے کھاتے ہوئے بولے۔

کوفتے گھمارے بینگن اور چاول۔ یہ میرے اور وجیہہ کے بھی پسندیدہ کھانے تھے۔ بینگن اور کوفتے بے حد لذیذ تھے۔ آصف بھائی اور وجیہہ نے ڈٹ کر کھایا۔ مگر تعریف نہیں کی۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے رہے میں انجان بنی رہی۔ جب کوئی بات سمجھ میں ہی نہ آئے۔ تو بے نیازی بہتر ہے۔ کھانے کے بعد بے بی میز سے برتن اٹھانے لگی۔

''روز ایسا کھانا ملے تو میں آجایا کروں؟'' آصف بھائی نے کہا میں ہنسی۔ تعریف ہوگئی تھی۔ ''روز بے بی تو نہیں پکائے گی۔ یہ تو آج خوشی میں پکانے آ گئی۔''

''تو۔ انہی کے گھر چلا جاؤں روزانہ۔'' بے بی کے ہاتھ سے پلیٹیں پھسلنے لگیں۔

وقت دھیمی رفتار سے گزرتا رہا۔ میری تعلیمی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں۔ اور گل کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی۔ لیکن بے بی اور اس کی اماں بہت مدد دیتی تھیں۔ وجیہہ نے دفتر کے بعد ایک اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرلی۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگے۔

''مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ اور خرچ بھی۔ میں نہیں چاہتا تمہاری تعلیم ادھوری رہ جائے۔ یا تم اور گل کسی چیز کے لیے ترستے رہو۔''

وہ اب روز بہت دیر سے گھر آتے۔ اتنے تھکے ہوئے ہوتے کہ کہیں باہر جانے کا تو ذکر ہی نہیں ہوتا تھا۔ گل کو سیر کی عادت ہوگئی تھی۔ میں اور بے بی اسے گلی میں ہی ٹہلا لاتے۔ آپی کبھی کبھی آتیں اور کبھی بہت خوش۔ کبھی کبیدہ خاطر واپس جاتیں۔

یہی حال آصف بھائی کا تھا۔ کبھی بہت بولتے کبھی خاموش رہتے اور صرف گل سے کھیلتے۔ عموماً وہ وجیہہ کے ساتھ ہی یا کچھ پہلے کچھ بعد گھر میں آتے۔ میں اور وجیہہ ان کی عادت سے واقف ہو گئے تھے۔ کوئی سوال نہ کرتے۔ ایک دن سہ پہر کو آئے۔ آتے ہی کرسی پر گر گئے۔ آنکھیں بند کر کے کہنے لگے۔

''یہاں کتنا سکون ہے۔؟''

میں نے مذاق سے کہا۔ ''میرا پورا گھر آپ کے ایک کمرے کے برابر ہے۔ آپ مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔''

''اس محل نما گھر کے کسی گوشے میں بھی میرے لیے سکون سے بیٹھنے کی جگہ نہیں۔ اس ساز و سامان سے لبریز گھر میں انسان کی نہیں۔ اشیا کی قدر ہے۔ میں بھی ایک ڈیکوریشن پیس ہوں۔ ایک روبوٹ۔ جو اپنے معمولات نبھاتا ہے۔ اور اسے آرام و سکون کی قطعاً حاجت نہیں ہوتی۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بہت دل برداشتہ اور تھکے ہوئے ہیں۔ چپکے سے چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

''تھینک یو۔'' وہ بغور مجھے دیکھنے لگے۔ ''تم دل کی بات کیسے جان لیتی ہو۔ تم نے یہ فن کہاں سے سیکھا۔''

میں چپ چاپ کام میں لگی رہی۔ وہ چائے پیتے ہوئے بڑبڑاتے رہے۔ پھر بغیر کچھ کہے چلے گئے۔

☆☆

ایک روز میں کالج سے آ کر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ گل بے بی کے پاس ہی تھا۔ گلی میں کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اور فوراً ہی آصف بھائی کی آواز میں نے سنی۔ اندر آ کر کھڑے کھڑے ہی پوچھنے لگے۔

''کچھ کھانے کو ملے گا؟ یا آج پھر بے بی کے گھر سوالی بن کر جانا پڑے گا؟''

ان کے انداز میں مذاق نہ تھا۔ سنجیدہ اور روکھے روکھے نظر آ رہے تھے۔ صبح میں نے وجیہہ کی فرمائش پر بھنی ہوئی مونگ کی دال پکائی تھی۔ جو دوپہر کو کھانے کے لیے رکھ دی تھی۔ وجیہہ کو مونگ کی بھنی دال ناشتے میں پسند تھی۔ مجھے نہیں۔ آصف بھائی جواب کا انتظار کیے بغیر برآمدے میں جہاں کھانے کی میز تھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ خود ہی الماری سے ایک پلیٹ نکال کر میز پر رکھ دی۔ اور چمچے سے بجانے لگے۔ یہ بے قراری۔ اضطراب و انتظار کا مظاہرہ میرے ہاتھ پیر پھلانے کے لیے کافی تھا۔ خالی دال پیش کرتے ہوئے شرم آئی۔ بہت پھرتی سے ٹماٹر پیاز کی چٹنی بنا کر دال کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دی۔ صبح کے پراٹھے بھی رکھے تھے اکثر میں اپنے دوپہر کے کھانے کے لیے ناشتے میں۔ پراٹھے یا روٹی پکا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ بہت بھوکے تھے اور رغبت سے بھنی ہوئی دال اور پیاز کی چٹنی کھا رہے تھے۔ تبھی مجھے یاد آیا۔ کل کے لیے میں نے صبح آلو ابالے تھے جلدی سے آلو چھیل کر چلے۔ پھر تھوڑے دودھ میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیے۔ الائچی پیس کر چینی کے ساتھ دودھ میں ڈالی۔ ابلے ہوئے آلو منٹ بھر میں حل ہوگئے۔ شاید اتارتے اتارتے تین منٹ لگے۔ پیالے میں کھیر لا کر ان کے سامنے کھڑی ہوئی۔ وہ کھانا کھا چکے تھے۔ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے میری طرف دیکھا پھر کھیر کے پیالے کو۔ آخر ان کی حیرت ختم ہوئی۔ اور میری مشکل آسان۔ انہوں نے پیالہ پکڑا۔ کھیر گرم تھی۔ مزے لے لے کر کھاتے رہے۔ کھاتے کھاتے بولے۔

''آج پہلی بار اپنی زندگی کے خوفناک خلا اور نقصان کا اندازہ ہو رہا ہے۔ میں خود کو بدقسمت تو سمجھتا تھا۔ اور اس کی ذمے داری خود پر ہی ڈال کر راضی برضا ہو جاتا تھا۔ لیکن آج جس محرومی

کا احساس ہوا ہے- اس کا صدمہ شاید کبھی نہ بھلا پاؤں گا- آج سے پہلے کبھی بھوک کی شدت کو بھی اتنا اہم نہیں سمجھتا تھا- مگر پیٹ بھرتے کے باوجود اب بھی بھوک کی شدت کا احساس موجود ہے- جانتی ہو نازی- اس کی وجہ کیا ہے؟''

آصف بھائی کے لہجے میں کوئی کانٹا سا بول رہا تھا جس کی چبھن مجھے احساس کے پردے کو چھوتی محسوس ہوئی-

''جاننا چاہتی ہوں- نہ جانتی ہوں-'' میں نے وہاں سے ٹل جانا چاہا-

''حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتی ہو؟'' وہ واقعی مجھے ڈرا رہے تھے- میں میز سے برتن اٹھا رہی تھی- خود کو بہادر ظاہر کرنا بھی کتنا مشکل کام ہے- جو میں کر رہی تھی-

''اتنا لذیذ کھانا- شاید ہی میں نے کبھی کھایا ہو- کم از کم ان تین چار سالوں میں-'' ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے- برتن باورچی خانے میں رکھ کر آئی تو سلسلہ کلام پھر سے جوڑتے ہوئے کہنے لگے-''پہلے زمانے میں بادشاہ کسی سے خوش ہوتے تھے تو انعام میں جاگیر دے دیتے تھے- لوگ اس قسم کی سخاوت پر اب معترض ہیں- طنز کرتے ہیں کہ بادشاہوں کو اور آتا ہی کیا تھا- حاتم طائی کا قصہ سنا ہے؟ اس کے پاس ایک گھوڑا تھا- اسے بے حد عزیز تھا- کسی قیمت پر وہ اسے فروخت کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا- لیکن ایک روز جب اس کے ہاں مہمان آیا- تو اس کے پاس مہمان کی تواضع کے لیے کوئی چیز نہ تھی اس نے گھوڑا ذبح کر کے مہمان کو کھلا دیا- بعد میں مہمان نے بتایا وہ حاتم کی سخاوت اور اس کے گھوڑے کی شہرت سن کر آیا ہے- گھوڑا دیکھنا چاہتا ہے- سناتم کہنے کا مطلب یہ کہ جس کے پاس جو چیز ہوگی- وہ جس چیز کا مالک ہوگا- جس پر اس کو اختیار ہو گا- وہی تو انعام میں دے گا- اپنی سخاوت کا بھرم رکھنے کے لیے اس کی قربانی دے گا- تو محترمہ نازیہ وجیہہ صاحبہ میں بھی آج بادشاہوں کے مزاج اور حاتم کی سخاوت کا مالک بننے کی کوشش کر رہا ہوں- اس لیے کہ- اتنی محنت شوق اور خلوص سے تم نے جو میری بھوک کا مداوا کیا ہے اس کے نتیجے میں کسی بڑے انعام کی مستحق ہو گئی ہو- آیا سمجھ میں؟ اور یہ سخاوت یہ شاہی اس اذیت اور کرب کا ردعمل ہے- جو میں پچھلے تین چار دن سے برداشت کر رہا ہوں- جانتی ہو میں نے چار دن سے کھانا نہیں کھایا- جب گھر میں نہیں کھایا تو باہر کیوں کھاتا- آج بالکل بے صبر ہو کر بچوں جیسی حرکت کر بیٹھا- یعنی بے وقت آ کر تم کو پریشانی میں ڈالا ہے اور اب تم کو انعام سے نوازنا بھی میرا فرض بن گیا ہے-''

''کھانا کیوں نہیں کھایا تین چار دن سے؟'' میں فکرمندی سے ان کی صورت دیکھنے لگی-''کیا آپی سے کوئی- جھگڑا-''

''نئی بات نہیں-'' وہ لاپروائی سے بولے-'' مگر ان دنوں وہ گھر میں موجود نہیں تھیں- اور مجھے

ضد ہو گئی کہ ان کے ساتھ ہی کھاؤں گا- میری ضد سے واقف ہونے کے باوجود کھانے کے وقت وہ گھر سے غیر حاضر رہتی ہیں- بہت مصروف زندگی ہے- پکنک پارٹی- محفل رقص و سرور جانے کیا کیا انہیں ایسی زندگی پسند ہے- اچھا- میں ذرا لیٹنا چاہتا ہوں- آرام کو ترس گیا- اجازت؟''

وہ میرے پلنگ پر لیٹ گئے- تکیے پر سر رکھتے ہی بے چینی سے اٹھ بیٹھے-''یہ پلنگ کس کا ہے-؟''

''میرا-'' میں قدرے جھینپ گئی- اس کی چادر اور تکیہ غلاف بدلنے والا تھا- آج میں اس کام سے بھی فارغ ہونا چاہتی تھی- وہ وجیہہ کے پلنگ پر چلے گئے- میں برآمدے میں بیٹھ کر سلائی کا کام کرنے لگی- بے بی گل کو لے کر آئی- وہ سویا ہوا تھا- بے بی سے لے کر اسے میں نے اپنے پلنگ پر لٹا دیا- آصف بھائی میرا مکمل کا سفید دوپٹہ جو میں نماز اور رات کو منہ پر ڈالتے وقت اوڑھتی تھی- اس سے منہ لپیٹے بے خبر سو رہے تھے- وہ سوتے رہے اور میں ادھوری چھوڑی ہوئی سلائی مکمل کرتی رہی- روز سو جاتی تھی تو چھوٹے موٹے کام اگلے دن پر ٹلتے رہتے تھے-

شام کو گل جاگ اٹھا اور آصف بھائی کو وجیہہ سمجھ کر ان سے جا لپٹا- وہ اسے گود میں لے کر باہر آئے-

''بہت مزے کی نیند آئی- ساری تھکن اتر گئی- ویسے نازی دوپہر کو لاجواب کھانا کھلایا تم نے- میں اس ذائقے کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا-''

''جانے دیجیے-'' میں خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئی-''آپی خود اتنے لذیذ کھانے پکاتی ہیں- میں نے تو ایسے ہی بس- الٹے سیدھے سیکھ لیے ہیں-''

''ایک بات-'' وہ انگلی اٹھا کر بولے-''یاد رہے تمہاری آپی صرف خانسامے کے ہاتھ کا کھانا پسند کرتی ہیں- میں نہیں جانتا کہ ان کو کچھ آتا بھی ہے- یا محض تمہارا پروپیگنڈہ ہے-''

میرے سیکنڈ ایر کے امتحان ختم ہو گئے- شکر ہے ورنہ وجیہہ تو دفتر سے تھکے ہونے کے باوجود رات کو جاگ کر مجھے پڑھاتے تھے- ان کی ڈیوٹی ختم ہوئی-

خالہ جی بے بی کی شادی کے لیے پریشان تھیں- کئی رشتے آئے مگر کسی میں تعلیم اور شعور کی کمی- تو کوئی جہیز کا طالب- کچھ دن ہوئے ایک رشتے کے سلسلے میں ان کے ہاں کافی ہماہمی رہی- لوگ آتے رہے جاتے رہے- پھر خالہ جی نے بتایا کہ اس رشتے سے بی بی نے خود انکار کر دیا ہے وہ بہت ہراساں تھیں کہ ان کی زندگی میں بے بی گھریار کی ہو جائے تو وہ چین سے مر تو سکیں گی- ورنہ اسی میں روح اٹکی رہے گی انہوں نے مجھے بے بی کے انکار کی وجہ معلوم کرنے کو کہا- میں نے بے بی کو گھیر لیا بہت پوچھنے پر بولی-

''اماں کو تو یونہی گھبراہٹ ہو رہی ہے- مگر اس رشتے سے بہتر ہے کہ میرا گلا کاٹ دیں- اور بے

غم ہو جائیں۔''

''کیا بہت برے لوگ ہیں۔غریب ہیں۔''

''بھابھی غریب آدمی بھی انسان ہوتا ہے۔مگر ضروری نہیں کہ سب انسان اچھے ہی ہوں۔میں بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ چاہے غریب ہوں مگر انسانیت کے مالک ہوں۔عورت کی عزت کرتے ہوں۔اماں سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن گئی ہیں صرف میرے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے اس جہنم میں دھکیل رہی ہیں۔''

''کیا واقعی بے بی تم کو کس نے بتایا کہ وہ اچھا آدمی نہیں۔''

''سب جانتے ہیں۔اس کے گھر والے اسے سدھارنے کے لیے یہ جوا کھیل رہے ہیں۔اگر میں اس کھیل میں ہار گئی۔تو کس کا نقصان ہوگا۔مگر اماں اس نقصان کو مجبوری کے پردے میں چھپا دینا چاہتی ہیں۔میں ابھی مایوس ہوں نہ مجبور آپ انہیں اطمینان دلا دیں۔میری شادی نہ بھی ہوئی تو کوئی نئی بات نہ ہوگی۔بہت سی مجبور بے آسرا لڑکیاں بن بیاہی رہ جاتی ہیں۔میرے پاس تعلیم ہے۔میں تو ملازمت کر کے وقت کاٹ لوں گی۔کسی پر بوجھ نہیں بنوں گی۔''

مجھے بے بی کے فیصلے سے اتفاق تھا۔وجیہہ کو جب میں نے بتایا تو وہ بھی خوش ہوئے اور خالہ جی کو سمجھایا کہ جلدی نہ کریں۔جب بھی مناسب رشتہ آیا ہم خود دیکھ بھال کر کے شادی کریں گے۔اور اس کے لیے خیال رکھیں گے۔خالہ جی کو بہت تسلی ہوئی۔دعائیں دیتی رہیں۔

پتا نہیں کیوں مجھے یہ توقع تھی کہ آپی میرے بارے میں' گل کے بارے میں اماں ابا کو لکھیں گی تو اماں ضرور بے تاب ہو کر مجھ سے ملنے آئیں گی۔مگر یہ خوش خیال بھی مایوسی کے اندھیروں میں کھو گئی۔آپی اماں ابا سے اور اماں ابا آپی سے بہت خفا تھے۔خط و کتابت تھی ہی نہیں۔

اماں کی خفگی کا راز بھی کھلا۔شادی کے کچھ دن بعد اماں جب آپی سے ملنے ان کی سسرال کے شاندار گھر میں گئیں۔تو ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔جہاں آپی کے کچھ مہمان بیٹھے تھے آپی کو شکوہ تھا کہ وہ برقعہ پہن کر ان کی سسرال کیوں آئیں آ ہی گئی تھیں تو صحن یا کچن میں چلی جاتیں۔گیلری میں بیٹھ جاتیں۔سیدھی مہمانوں کی طرف کیوں آئیں اور آپی سے لپٹ گئیں۔اور مہمانوں کے سامنے ماں بیٹی کے رشتے کا اظہار بھی کر ڈالا۔اس پر آپی بہت گرم ہوئیں۔کاش کبھی اماں مجھ سے لپٹ کر اس رشتے کا اعلان کرتیں۔میری عاقبت سنور جاتی۔میں خواب میں ہی ایسا منظر دیکھ لیتی تو اماں کی بیزاری اور خود سے نفرت کو نظر انداز کر کے ان کے پیروں سے لپٹ جاتی۔آپی شادی کے بعد دولت و حشمت کی مالک بن کر اس قدر مغرور اور بد دماغ ہو گئیں۔انہیں خود نمائی کا چسکہ پڑ گیا۔اور وہ اپنے ماں باپ کے طرز زندگی پر ہی نکتہ چینی کرنے لگیں۔

ایک بار ابا ان کے ہاں ان کی ساس کی تیمارداری کے لیے گئے انہوں نے بغیر کھانا کھانے نہیں

آنے دیا۔سب کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ابا نے چھری کانٹے کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا اور ہاتھ سے چاول کھانے لگے۔آپی کو ان کی اس جہالت پر اس قدر غصہ آیا کہ سب کے سامنے سوسائٹی کے آداب اور تہذیب پر لیکچر دینے لگیں اور ان کی فرسودہ اور دقیانوسی روح پر طنز سے بھی باز نہ آئیں۔ابا کو اتنا رنج ہوا اور اس قدر غصہ آیا کہ وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اپنے گھر آ گئے اور پھر ان کے گھر نہیں گئے۔تب سے آپی ان سے اور وہ آپی سے ناراض تھے۔ابا کے پندار کو سخت چوٹ پہنچی۔اور وہ بیمار ہو گئے۔آپی کے سلوک سے وہ اتنے نالاں ہوئے۔

مگر میں نے تو کبھی ان کے سامنے زبان بھی نہیں کھولی۔جو الزام انہوں نے لگایا۔چپ چاپ سن لیا۔جو سزا انہوں نے سنائی۔اسے بھی سر جھکا کر قبول کر لیا۔اپنے مزاج کی تندی اور ضد کے باعث اعلان جنگ کر کے بھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا بلکہ آپ ہی عذاب سہتی رہی۔ایک شہر میں رہتے ہوئے کبھی وہ میری ضد کو شکست دینے آ جاتے۔پھر سے قصیدے کر ڈالتے مارتے۔مگر مجھے بے آسرا تو نہ چھوڑتے۔مگر انہوں نے بھی سوچ لیا کہ تم روٹھے۔ہم چھوٹے۔

میں اپنی غلطی' اپنے قصور کو مانتی ہوں۔کہ ان کے گھر کا منہ نہ دیکھا۔مگر ایسا اٹل فیصلہ کس لیے کیا تھا۔یہ کسی نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ایک چھوٹی سی انجھی کی خطا اتنا بڑا گناہ مان لی گئی کہ مجھے اپنے گھر اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔آج اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھیں۔

آصف بھائی نے بتایا تھا کہ وہ آج کل سوشل ورک کر رہی ہیں۔گھر میں کم آتی ہیں۔کئی فیشن ایبل خواتین اور دولت مند عیسائیوں کے اشتراک سے ایک ایڈوائس کلب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔آپی اس کی روح رواں ہیں۔اپنی اولاد سے محرومی کے غم کو چند بے فکرے اور بے ضمیر لوگوں کے ساتھ ہاؤ ہو میں غلط کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔مگر وہ ایسا کرنے سے مطمئن تھیں۔آصف بھائی کی بات ماننے پر تیار نہ تھیں اور اب آصف بھائی کو بھی فرسودہ خیال' تاریک پہلو کے مالک' دقیانوسی شوہر کا خطاب مل گیا تھا۔جو زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے میں بیوی کا ساتھ نہیں دیتا۔میں اور وجیہہ آپی کی حالت پر افسوس کر کے رہ جاتے۔آصف بھائی کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی۔مستقل اداس مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی تھی اور آنکھوں میں بے خواب راتوں کی چبھن نے مسلسل سرخی پھیلا دی تھی۔وہ بہت آزردہ رہا کرتے۔

☆☆

وجیہہ کے آفس کے ایک ساتھی کی شادی ہوئی وہ بہت نیک اور خیر خواہ قسم کا آدمی تھا۔وجیہہ اس کی۔تعریف کرتے تھے۔اس نے شادی کے بعد اپنے دوستوں کو ہوٹل میں ڈنر دینے کا اہتمام کیا۔پہلی بار وجیہہ نے مجھے بھی شریک ہونے کا کہا۔وہ کسی دوست کو گھر میں نہیں لاتے تھے اگر کوئی آ بھی جائے تو میں سامنے نہیں جاتی تھی۔دو تین دوست البتہ ایسے تھے جن سے میری

واقفیت اور صورت آشنا تھی- ہوٹل میں ڈنر- وہ بھی شادی کی خوشی کا ڈنر لباس کا مسئلہ تھا-

میں نے ایک گلابی جوڑا بنایا تھا- جس کے کالے کرتے پر گلابی ریشم سے بیلیں کاڑھی تھیں بہت خوبصورت لگتا تھا وہ سیاہ کرتا- جب میں اس پر کڑھائی کر رہی تھی- وجیہہ بار بار دیکھتے اور پوچھتے کہ یہ کب بن کر تیار ہوگا- جب بن گیا تو تقاضا کہ پہنو- مگر میں اسے ابھی تک نہیں پہن سکی تھی- فیصلہ ہوا کہ ہوٹل کے ڈنر کے لیے یہ لباس مناسب ہے- گھر میں بے بی اور خالہ جی کو گل کے پاس چھوڑا- وہ رات کو اپنے بستر کے سوا کہیں سو نہیں سکتا تھا-

ہم ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچے- فائیو اسٹار ہوٹل روشنی سے جگمگ رہا تھا- تمام لوگ اپنی بیگمات کے ہمراہ موجود تھے- میرا بھی تعارف ہوا- دلہن دولہا آئے- دلہن بہت شوخ و طرار تھی- مجھے ہنسی آ رہی تھی- رشید صاحب صورت سے ہی سید ھے شریف نظر آ رہے تھے اب یہ لڑکی انہیں انگلیوں پر نچائے گی- عمر میں مجھ سے کچھ بڑی ہی ہوگی- میں ابھی اکیس سال کی نہیں ہوئی- اور اتنی چالاک ہوگئی ہوں کہ چہرے پڑھنے میں استاد سمجھی جاتی ہوں آصف بھائی میرے اس فن کو مان گئے تھے-

ہال میں لمبی ٹیبل کا انتظام کیا گیا تھا- ایک سائڈ پر مرد حضرات دوسری سمت خواتین تھیں- ہوٹل میں انگلش آرکسٹرا مدھم آواز میں بج رہا تھا- بہت خوابناک ماحول تھا- سب لوگ دھیمے لہجے میں دھیرے دھیرے گفتگو کر رہے تھے- کبھی کبھی کسی کی ہلکی سی ہنسی سنائی دیتی- خواتین ہنسنے میں طاق ہوتی ہیں- مگر وہ بھی ماحول کے مطابق ضبط سے کام لے رہی تھیں- ہوٹل میں ایسی خاموشی تھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو- بس کھی کی جھنجھناہٹ جیسی آوازیں آ رہی تھیں-

کھانا تقریباً اختتام پر تھا- دروازے سے چند لوگ اندر داخل ہوئے- پھر وہ ہمارے قریب سے گزر کر سامنے اسٹیج کے پاس چلے گئے- جب وہ لوگ بیٹھے تو وجیہہ کی نظریں ادھر ہی تھیں میں نے بھی محض وجیہہ کی توجہ ادھر پا کر نظروں سے تعاقب کیا- میرا سانس رکنے لگا- الٰہی ان چند لوگوں میں دو عورتیں اور کئی مرد تھے- ان میں سامنے ہی میری آپی بیٹھی تھیں- سرخ، سبز گہرا میک اپ- سیاہ بغیر آستین کا بلاؤز اور سیاہ ساڑھی جس پر روپہلی بادلیاں بنے تھے- بلاؤز میں شاید گلا تھا ہی نہیں- مجھے دور سے وہ برہنہ نظر آ رہی تھیں- جس مرد کے قریب وہ بیٹھی تھیں- اس کا ہاتھ مسلسل آپی کے لباس سے بے نیاز شانے پر رینگ رہا تھا اور آپی مسرور و لاپروا- بہت انہماک سے باتوں میں مصروف ان سب کے ہاتھوں میں رنگین گلاس تھے جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر پی رہے تھے- میں کھانا چھوڑ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ہی دیکھ رہی تھی- ''اف- یہ شرمناک منظر- آصف بھائی دیکھ لیں تو-؟''

تبھی جانے کیسے آپی کی نظریں مجھ پر پڑیں ان کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی- غالباً وہ

اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں بتا رہی تھیں ان کی نظروں کا رخ میری طرف تھا وہ کرسی سے اٹھنے لگیں اور میرا سر چکرانے لگا- خوف نے پوری قوت سے حملہ کیا- میں کرسی سے گرنے لگی-

وجیہہ فوراً اٹھ کر آئے- دوستوں سے معذرت کرتے ہوئے میری طبیعت اچانک خراب ہونے پر وقت سے پہلے اٹھ جانے کا اظہار کر کے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے- میں نشے کی سی کیفیت میں تھی- ماتھے پر پسینہ اور ٹانگوں کا دم نکل رہا تھا- مجھے دیوار کے ساتھ ٹکا کر وہ دوڑتے ہوئے ادھر چلے گئے جہاں موٹر سائیکل پارک کی تھی بمشکل راستہ بناتے ہوئے جب وہ میرے قریب آئے اور میں کسی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھی تو اس وقت آپی میری تلاش میں دروازے سے باہر آ گئی تھیں میں نے اپنا سر وجیہہ کے شانے پر رکھ دیا- اور زار و قطار رونے لگی- اگر وہ ہماری طرف آ جاتیں- سب کو پتا چلا جاتا یہ میری بہن ہیں- یہ میری بہن- بے حیائی..... اس عالم میں شرمناک حد تک چھچھوری حرکتوں اور ناز و انداز میں ماہر- ہائے- میرے ابا کی عزت-

میں ابا کی عزت ہوٹلوں میں غیر مردوں کے ہاتھوں سسکتی دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی- وہ پاکیزہ نظریات کے حامی- شریفانہ اصولوں کے قدر دان- جن کی زندگی ہی پاکباز تعلقات اور معصومانہ طرز زندگی کی استواری میں گزر رہی تھی- چند منٹ بعد وجیہہ نے مڑ کر مجھ سے پوچھا- ٹھیک ہو؟ مجھے ہوا کیا تھا- صرف سنسنا تا تیر ہی تو دل کے پار ہوا تھا- زخم گہرا نہیں تھا خون بھی نہیں بہا- میں دل پر زخم کھانے کی خوگر ہوتی جا رہی تھی- صرف آنسو ہی میرے اختیار میں نہ تھے-

گھر پہنچے تو خالہ جی صحن میں پلنگ پر بیٹھی تھیں- اور کرسی پر آصف بھائی سر ہاتھوں میں تھامے کسی سوچ میں غرق- خالہ جی اور بے بی کے جانے کے بعد میں گل کے پاس آ کر لیٹ گئی- سر میں درد ہو رہا تھا- میں نے لائٹ بند کرنے کے بعد برآمدے میں جھانکا- صحن میں کرسی پر وجیہہ بیٹھے تھے- پلنگ پر آصف بھائی پیشانی دباتے ہوئے کہہ رہے تھے- ''تو آج تم لوگوں نے بھی نظارہ کر ہی لیا-''

''ہاں-'' وجیہہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے- ''شراب کب شروع کی اس نے؟'' وجیہہ نے بہت ہولے سے کہا- مگر میں نے سن لیا-

''جب سے ایک فارن آسمبل کمپنی دستیاب ہوئی نئے نئے دوست بنائے جا رہے ہیں- انہی کے تحفے ہیں-''

میں اب اماں کی تربیت پر ماتم کر رہی تھی- حالانکہ ان کی تربیت میں کوئی نقص نہ تھا- مگر کہیں پر کوئی سہو ضرور ہوا تھا-

''تمہارا بھی قصور ہے- تم سمجھاتے نہیں سختی نہیں کرتے؟''

''یار دجو-'' انہوں نے بڑے پیار سے وجیہہ کو مخاطب کیا- ''مجھے بتاؤ میں کون سا راستہ اپناؤں

کہ ان کی سمجھ تک رسائی ہو-تم کو کیا خبر بات بہت آگے بڑھ چکی ہے-''

''یہ محرومی کا ردعمل ہے یار-تم اسے بہلاؤ-کھلونوں سے، پیار سے، لالچ سے-''

''میں سب کچھ کر چکا ہوں-سختی بھی-محبت بھی-''

''تو پھر تمہارا لہجہ اتنا کھوکھلا کیوں ہے-؟'' وجیہہ نے جارحانہ انداز میں سوال کیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئے-

''اس لیے- اس لیے وجیہہ کہ میں منافقت پسند نہیں کرتا-مگر برداشت کرنے پر مجبور ہوں-مجھے ان سے کبھی بھی محبت نہ ہوسکی-مگر ساتھ رہنے سے ایک انس ہو ہی جاتا ہے-وہ بھی-ان کی بے درد خود غرضانہ فطرت کے بے نقاب ہونے سے باقی نہ رہا-''

''اس طرح تو-تمہاری زندگی پر بھی اثر پڑے گا کوئی حل تو تلاش کرنا ہی ہوگا-''

''اثر جو پڑنا تھا-پڑ چکا- میں اپنی لاش کندھے پر اٹھائے راستہ تلاش کر رہا ہوں- میرے دوست بے موقع تو لاش لڑھکائی نہیں جاسکتی-''

''یہاں کب آئے-کیا جھگڑا ہوا تھا-؟''

''شدید- مجھے ان کے دوستوں کے ساتھ جانے پر اعتراض تھا-ان کے لباس پر- ان سرگرمیوں پر جو آج کل وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اختیار کر رہی ہیں-میں تو- انہیں مزید ذلت سے بچانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہوں-ان کے شریف ماں باپ کے لحاظ میں-ورنہ یار- اب کردار کے نام پر ان کے پاس چھلکا ہی باقی بچا ہے- پھر بھی-''

اس سے آگے کچھ سنا نہ گیا-کانپتی ہوئی بستر پر گر گئی-آصف بھائی یا تو حد سے زیادہ بدگمان ہیں یا دروغ گو-صبح صحن میں پلنگ پر رضائی اوڑھے لیٹے تھے-وجیہہ نے چپکے سے کہا-''اسے سونے دو-جب جاگے تو چائے ناشتہ دے دینا-اور جانے نہ دینا-آج یہیں رہے تو اچھا ہے-''

مجھے ان کا رات گزارنا ہی اچھا نہیں لگا تھا- نہ کہ دن بھر میں گل کو کپڑے پہنا رہی تھی-تو وہ جاگ اٹھے-گل کے ساتھ انہوں نے ناشتہ کیا- میں اندر صفائی کرتی رہی-باہر سے ہی-''اچھا بیٹے ہم چلے-'' کہہ کر چلے گئے- میں نے نہیں روکا-کئی دن گزر گئے-آپی گل کے لیے کھلونے لے کر آئیں-شاید بہانہ بنا کر آئی تھیں- میں بھی ان سے صاف بات کرنا چاہتی تھی-

''تو اس دن ہوٹل میں کیا کر رہی تھی؟'' نہایت اپنائیت کے لہجے میں پوچھنے لگیں-''مجھے دیکھ کر بھاگ گئی-''

''اور تم... کیا کر رہی تھیں-آپی! تم اتنے گندے شرمناک حلیے میں تھیں کہ میں-کسی سے نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکتی اگر وہاں سب کو معلوم ہو جاتا کہ تم میری آپی ہو-تم کو غیر مردوں کے ساتھ اس قدر بے حیائی کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے شرم نہیں آتی-''میں نے ان کی خبر لی-

''نہیں-اب نہیں آئی-''

''تم شراب پی رہی تھیں نا-تم ایک بار تصور کر لیتیں کہ ابا کو یہ خبر ملی-تو ان پر کیا اثر ہوگا-تو شاید زندگی بھر باتھ نہ اٹھا تیں-تمہارے میاں بھی نہیں روک سکتے تمہیں-؟''

''نہیں- وہ کیوں روکیں گے-میں ان کی باندی نہیں بیوی ہوں- ہم آزاد زندگی پسند کرتے ہیں-میں ان کے کسی فعل میں دخل اندازی نہیں کرتی-تو ان کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا-سمجھیں-''آپی اشتعال میں آ کر دانت پیسنے لگیں-وہ سراسر احساس کمتری کا شکار تھیں-مگر کیوں-پوزیشن دولت روشن زندگی- پھر انہیں کس چیز کی کمی تھی-شاید کوکھ اجڑنے کا ملال-

''آپی! سب لوگ اولاد والے نہیں ہوتے-کسی کسی کے مقدر میں یہ نعمت نہیں ہوتی مگر دنیا کی دوسری دولت بے شمار دے دی جاتی ہے-تم اس کو صحیح مصرف میں لاؤ نا-کسی بے آسرا بچے کو پال لو-یتیموں کی سرپرستی کرو-ایسے نیک کاموں میں دلچسپی لو گی تو محرومی کا احساس مٹ جائے گا-''

میں انہیں سمجھانے لگی- وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں-''مجھے تیرے لیکچر کی نہیں-تعاون کی ضرورت ہے-سن جب آصف آیا کریں باتوں میں پوچھ لیا کر- وہ کہاں کہاں جاتے ہیں-کس کس سے ملتے ہیں-سنا-''

میں ان کو حیرانی سے دیکھنے لگی-آصف بھائی کی جاسوسی-اور خود اپنے کیا لچھن ہیں؟

آپی کی آنکھیں بے روح لگ رہی تھیں جیسے کسی لاش کی آنکھیں- میں ان آنکھوں کی منجمد کیفیت سے ڈر گئی-

☆☆

ایک روز کالج سے آئی تو جیہہ گھر میں تھے-''ایں- یہ بے وقت گھر میں کیسے آ گئے-''آگے بڑھی تو ٹھٹک گئی-بیچ کمرے میں بھیا گل کو گود میں اٹھائے کھڑے تھے چیخ مار کر میں ان سے لپٹ گئی-

''کب آئے بھیا-'' چند منٹ بعد جذبات قابو میں کر کے میں نے پوچھا-

''کئی دن سے فوزیہ کے گھر پر ہوں ان کے معاملات نپٹا تا رہا تھا-''

پھر جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو رات گزر کر صبح ہوگئی-سالوں کے بچھڑے بہن بھائی اب ملے تھے-''اماں ابا کی صحت ٹھیک نہیں رہتی-'' بھیا نے بتایا- میں اداس ہوگئی-اماں کی خدمت کا ارمان-ابا کی دعائیں لینے کی آرزو-

''نادیہ اور افروز میٹرک کر چکی ہیں-ڈاکٹر انجینئر بننا چاہتی ہیں-نادیہ اسکول میں کرکٹ ٹیم کی کیپٹن تھی-کالج میں بھی اس کا عہدہ برقرار ہے-افروز باکی کھیلتی ہے-اور ریس میں حصہ لیتی ہے-سلیمہ بھابھی ریٹائرڈ ہوگئی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ-ویسے ایک بات ہے نازی کی قسمت بہت اچھی

ہے-اے ون-''

بھیا نے وجیہہ سے کہا- میں نے ان کے بازو پر سر ٹکا کر چپکے سے کہا-'' بھیا! تمہاری نازی بہت دکھی ہے-''

''پگلی ہی رہی-ارے یہ گھر کا سکون- یہ کھلونا- زندگی کی تکمیل تو نے اپنے ہاتھوں کر لی ہے-ایسا سکھ قسمت والوں کو ملتا ہے-فوزی سے سبق حاصل کر- دکھی تو وہ ہے... بے چاری-''

''کس نے دیکھا میرا سکھ ہے کوئی دیکھنے والا-؟''

''کچھ غلطی اماں سے کچھ ابا سے ہوئی-مگر کوتاہی تم سے بھی کم نہیں سرزد ہوئی بہنا'' بھیا نے اعتراف کیا-

''اماں، ابا تمہاری ضد کو اپنے وقار کا سوال نہ بناتے تو حالات کچھ اور ہوتے-مگر ہم سوچتے کچھ ہیں ہو کچھ جاتا ہے-اب دیکھو میں نے کھیل کو پیشہ بنانا چاہا-مگر مسائل حل نہ ہوئے- جب عقل آئی تو ترقی کے دروازے بند ہو گئے-بڑی جدوجہد کے بعد روزی کے دروازے وا ہوئے-اب یہ فوزی-تم نے دیکھا اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے-دولت ہے پوزیشن ہے آصف جیسا شریف شوہر ہے-خامیاں کس میں نہیں ہوتیں-مگر وہ بے صبر بہت ہے-دونوں ہاتھوں سے لقمے منہ میں لے جانا اور نگلنا چاہتی تھی-اس نے نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے انہیں ٹھوکروں میں اڑانا چاہا- سب کچھ پا کر بھی خوشی نصیبوں میں نہیں- فیند کے لیے گولیوں کی محتاج ہے-عبرت ہوتی ہے-دولت خوش قسمتی نہیں آزمائش ہے-''

انہوں نے میرے سلسلہ تعلیم کو بہت پسند کیا جاتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا عہد ظاہر کیا- میں دائیں بائیں دیکھ کر بہانے بنانے لگی- گھر، کالج، وجیہہ کا دفتر کھانے کی تکلیف بہانے تو اور بھی بہت تھے- بھیا آپی کو ساتھ لے گئے بے بی کے رشتے کا سلسلہ چل رہا تھا- خالہ جی کئی دن سے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھیں- بے بی کو ہمارے ہاں چھوڑ گئی تھیں- بے بی نے میرا بہت ہاتھ بٹایا- کپڑے سیے- گل کے نئے ڈیزائن کے بش شرٹ سیے- وجیہہ کے کرتے پر نفیس کڑھائی کی اور کھانا پکانے میں بھی برابر شریک رہتی- بہت سلیقہ مند لڑکی تھی اگر کوئی مجھے ذرا سا اختیار دے- تو میں بھیا سے اس کی شادی کروا دوں بھیا کی زندگی سنور جائے- اعلیٰ خاندان- خاموش حیادار تعلیم یافتہ، باوقار- کوئی کمی نہ تھی- بلا عذر ہر کسی کے کام آتی- محلے میں بھی اس کی تعریف ہوتی تھی- اسے گل سے بہت پیار تھا- اور گل کی یہ حالت کہ اس کی موجودگی میں مجھے بھی نظر انداز کر دیتا- اور اسی سے چپٹ کر فرمائشیں کرتا-

اس دن یہی ہوا- کہانی سننے کے لیے مچل گیا- میں نے سلائی تہہ کر کے بے بی سے کہا-'' اب یہ تمہاری جان نہیں چھوڑے گا- تم کہانی سناؤ- میں کھانا پکاتی ہوں-'' میں کچن میں مصروف ہو گئی-

آج میں نے ماش کی دال کے دہی بڑے بنائے تھے- گل کے لیے بغیر مرچ کے دہی بڑے الگ کیے اتنے میں وجیہہ دفتر سے آ گئے- کچن میں جھانک کر کہنے لگے-

''کھانے میں کیا ہے؟ آصف بھی آیا ہے-؟''

''بھنی، جو کچھ ہے- وہی کھلا دیجیے- میں اب اور نہیں پکاؤں گی-'' میں نے بے زاری سے کہا- جب دیکھو چلے آ رہے ہیں- منہ اٹھائے- ہمارے ہاں مرغ قیمہ تو دم ہوتے نہیں- انہیں احساس نہیں مجھے دال روٹی پیش کرتے ہوئے کتنی ندامت ہوتی ہے- یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کے انواع واقسام کے مرغن کھانے چھوڑ کر ہماری دال روٹی کھا کر بہت خوش ہوتے ہیں- میں اپنی کم ظرفی پر شرمندہ ہو گئی-

میں نے کھانا نکالا- انہوں نے مجھے بلایا- میں بے بی اور گل کے ساتھ کھانے کا کہہ کر اندر چلی گئی- گل ابھی کہانی سن رہا تھا بے بی نے کہا-

''بھابھی! گل کا کھانا لا دیجیے- کہانی سناتے میں کھلا دوں ورنہ بھوکے سو جائیں گے فیند آ رہی ہے انہیں-'' میں اس کا کھانا لینے گئی دونوں ہولے ہولے ہنس رہے تھے- کھانا دے کر میز سے برتن اٹھانے آئی تو اچانک آصف بھائی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا- اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکوں- دائیں ہاتھ کی انگلی منہ میں رکھ کر چاٹنے لگے بے ساختہ قسم کی چیخ میرے منہ سے نکلی- چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ کر دونوں کو حیرانی اور ایسمگی سے تکنے لگی-

''بالکل بدمزہ ہے-'' آصف بھائی برے برے منہ بنانے لگے-''یقین نہیں آتا- ان ہاتھوں نے یہ لذیذ دہی بڑے، بنائے ہوں گے-''

''دیکھوں-'' وجیہہ نے کہا اور لپک کر میرا وہی ہاتھ پکڑ لیا- اور اسی تیزی سے دوسری انگلی چاٹ لی-

''ہاں پھیکی ہے- بلکہ کڑوی بھی- آخ تھو-'' وہ بھی تھوکنے لگے- میں اس پکڑ دھکڑ سے اس قدر نروس ہو گئی کہ کچھ بولا نہ گیا- لوگ کہتے ہیں ہاتھ میں مزا ہوتا ہے- مجھے تو مزا نہیں آیا-'' آصف بھائی مضمحکہ اڑا رہے تھے-

بڑا غصہ آیا اور چڑ کر میں نے کہا-

''میرے ہاتھ میں مزا اس لیے نہیں- کہ دہی بڑے بے بی نے بنائے ہیں-''

''ارے تو انہیں بھی بلا لو- ہم ان کے ہاتھ کا مزا بھی چکھ لیں-'' وہ قطعاً پریشان نہ تھے- جانے مجھے کیا سوجھی- بے بی کو آواز دے بیٹھی- وہ بے چاری فوراً آ گئی- دوپٹے سے سر شانے چھپائے- آصف بھائی نے اس پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا- مگر فوراً ہی چھوڑ دیا- اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے- بے بی ان کی اس حرکت پر جھینپ کا سی ہو گئی اور بھاگ گئی-

مجھے بہت غصہ آ رہا تھا- برتن اٹھا کر کمرے میں آئی- بے بی پریشان بیٹھی ہاتھ سہلا رہی تھی- جیسے کوئی الائش لگ گئی ہو اسے صاف کر رہی تھی- کھانا کھا کر وہ لیٹ گئی- بہت خاموش اور سہمی ہوئی تھی-

☆☆

دن بہت سہانے ہو گئے- آصف بھائی کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی- اور کبھی کبھی وہ مجھ پر احسان جتاتے کہ میرے کردار کی صفائی کی خاطر ہی انہوں نے آپی سے شادی کر کے اپنی زندگی قربان کی ہے- وجیہہ اور آصف میں کافی دوستی اور بے تکلفی ہو گئی تھی- اب تو بے بی بھی دونوں سے مخاطب ہونے لگی- ہر وقت کا ساتھ تھا- اور کافی وقت گزرتا جا رہا تھا- ایک روز وجیہہ نے دفتر سے آ کر بتایا کہ ان کی ملازمت ختم ہو گئی- انتظامیہ بدل گئی تھی- اور انتقامی کارروائی کے نتیجے میں کئی لوگ بے روزگار ہو گئے-

''تم پریشان نہ ہونا- میں دوسری ملازمت کی کوشش کر رہا ہوں-'' اب میں نے بے حد جز رسی سے کام لینا شروع کیا- کفایت شعاری تو میں تھی- مگر اب تو ضرورتاً کفایت کرنا پڑی- مہنگائی تھی کہ توبہ- کچھ پیسہ میں نے بچایا تھا- اور کمیٹی بھی ڈالی تھی- جس کی آخری قسط بھی دے چکی تھی- اور وہ اب میرے نام نکل آئی تھی- مگر یہ کاغذی ناؤ کی طرح زیادہ دیر کام نہ آئی- کسی طرح سے دو مہینے گزر گئے- وجیہہ روز صبح سے شام تک ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے وہ رات کو گھر آتے- موٹر سائیکل بک گئی- میری قسمت سوتی رہی- روزی دنیا سے اڑ گئی تھی- مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اتنے دن میں نے خلاؤں میں بسر کیے ہیں-

وجیہہ ایک دن مایوسی سے کہنے لگے- ''میرا تجربہ تعلیم نیک نامی، اس دنیا کے لیے نہیں ہے- کاش میں جاہل ہوتا- اور دن بھر اینٹیں ڈھوتا- زمین کھودتا- روزی تو مل جاتی-''

ایک دن بولے- ''اپنی کوئی فکر نہیں- فٹ پاتھ پر بھی گزر کر لیتا- مگر تم دونوں کو-''

بات پوری نہ ہو سکی- وہ چپ ہو گئے میں دل مسوس کر رہ گئی- میرا کوئی میکہ ہوتا- یا سسرال کا گھر ہوتا- تو میں وہاں چند ماہ تو پناہ لیتی- جب تک وجیہہ کوئی کام تلاش کر لیتے- سسرال میں لے دے کے روشن آپا تھیں- وہ اتنی دور تھیں کہ انہیں اپنے حالات سے آگاہ کر کے پریشان کرنے کو جی نہ چاہتا- میکہ میں اپنی ضد نادانی اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پر کھو چکی تھی- کاش بھیا زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے جاتے مگر وہ میرے سکھ اور آپی کے دکھ دیکھ کر گئے تھے- ظاہر ہے دکھی بہن کی دلجوئی زیادہ ضروری تھی-

''میں آپی سے کہوں- قرض-''

''نہیں-'' وجیہہ تلملا گئے- آصف بھائی کاروباری سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے

تھے- شاید وہ وجیہہ کے لیے کچھ کرتے وجیہہ کی خودداری اسے گوارا نہ کرتی- مگر وہ کوئی کام دلوا سکتے تھے- مکان کا کرایہ بھی ادا نہ ہوا- ہر طرح کی کفایت- سختیاں- صبر و برداشت کے باوجود اب میرا دامن بالکل خالی تھا- باعزت روزگار سے مایوس ہو کر وجیہہ نے چھوٹے چھوٹے کام کر لیے- اخبار فروشی- ایک کاسمیٹکس کمپنی کی ایجنسی- کسی طرح گزر ہونے لگی-

مالک مکان نے قدرے شرافت کا مظاہرہ کیا- مگر وہ گاہے گاہے اپنے احسان کا بوجھ لادنے آ جاتے تھے- میں ہی ان کا سامنا کرتی- وجیہہ کی حالت قابل رحم ہوتی- میں اب صبر کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ کسی وقت بھی شکایت یا تکلیف کا اظہار نہ کرتی- آپی آصف بھائی کے ساتھ بیرون ملک گئی ہوئی تھیں- وہ تو آ گئیں- آصف بھائی اندرون ملک دورے پر نکل گئے- آپی نے مجھے قرض دینا چاہا- میں نے نہیں لیا-

آخر کار میرے زیور کے بکنے کی بھی باری آ گئی- مگر میں نے کسی اچھی امید کی توقع میں رہن رکھنا بہتر جانا- اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنی چاہیے- یہی سبق وجیہہ مجھے پڑھاتے تھے- وہ خود بے حد پریشان اور کمزور ہو گئے تھے- مگر میری ہمت بندھاتے- یہ ایک نئی قسم کی افتاد تھی جس سے آج کل میں مقابلہ کر رہی تھی- مجھے کبھی دولت کی آرزو نہیں رہی مگر پیٹ بھر نے تن ڈھانپنے اور عزت کی روکھی سوکھی کھانے کے بارے میں کافی جذباتی تھی اور آج کل پیسہ نام کی چیز میرے لیے بہت اہم ہو گئی تھی جو بہت کم اور کبھی کبھی نظر آتی- ایک روز وجیہہ نے بہت لجاجت سے کہا-

''اگر آج یا کل مجھے کہیں سے پانچ ہزار روپے مل جائیں تو ایک شاندار موقع میری گرفت میں آ جائے- ٹھیکے کا کام ہے- زرضمانت پانچ ہزار چاہئیں-''

میں دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگی- ''اے اللہ آج تو میری دعا سن لے-'' وہ کسی سے ملنے اور رقم کا بندوبست کرنے باہر نکلے میں سجدے میں گر کر رونے لگی- اللہ کے سوا اور کون تھا جس سے اپنی حالت زار کہتی- رات کے کھانے کے لیے بھی اب گھر میں کچھ نہ بچا تھا- شاید فاقوں کی نوبت- میں خود محنت کروں گی- سلائی- نٹنگ کڑھائی- محنت میں کوئی ذلت نہیں- میں نے ایک عزم کے ساتھ سر اونچا کیا- اور دنگ رہ گئی- آصف بھائی کھڑے تھے-

''میں ابھی آیا ہوں- چھ ماہ سے دورے پر تھا-'' وہ جلدی جلدی بولے-

''آ کر معلوم ہوا- اور بہت فکر مند ہوا- چلو اٹھو-''

''کہاں!'' میں بے اعتباری سے انہیں دیکھنے لگی-

''سنا ہے تم نے اپنا زیور بن رکھا ہے پہلے وہ چھڑا لائیں- اس کے بعد آگے کی بات ہو گی-''

''نہیں آصف بھائی!'' میں نے متانت سے کہا- ''یہ ہمارا مسئلہ ہے- آپ کا نہیں-''

''غیر سمجھتی ہو-'' وہ دکھی لہجے میں بولے- ''تمہارا مسئلہ کیا میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا-''

''آپ کی مہربانی۔'' میں نے کہنا چاہا۔ کہ میرے لیے نہیں۔ اگر ہو سکے تو وجیہہ کے لیے کچھ کر دیں۔

''اچھا۔ تو یہ تو لو۔''..... انہوں نے نوٹوں کی موٹی سی گڈی میرے سامنے پھینک دی۔ میں بوکھلا گئی۔ وجیہہ کے غصے سے ڈر گئی۔ کیا آصف بھائی نہیں جانتے۔

''میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ تمہارے حصے کی رقم ہے۔ ارے بھئی اس قدر پریشان مت ہو۔ میں سمجھا دوں گا۔ ذرا ٹھہرو۔ ابھی ابھی پشاور سے چلا آ رہا ہوں۔ سر چکرا رہا ہے۔ آتے ہی وجیہہ کی بابت سنا۔ تو ویسے ہی چلا آیا۔''

''آپ۔ یہ اٹھا لیجیے۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یہ تمہارے حصے کے منافع کی رقم ہے۔ کاروبار میں تمہارے نام سے رقم لگائی تھی بطور قرض۔ سچ۔ قرض ادا کرنے کے بعد یہ بچا ہے۔ کس قدر کوڑھ مغزی کا ثبوت دے رہی ہو۔'' وہ میرے نہ سمجھنے پر جز بز ہونے لگے۔ ''سمجھی کاروبار میں جو تمہارا حصہ تھا۔''

''آپی کے نام پر کیوں نہیں لگایا تھا۔'' میں سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''لگایا تھا۔ دونوں کے نام سے لگایا تھا، وجیہہ سے پوچھ لینا۔ اس کی اجازت سے تمہارے نام کے شیئر خریدے تھے۔ قانونی مجبوری کی وجہ سے میں اپنے نام سے نہیں خرید سکتا تھا۔ اتنے دن سے ملک سے باہر تھا۔ یورپ سے آیا تو فوراً پشاور مردان وغیرہ جانا پڑا۔ حساب نہیں کر سکا فی الحال اتنے ہی رکھو۔ پھر بعد میں حساب کر لیں گے۔ کیوں؟ یقین نہیں آیا نا۔ قسم کھاؤں تمہارے وجود کی؟ گل کی؟''

مجھے کیسے یقین آتا۔ یہ کیسا کاروبار ہے۔ جس میں میرا شیئر ہے اور میں ناواقف محض۔ میں سوچ میں گم ہو گئی۔ وہ بھی ٹہلنے لگے۔ پھر قدرے رک کر مجھے سمجھانے لگے۔ کس طرح انہوں نے یہ کام شروع کیا۔ اور کتنا منافع ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''میں بھی فرشتہ تو نہیں ہوں۔ انسانی جبلت دوسروں کی مجبوری سے مفاد حاصل کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہی۔ نیک نامی اور شہرت کے لیے آدمی نے آدمی کے ضمیر بھی خریدے۔ مگر میں بے ضمیر نہیں ہوں۔ یقین نہ آئے تو آزما لینا۔ کسی طرح بھی۔ لاکھ تم سے دور رہوں۔ لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس تمہارے نام کے کاروبار کے لیے دو تجویزیں مدنظر تھیں۔ پہلی۔ جب تم نے میری شدید بھوک کا ازالہ کیا۔ اور میں حاتم طائی کے روپ میں کسی انعام دینے کے موڈ میں تھا۔ یہ اسی انعام کی ایک کڑی سمجھ لو۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ میں تم دونوں بہنوں کے مزاج اور فطرت کے فرق کو جاننا چاہتا تھا۔ سوچا دیکھوں۔ بہت سی دولت پا کر کیا تم بھی اتنی بدل سکتی ہو۔ اپنی خصوصیات کا قتل کر سکتی ہو۔ اتنی ہی بے خود بے ضمیر ہو سکتی ہو؟''

دوسرے لفظوں میں وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے اپنے اس حربے سے۔ یا پھر آزمائش کا یہ نیا طریقہ میرے حق میں بہتر ہی ہو سکے۔ میں بہر حال قوت ارادی میں آپی سے زیادہ مضبوط تھی۔

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ چند کاغذات پر دستخط چاہئیں تمہارے۔ تاکہ تم قانونی مجاز ہو جاؤ۔ بینک میں اکاؤنٹ تمہارے نام سے کھلنا چاہیے۔ آئندہ ڈرافٹ کی صورت میں تمہارے منافع کی رقم خود بخود جمع ہوتی رہے گی۔ فی الحال یہ پانچ ہزار تو سنبھالو۔''

وہ سمجھا رہے تھے اور میں گومگو کی کیفیت میں سب سن رہی تھی۔ وجیہہ کا کیا ردعمل ہوگا۔ وہ اس کاروبار سے واقف ہو کر مجھے ڈانٹنے لگے۔ تو۔؟ میں انہیں سمجھا پاؤں گی۔'' آج کل وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ کہیں اپنی نادانی سے انہیں دکھ نہ پہنچا دوں۔

''میں یہ رقم آپ کی امانت کے طور پر رکھ لیتی ہوں۔ اگر وجیہہ نے لینے سے انکار کیا۔ تو میں یہ آپ کو واپس کر دوں گی۔'' میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''تمہاری مرضی۔'' وہ شانے جھٹک کر بولے۔ ''مگر بینک تک تو چلنا ہوگا۔ دستخط کی بھی ضرورت ہے۔ پھر جانے کب موقع ملے۔ مجھے کل پھر دورے پر جانا ہے۔ میں اس طرف سے بے فکر ہو کر جانا چاہتا ہوں۔''

میں جاہل تو نہ تھی۔ اور وقت کے تقاضے مجبور کر رہے تھے کہ میں آصف بھائی سے تعاون کروں۔ اب میں وجیہہ کو سمجھا بھی سکتی تھی۔ اور اگر نہ سمجھا سکی۔ تو اس کاروبار سے لاتعلقی اختیار کر لوں گی۔ یہ سوچ کر جلدی جلدی تیار ہوئی پہلے ہم بینک گئے۔ میرے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر وہ مجھے اپنے آفس لے گئے جہاں میں نے چند کاغذات پر دستخط کیے۔ میرے نام کی فائل الگ رکھی تھی۔ آپی کی الگ۔ میں نے پڑھ کر کچھ کر دستخط کر دیے۔ واپسی میں آصف بھائی نے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں خریدیں۔ مجھے گھر چھوڑ کر وہ فوراً ہی چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی کے باعث آفس میں بہت سا کام ان کی توجہ کا طالب تھا۔ اور کل پھر دورے پر جانا تھا۔ گھر پہنچتے ہی بے بی کے گھر سے گل کو بلایا۔ ساتھ لائی ہوئی چیزوں میں سے کیک بسکٹ اسے کھلائے اور باقی سامان سنبھال کر رکھ دیا۔ پانچ ہزار کی رقم بھی اندر رکھ آئی۔ وجیہہ کتنے خوش ہوں گے ان کو یقین نہ آئے گا کہ یہ رقم میری ہے۔ ان کو خیکیل مل جائے۔ بس یہی اولین آرزو تھی میری۔ اگر وہ آصف بھائی کا احسان لینا پسند نہ بھی کریں تب بھی میں بطور قرض جلد ادائیگی کی بنیاد پر انہیں لینے پر مجبور کر دوں گی۔ یہ تائید غیبی ہے اور اس سے منہ موڑنا ناشکری۔

بہت بے تابی سے میں وجیہہ کا انتظار کرنے لگی۔ وہ منہ پھیر کر آئے۔ بہت تھکے اور پژمردہ تھے۔ میں نے بھی فوراً ہی کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی خوشی پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ آتے ہی انہوں نے گل کو گود میں لے لیا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ پھر مجھے بھی اشارے سے پاس

بلا کر کہا-

''تم اتنی دور نہ رہا کرو- آج کل میں تم دونوں کی دوری سے پریشان ہو جاتا ہوں- تم میری موجودگی میں کوئی کام کر رہی ہوتی ہو- تو مجھے اس کام سے حسد ہو جاتا ہے- جیسے یہ کام تمہیں مجھ سے دور رکھ کر میری اہمیت کو چیلنج کر رہا ہو-''

مجھے ہنسی آنے لگی- ''تمہاری مسکراہٹ ہی تو میرا حوصلہ بحال رکھتی ہے- کبھی کبھی جی چاہتا ہے گھر سے نکل کر دور چلا جاؤں- سر پھوڑ لوں- احساس سے بے گانہ ہو جاؤں پھر خود کو سنبھالتا ہوں کہ کہیں میری بے گانگی تم دونوں کے دل دکھنے کا باعث نہ بنے- دکھوں کے زمانے میں رشتے بہت حساس لگتے ہیں- جیسے آئینہ ہو- ذرا سے غبار سے دھندلا جاتا ہے- ذرا سی چوٹ سے چٹخ جاتا ہے-''

وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے- میں تائید میں سر ہلاتی رہی- ''تم میرے گلشن حیات کی بہار ہو- تم مجھ سے کبھی نہ روٹھنا- کبھی جدا نہ ہونا- تم روٹھیں تو زندگی روٹھ جائے گی- اور آج کل مجھے اپنی زندگی بہت پیاری لگنے لگی ہے- تم دونوں کی وجہ سے- جانتی ہو نا؟''

میں نے پھر گردن کے اقرار سے کام لیا- جانے کیوں زبان بند تھی- جذبات کا غلبہ تھا- ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا- جب بھی کچھ بولنے- کچھ کہنے کا موقع آتا- میری زبان پر اسرار طور پر بند ہو جاتی- اپنے صحیح جذبات کو زبانی ادا کرنا میں نہ جانتی تھی- یا مجھے اس کا سلیقہ ہی نہ تھا-

''دکھ کے دن بہت جلد بیت جائیں گے-'' وہ میرا شانہ تھپکتے ہوئے مجھے بہلا رہے تھے- ''بس کچھ دن کی تکلیف اور ہے- اللہ تعالیٰ تمہارے صبر اور میری کوششوں کا اجر ضرور دے گا- تھوڑے دن کی تکلیف برداشت کر لو گی نا-'' میں نے پھر سر ہلا کر اعتراف کیا- اور ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کمرے میں آ گئی- موقع آ گیا تھا- اب میں پانچ ہزار روپے ان کے قدموں میں رکھ دوں گی- الماری سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر میں نے دوپٹے کے پلو میں چھپا لیا-

''میرا بریف کیس لیتی آنا-'' انہوں نے پکار کر کہا- میں بریف کیس لے کر باہر گئی- اور سوچنے لگی- ابھی دے دوں؟ کیسے دوں- ان کے سوال کا جواب کیسے دوں گی- ہمت جمع کر رہی تھی گلا خشک ہو رہا تھا- انہوں نے کچھ کہا تھا- میں نے سنا نہیں- یونہی میز کے پاس جا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی-

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ارے بھئی میری چپل لا دو-'' میں نے تیزی سے چپل لا کر دی- ذہن میں مستقل پانچ ہزار روپے کا خیال تھا- اب ہاتھ بھی پسینے لگا تھا-

''کیا بات ہے- وہ میرے قریب آ کر غور سے مجھے دیکھنے لگے- اور تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ کس سوچ میں ہو- یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں آخر کس لیے-؟ میں پوچھ رہا ہوں کہ آپا کا کوئی

خط تو نہیں آیا- اور تم کبھی چمچہ ہاتھ میں پکڑتی ہو- کبھی تولیہ- اور یہ دوسرے ہاتھ کو کیا ہوا ہے-''

وہ ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ دوپٹے کی قید سے آزاد کرنا ہی چاہتے تھے کہ دروازے کی ٹہوکر دستک سن کر پیچھے ہٹ گئے- ''دیکھو- کون آیا ہے-'' ایک لمبا سانس لے کر انہوں نے کہا-

دروازہ کھلتے ہی آندھی طوفان کی رفتار سے آپی اندر داخل ہوئیں- ''بس- آج میں فیصلہ کر کے جاؤں گی- بہت ضبط کر چکی- اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے-'' وہ گھستے ہوئے بولنے لگیں- ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو کر سیاہ پڑ چکا تھا آنکھوں میں غیض وغضب کے شرارے اور نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے-

''کیا ہوا آپی؟'' میں ایک دم پریشان ہو گئی- دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی-

''پوچھتی ہو کیا ہوا- یہ کہو کہ کیا نہیں ہوا- واہ اچھی معصومیت ہے-'' ان کی صورت شدت اشتعال سے بگڑنے لگی- سخت جلال میں تھیں- یوں تو میں نے انہیں اپنے لیے اکثر جلال کی صورت میں دیکھا تھا- مگر آج غصے کے ساتھ شکست کا ملال بھی ان کے چہرے پر سیاہی بن کر پھیلا ہوا تھا- جیسے کسی نے ان کی ساری پونجی ہی چھین لی ہو-

''مگر پتا تو چلے-'' میں کانپتے ہوئے بولی-

''ابھی بتاتی ہوں- یہ بتا- اجاڑنے کے لیے میرا ہی گھر رہ گیا تھا- میرے سہاگ پر ڈاکہ ڈالنے سے پہلے تجھے اپنے ماں باپ کا خیال بھی نہ آیا- میں تیری جان لے کر ہی جاؤں گی-'' انہوں نے لپک کر میرے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے میں ہکا بکا ان کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی صورت ہی تکتی رہی-

''فوزیہ!'' وجیہہ نے کمرے سے باہر آ کر غصے سے کہا ''تم ہوش میں تو ہو-''

''ہاں ہاں- میں ہوش میں نہیں ہوں- میرے ہوش تو اس معصوم بہن نے اڑا لیے- میرا چین میرا سکون برباد کر دیا- میرا سہاگ چھین لیا- بچپن سے ہی یہ میرے راستے کا روڑا بنتی رہی- اور اب آصف کو بھی اس نے مجھ سے چھین لیا-'' انہوں نے میرے بالوں کو جھٹکا دیا- وجیہہ نے ان کے ہاتھوں سے رہائی دلوائی-

''بکواس مت کرو-'' انہوں نے دھیمی آواز میں سخت لہجے سے آپی کو ڈانٹا-

''تمہیں سننی پڑے گی میری بکواس- میرے میاں کو اپنی معصوم اداؤں سے رجھانے والی- تنہائی میں ان سے مل کر اپنے حسن کا جادو کرنے والی ڈائن-'' آپی کی آواز زخمی شیرنی کی طرح بہت بیت ناک تھی- رگوں میں خون سرد کر دینے والی-

''آج بھی- ان کے ساتھ گھومتی رہی- بینک میں اکاؤنٹ کس نے کھلوایا؟ آصف نے-؟ ان کے ساتھ آفس کے بند کمرے میں کیا ہوتا رہا؟ مجھے بتاؤ- چھ ماہ بعد آتے ہی وہ گھر میں آنے کے بجائے یہاں دوڑے آئے-؟ ترس گئے تھے نا- اس لیے بتا مجھے- کیا سمجھوتا ہوا ان سے- اپنی

مفلسی - فاقوں کی داستان سنا کر کیا وصول پایا تو نے؟''

''آپی!'' میں کھوئی ہوئی طاقت اور حواس قابو میں کرنے کی کوشش میں اور نیم جان ہوگئی - ان کی قہقہے کی طرح چلتی زبان کے سامنے کچھ بولنے سے معذور ہوگئی - بمشکل الفاظ منہ سے نکلے -

''آپی! آپی بس کرو'' اور نڈھال ہو کر رو دی -

''بس کروں - کیوں ابھی سے بس کروں'' آپی وجیہہ کی طرف مڑ گئیں'' شادی سے پہلے اس نے ان پر ڈورے ڈالے تھے کہ نہیں - گواہ ہو تم بہت سے''

''چپ رہو'' وجیہہ نے سختی سے کہا - ''پرانی بات کا حوالہ مت دو''

''کیوں نہ دوں - پہلے دن سے ہی وہ مجھے نظر انداز کرتے رہے - اس کا جادو آج بھی ان کو پاگل بنائے دیتا ہے'' آپی غرائیں - ''جب میں ابا کے بلانے پر چلی گئی تھی تب بھی انہیں خوب موقعے ملے تھے - وہ تمہارے گھر راتیں گزارتے تھے کہ نہیں - کیسے مرد ہو تم''

''فوزیہ!'' وجیہہ سے برداشت نہ ہو سکا تو بھرائی ہوئی آواز میں چیخ پڑے - ''تم جاؤ - میرے گھر سے نکلو''

''نہیں جاؤں گی - نہیں نکلوں گی - تم فیصلہ کرو - یہ تمہاری بیوی ہے یا آصف کی - ؟''

میں تھر تھر کانپتی ـــــ زمین پر گرنے لگی - زمین شق تو نہیں ہوئی - مگر میں پھر جمی اس میں سمانے کی کوشش کرنے لگی - کوئی پردہ - کوئی اوٹ - اے کاش - میں اپنا وجود سب سے چھپا سکتی -

''تم - خود جیسی ہو - ویسا ہی دوسرے کو سمجھتی ہو'' میں نے وجیہہ کی آواز سنی -

''میں جیسی ہوں - سب کے سامنے کرتی ہوں - میاں سے چھپ کر عاشقوں سے ملاقاتیں نہیں کرتی - بند کمروں میں -'' آپی کی نفرت بھری آواز میرے کانوں میں سیال تیزاب انڈیل رہی تھی - کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے - میرا وجود ذرہ ذرہ ہو کر فضا میں گم ہو رہا تھا - بے بسی نے غم کی زیادتی شرم کی فراوانی نے مجھ سے آنسو بہانے کی قوت بھی چھین لی -

''آپی'' میں زور سے چیخی - ''میں تم کو مار ڈالوں گی -''

''میں بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی'' انہوں نے پہل کی - وہ طاقتور تھیں - انہوں نے مجھے بری طرح گھسوٹ ڈالا - ان کے اچانک حملے سے میں بچ نہ سکی - میرے ہاتھ سے نوٹوں کا بنڈل کھل کر گرا - انہوں نے فوراً اٹھا لیا -

''اچھا - تو یہ اجرت ملی ہے آج - ؟''

میں ان کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھی مگر آواز کا فاتحانہ غرور - طنز اور اطمینان لہجے سے ہویدا تھا - میں چونک گئی - حالات کا یہ خطرناک موڑ - میں نے آنکھیں پھاڑ کر وجیہہ کو دیکھنے کی کوشش کی - وہ کمرے کے دروازے کو پکڑے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوٹوں کو دیکھ رہے تھے - ان کا چہرہ

سفید پڑ گیا تھا اور جس ہاتھ سے انہوں نے دروازے کی چوکھٹ کو تھاما ہوا تھا - اس کی انگلیاں بھی سفید ہو گئی تھیں - پوری طاقت سے وہ چوکھٹ پکڑے ہوئے تھے - جیسے گرنے سے بچنا چاہتے ہوں - برسوں پہلے میں نے اس کیفیت میں وجیہہ کو دیکھا تھا - تو ان کی دلی کیفیت جان نہ سکی تھی - لیکن اب سمجھ رہی تھی -

''میں - میں نے یہ - ٹھیکے کے لیے - آپ کے لیے -''

ٹوٹے پھوٹے جملے سے میں وجیہہ کو بتانا چاہتی تھی - کہ میں انہی کی پریشانی کے لیے یہ غلطی کر چکی ہوں - مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا - وہ انجان نہ تھے - میری رگ رگ سے واقف تھے میرا ان کا اتنے برسوں کا ساتھ ایسا نہ تھا کہ وہ میرے اوپر لگائے بہتان کو سچ جان لیتے - دراصل آج پھر مجھ سے غلطی ہو گئی تھی - مجھے سب سے پہلے ان کو اس رقم کے بارے میں بتانا چاہیے تھا -

''اوہ - تو یہ ٹھیکے کے لیے ان سے لیے ہیں -'' آپی پھنکاریں مار رہی تھیں - ''خوب -'' وہ زہریلی ہنسی ہنسیں - ''مجھ سے مانگتی تو میں یونہی دے دیتی - یہ چھوٹی سی رقم - خودداری بیچ کر اب پچھتا رہی ہے کیا؟''

انہوں نے بنڈل زمین پر ڈال دیا - وجیہہ نے دروازہ چھوڑ دیا تھا - اور صحن کی طرف جانے لگے - میں نے بے تاب ہو کر ہاتھ بڑھایا - میں روکنا چاہتی تھی - زبان تالو سے چمٹ گئی تھی - بول نہ سکی - تو ہاتھ بڑھا کر ان کو روکنا چاہا وہ میرے قریب سے گزرے - ٹھوکر مار کر نوٹوں کو دور پھینکا اور باہر نکل گئے - نوٹ صحن میں بکھر گئے - میں بے جان ہو کر زمین سے چمٹ گئی -

---

اس بات کو کتنے ہی سال گزر گئے ہیں - مجھے آج بھی سب کچھ یاد ہے - ایک ایک کر کے سارے نوٹوں کو سمیٹنا کرنے میں گل نے میری مدد کی تھی - آپی وجیہہ کے پیچھے چلی گئیں - وہ تو آج مجھے برباد کرنے ہی آئی تھیں اپنے احساس کمتری کا انتقام لینے - وجیہہ کی نظروں میں میرا وقار گوانا ہی ان کا مقصد تھا وجیہہ صبح کے بھوکے پیاسے ایسے ہی چلے گئے تھے - میں خود کو کوستی رہی - کاش میں نے ایک لمحہ انتظار کیے بغیر پہلے ان کو کچھ کھلا پلا دیا ہوتا - وہ پوچھتے یہ سب کہاں سے آیا - میں بتا دیتی آصف بھائی گل کے لیے لائے تھے - وہ پہلے بھی کچھ نہ کچھ لے آتے تھے - پھر میں ان پانچ ہزار کے بارے میں بتاتی - تب شاید آپی کے الزام کا تاثر اتنا شدید نہ ہوتا - کیا انہوں نے یقین کر لیا؟ کیا وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے؟ نہیں - نہیں وہ آئیں گے مجھ سے پوچھیں گے - ان کا غصہ اتر جائے تب آئیں گے - میں سب کچھ بتا دوں گی - انہیں یاد آ جائے گا آصف بھائی نے انہی کی اجازت سے میرے نام کے شیئر خریدے - گو کہ میں اس رقم کی حقدار نہ تھی - مگر ان حالات میں شاید وہ اسے غنیمت سمجھ لیتے - وہ کہاں گئے - میں ان کے انتظار میں جاگتی رہی -

رات بھاگتی رہی- وہ نہیں آئے- اور فکر سے بے حال میں روتی دعائیں مانگتی رہی- دل تڑپتا اور دھڑکتا رہا- جسم پسینے پسینے بھیگتا رہا- نہ صرف میں خود بلکہ گل اور عقریب دنیا میں آنکھیں کھولنے والا بچہ بھی میری حماقتوں کی سزا پاتے رہیں گے- میں مرنا چاہتی تھی مگر اس وقت تک نہیں جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ وجیہہ- میرے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں- اپنی نادانیوں کا جتنا بھی ماتم کروں کم ہے- میں نے آج تک وجیہہ کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ کچھ ہی دن بعد ہم دوسرے گل کے وارث بننے والے ہیں- چاہتی تھی کہ پہلی بار کی طرح کسی خوشی کے موقع پر یہ خبر ملے- مگر اب میری یہ خواہش بھی مایوسی کی نذر ہو چکی تھی-

رات گزرتی رہی- بے قراری اور اضطراب بڑھتا گیا- دعائیں مانگ مانگ کر حلق خشک ہو گیا- ٹیلتے ٹیلتے ٹانگیں شل ہو گئیں- جاگتے جاگتے آنکھیں تھک گئیں- آنسو بھی خشک ہو گئے- تو صبح کی اجلی روشنی نے صحن میں چپکے سے جھانکا- ایک ستارہ زور زور سے پلکیں جھپک رہا تھا- صبح کی نوید سنانے والا ستارہ- میری امید کا روشن تارا- تب مجھے ایک نئے خدشے نے تڑپا دیا- کیا وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے- میں نے صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا- انہیں مجھ سے نفرت ہو گئی تھی کیا؟ انہیں یہ بھی خیال نہیں آیا کہ رات کی تاریکی اور تنہائی میں ان کی نازی خوف زدہ ہو کر روتی رہے گی وہ میری وجہ سے' میری تنہائی کے خیال سے کبھی رات باہر نہیں گزارتے تھے-

صبح ہو گئی تھی مگر فکروں پچھتاووں اور اندیشوں کے اندھیرے ہڑپ کرنے کے لیے آگے ہی آگے بڑھتے آ رہے تھے- میرے خدا- رحم- صبح دستک کی آواز سن کر بے قراری سے دروازہ کھولا- خالہ جی اور بے بی تھیں- میں نے ان کو وجیہہ کے رات نہ آنے کا بتایا- وہ بھی بہت فکر مند ہوئیں- بے بی نے گل کو ناشتہ کرایا- اور مجھے بھی- دونوں تسلیاں دیتی رہیں- شاید میری ظاہری حالت بہت خراب تھی- میں تھکن سے چور صحن میں دیوار کی آڑ میں پلنگ پر گر گئی- شاید اونگھ گئی تھی- آوازوں سے جاگ اٹھی-

وجیہہ آ گئے تھے- ان کے دوست انہیں لے کر آئے تھے- ان کے سر بازو اور ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں- رنگ زرد اور نقاہت سے آنکھیں بند- میں بے جان سی دیکھتی رہی- دوست نے بتایا رات کو ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا- ہاسپٹل میں ہوش آیا- خون بہت بہہ گیا تھا- دوست کا فون نمبر نرس کو دیا- تب وہ ہاسپٹل پہنچے- اور انہی کی ضد پر گھر لائے- ورنہ ابھی انہیں دواؤں دیکھ بھال کی سخت ضرورت تھی- ڈگمگاتی ہوئی میں کمرے میں گئی- گل ان کے پاس بیٹھا تھا اور وہ اس کا ہاتھ چوم رہے تھے- میری آواز میرے قدموں کی چاپ پر بھی مڑ کر نہیں دیکھا- بلکہ گل سے کہا-

''جاؤ بیٹا- ہم رات بھر جاگے ہیں اب سوئیں گے-''

اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے- میں نے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی- مگر سینے میں ایک شور بپا

تھا- آنکھوں میں طوفان- آنسو بہاتی واپس آ کر پلنگ پر گر گئی- یہ بھی انہیں نہ بتا سکی کہ میری رات بھی تو آنکھوں میں گئی ہے- اس کے بعد کئی بار کمرے میں گئی- وہ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے- میری آواز بھی سننا نہیں چاہتے تھے- دوا لے کر گئی تو منہ پھیر کے کہا-

''رکھ دو- پی لوں گا-''

بے بی نے ہی انہیں دوا پلائی- جب میں بے قرار ہو کر باورچی خانے میں دوپٹہ منہ میں دبا کر چیخیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی تب بھی بے بی نے مجھے پانی پلایا- اور سمجھایا کہ بھائی جان جلدی ٹھیک ہو جائیں گے- شکر ہے کہ ہڈیاں سلامت ہیں- صرف زخم آئے ہیں- خالہ جی نے بھی تسلیاں دیں کہ وقت بہت بے رحم ہوتا ہے- مگر اس نے اتنا رحم تو کیا کہ تمہارا سہاگ سلامت ہے- اور معمولی چوٹوں کے سوا کوئی بڑا زخم بھی نہیں-

میں انہیں کیا بتاتی- ان کے زخمی ہونے کا مجھے اتنا غم نہیں- مجھے تو ان کی نفرت' بے رحمی کا انداز مارے ڈال رہا ہے- ارے کچھ تو کہتے- برا بھلا- نفرت غصہ نکالتے مجھے مارتے- مگر یہ ان کی خاموشی اتنی بے رحم تھی کہ اس کے زخموں کی گہرائی مجھے تڑپائے دیتی تھی- دو دن ہو گئے نہ انہوں نے میرے ہاتھ سے دوا کھائی- نہ چائے پی- نہ ہی مخاطب ہوئے- وہی طرز عمل- مجھے دیکھ کر کروٹ بدل لیتے یا آنکھیں بند کر لیتے- رو رو کر اب میں بھی مذ رہو گئی جب بھی صفائی دینے کے لیے الفاظ منتخب کرتی- کچھ کہنا شروع کرتی- وہ بے چینی سے ہاتھ ہلاتے- اور پھر حرکت کے سبب ان کی چوٹوں اور زخموں میں درد ہونے لگتا- زور زور سے کراہنے لگتے- میری آواز دب جاتی-

پھر میں نے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا- خالہ جی اور بے بی دن بھر ہمارے گھر رہتیں- انہوں نے مالک مکان کو کرایہ ادا کیا اور ایڈوانس بھی دے دیا تا کہ وہ مزید پریشان نہ کرے- ان کے اس احسان پر میں رو دی اور وجیہہ نے بھی ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا- ان کی پلکیں بھیگ گئیں- ہونٹ کانپنے لگے- خالہ جی متاثر ہو گئیں- بولیں-

''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے بیٹا- اور پڑوسی کا حق تو رشتے داروں سے بھی زیادہ ہوتا ہے- بے بی کا پرائز بونڈ تمہاری قسم سے نکل آیا ہے- اس کی کمیٹی بھی آ گئی ہے-''

اس نیک دل سیدانی بی بی نے ہمیں فاقوں سے بچا لیا- اور سر کا سائبان بھی قائم رہا- وجیہہ کے زخم بھر گئے تھے- چوٹوں میں البتہ تکلیف باقی تھی- بے بی اور خالہ جی کو میں تشکر کے آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہ دے سکی- مگر ان کی شرافت' عظمت اور شخصیت نے مجھے بہت حوصلہ دیا- بے بی اور خالہ جی اب اپنے گھر چلی گئی تھیں ان کے جانے کے بعد گھر میں ہولناک سناٹا طاری ہو گیا- گل ہوتا تو اس کی معصوم آوازیں زندگی کی صدا بن کر امید کے نغمے الاپتی- معلوم ہوتی- کبھی میں ہمت کر کے وجیہہ سے کہتی-

''صرف ایک بار میری بات سن لیں۔''

وہ تندی سے کہتے۔''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔''

''آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ دوسرے جب بھی بہتان باندھیں گے۔ آپ اس جھوٹ کو سچ مان لیں گے؟''

''میں کچھ کہتا ہوں؟'' وہ ایسی آواز میں یہ بات کرتے کہ پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ میری عقل گم تھی کس طرح اپنی جنت کو پاؤں۔ کیسے آواز دے کر زندگی کی گزرتی مسرتوں اور ساعتوں کو واپس لاؤں۔ کاش یہ خواب ہوتا۔ وجیہہ اب لکڑی کے سہارے باہر جانے لگے تھے جب واپس آتے۔ گل کے ہاتھوں مجھے پیسے بھجوا دیتے پتا نہیں کون سا کام کرتے تھے۔ ان کی حالت اب کام کرنے کی نہیں تھی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ چہرے کی رنگت بھی پیلی پیلی تھی۔

اس دن وہ دوپہر کو آئے۔ اور کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ گل نے مجھے تھیلا لا کر دیا۔ جس میں کچھ سبزی تھی اور گوشت کے علاوہ مغز بھی تھا۔ وجیہہ کو مغز بہت پسند تھا۔ میں نے مغز پکانے کے خیال سے دیگچی چولہے پر رکھی ہی تھی کہ صحن میں آہٹ سی ہوئی۔ آصف بھائی اندر آ رہے تھے۔ بہت تیزی سے میں باہر آئی۔

''ابھی ابھی وجیہہ کے بارے میں سنا ہے۔'' ان کی رنگت بھی اڑی ہوئی تھی۔ چہرہ فق ہو رہا تھا۔''اب کیسی طبیعت ہے۔ ہے کہاں وہ۔ کمرے میں۔؟ کیا سو رہا ہے؟''

''آپ۔!'' میں نے غصے کو دباتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔''فوراً یہاں سے چلے جائیے۔''

وہ اپنے سوالات کے جواب میں ایسی پھٹکار سن کر ہکا بکا ہو گئے۔

''کیا کہہ رہی ہو نازی؟'' پھٹی ہوئی آنکھوں میں تعجب اور الجھن لیے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''خبردار۔ میرا نام آپ کی زبان پر نہ آئے'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔''فوراً چلے جائیے۔''

''میں نے۔ کیا کیا ہے۔'' وہ اس قدر سہم گئے کہ کوئی اور وقت ہوتا تو مجھے ان پر ترس آ جاتا۔ مگر میں اپنی بگڑی ہوئی قسمت کو مزید نہیں خراب کرنا چاہتی تھی اس لیے چلا کر بولی۔''کیا کیا ہے۔ مجھے آپ نے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میرا سکھ میرا گھر برباد کر دیا۔ اور اب۔'' آواز بھرا گئی۔ میں رک گئی۔

''میں نے؟ میں نے؟'' وہ حیرانی سے اپنی جانب اشارہ کر کے بولے۔

''ہاں۔ آپ نے۔ اور آپی نے۔ ہمیں مار ڈالا۔'' میں کہتی ہوئی کمرے میں گھسی۔ وہ جسم میں طاقت نہ ہونے کے باعث وہیں پلنگ پر بیٹھ گئے تھے۔ کمرے میں وجیہہ سر کو تھامے کرسی پر بیٹھے

تھے۔ میں نے الماری سے نوٹوں کا وہ قیمتی بنڈل نکالا۔ باہر لا کر آصف بھائی کے سامنے پھینک دیا۔

''لے جائیے اپنی یہ دولت۔ جس نے میری خوشیاں نگل لیں۔ پلیز۔''

''میں وجیہہ سے مل کر جاؤں گا۔'' وہ کھڑے ہو کر ایک عزم سے بولے۔ ان کی آنکھوں میں اب وہ مردنی بھی نہیں تھی۔ وہ کمرے کی طرف بڑھے۔ تو میں راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

''نہیں ملیں گے آپ۔''

''اسے کیا ہوا ہے؟'' وہ زور سے بولے۔

''کچھ نہیں ہوا ہے؟'' میں بھی زور سے بولی۔''صرف میں مر گئی ہوں۔ اور آج بھی۔ ماضی کی طرح میرا دامن آپ کی وجہ سے داغدار ہو گیا ہے۔ آپ چلے جائیے۔ بس۔ مجھے اور ذلیل مت کیجیے۔''

وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر مڑے اور باہر چلے گئے۔ میں کانپتی ہوئی کچن میں آئی۔ چولہا جل رہا تھا۔ اور اس پر رکھی خالی دیگچی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میرے سینے میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں میرے دل میں بھر گیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگیں اور میں بے تحاشا آنسو بہاتی ہوئی دیگچی زمین پر ڈال کر کمرے میں آ گئی۔

وجیہہ سارا دن کہنی میں چہرہ چھپائے لیٹے رہے۔ گل نے بتایا ابا کو بخار ہے۔ میری اور آصف بھائی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ انہوں نے سنا تھا۔ مگر اس میں بھی کہیں میری بے گناہی کا ذکر نہ تھا۔ اب میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا بھی نہ چاہتی تھی۔ وجیہہ کا بخار بڑھتا گیا۔ اور وہ روزانہ کی چند روپوں کی آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ اب علاج کے لیے کچھ باقی بچا نہ کھانے کے لیے۔ خالہ جی روز کچھ نہ کچھ پکا کر لے آتیں۔ پیٹ کا ایندھن کتنا بے نیاز ہے۔

وجیہہ کے ایک دوست ملنے آئے۔ ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ فوراً جا کر اپنے عزیز کو بلا لائے جو بہت مشہور ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے تفصیل سے معائنہ کیا۔ چند ہدایتیں دیں۔ دوائیں بھی اپنے کلینک سے خود بھی بھیج دیں۔ مگر دوائیں پیٹ تو نہیں بھرتیں۔ مجھے کمزوری سے چکر آنے لگے تھے۔ دو قدم چلنا دشوار ہو گیا آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا۔ پھر بھی وجیہہ کے لیے رات آنکھوں میں کاٹ دیتی وہ بھی بہت بیمار بہت کمزور تھے۔ رات کو ہولے ہولے کراہتے۔ تو جی چاہتا اپنی صحت ان کو دے دوں۔ سارا خون ان کے جسم میں منتقل کر دوں۔ مگر میرے جسم میں بھی اب خون نہیں رہا تھا۔ صبح خالہ جی آ کر مجھے زبردستی لٹا دیتیں۔ اور خود گھر کی ذمہ داری وجیہہ کی تیمارداری سنبھال لیتیں۔

وجیہہ کو غفلت سی ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا یہ غفلت ان کے لیے مناسب نہیں۔ خطرناک

ہے-ان کے لیے بہترین غذا کا انتظام کیجیے- یہ کمزوری غذا سے ہی دور ہوگی-

میں انہیں کیسے بتاتی- بہترین غذا تو دور کی چیز ہے ہم بدترین غذا کے لیے ترستے ہیں-مگر میں ایسے خیال پر بعد میں دل میں توبہ کرتی جیسا بھی تھا- اللہ نے ہمارے لیے خالہ جی کے روپ میں ایک فرشتہ تو دے دکھا تھا- میں تو ان کے احسانات شاید کبھی نہ اتار پاؤں- بے بی نے مجھے کہیں سے سلائی لا دی تھی- دن میں جب خالہ جی وجیہہ کے پاس ہوتیں اور وہ سمجھتے کہ میں سو رہی ہوں- میں اور بے بی دوسرے کمرے میں سلائی کرتے- اللہ نے وجیہہ کے لیے غذا کا بندوبست کر ہی دیا- اب روز سلائی آ جاتی- اور میں آرام کیے بغیر اس میں مشغول رہتی-

وجیہہ کی بیماری رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی- بخار نارمل رہتا مگر چڑچڑا پن بدمزاجی حد سے زیادہ بڑھ گئی ویسے وہ سہارے کے بغیر بیٹھ نہ پاتے- مگر میرا سہارا گوارا نہ تھا-

اب تو کبھی کبھی گل کو بھی جھڑک دیتے- یا تھپڑ مار دیتے- مجھے دھکا دینا- میرا ہاتھ جھٹک دینا تو معمول تھا وہ اپنے یا کھانے پر بھی نخرے کرتے- صرف خالہ جی کے ہاتھ سے خاموشی سے کھا پی لیتے-

ایک دن عجوبہ ہو گیا- میری زندگی بھی کیسے کیسے عجوبوں سے بھری ہوئی تھی- اب تو میں ہر بڑی سے بڑی اور بری سے بری خبر سن کر بھی متعجب نہ ہوتی- اپنے لیے ہر قسم کی مصیبت کے لیے تیار رہتی- میں گل کے کپڑے دھو کر الگنی پر ڈال رہی تھی کہ دروازہ کھلا- آگے اماں اور ان کے پیچھے ابا نے صحن میں قدم رکھے- میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا- یہ کیسا مذاق میری قسمت نے میرے ساتھ کیا تھا- جب میں اماں ابا کے لیے تڑپتی تھی- اپنا سکھ اپنی پر بہار زندگی انہیں دکھانے کے لیے بے چین ہو جاتی اور دل مسوس کر قسمت کو الزام دینے لگتی- تب تو اماں ابا نے میری جانب سے آنکھیں اور کان بند کر لینے کی قسم کھائی ہوئی تھی- اب جبکہ میں ہر ایک سے چہرہ چھپا رہی تھی تو وہ آ گئے- کیوں؟ مجھے ایسا لگا کہ اب ساری دنیا مجھے ذلیل کرنے پر تل گئی ہے- اور اس ذلت سے خود کو محفوظ رکھنا ہی میرا پہلا مقصد ہونا چاہیے- میں نے جھپٹ کر گل کو گود میں اٹھایا- اور بھاگ کر کمرے میں گھس گئی- اندر سے کنڈی لگا لی- گل اب بڑا ہو گیا تھا اور میں- بیمار اور کمزور- میں نڈھال ہو کر دروازے کے پاس ہی بیٹھ گئی اور ہانپنے لگی- باہر سے اماں آوازیں بھی دے رہی تھیں- ابا خدا رسول کے واسطے دے کر خوشامدیں کر رہے تھے- وجیہہ بار بار کمزور آواز میں کہتے-

''کھول دو- دروازہ کھول دو-'' اماں رو رو کر اپنے قصور معاف کرا رہی تھیں- ایسا لگ رہا تھا- زمین سے آسمان تک اماں کی درد بھری فریادیں گونج رہی ہیں- کتنے برس بعد میں نے یہ محبوب آوازیں سنی تھیں- مگر میں آنسوؤں سے بھرائی ہوئی ان آوازوں کو پہچان کر بھی نہیں پہچان رہی

تھی- اماں کی روتی بلکتی صدائیں دہائی دیتی التجائیں بھی مجھ پر اثر نہ کر سکیں- میں آنسو نہ روک سکی- وجیہہ کے پلنگ کی پٹی پر سر ٹیک کر بلک بلک کر رونے لگی- گل بھی زار و قطار رو رہا تھا اور دستک بڑھتی جا رہی تھی-

''نہیں کھولوں گی دروازہ- اب یہ دروازہ بند ہو چکا ہے-'' میں رو رو کر کہتی رہی-

وجیہہ نے کمزور آواز میں کہا- ''کھول دو- میں نے ہی انہیں بلوایا ہے مل تو لو-''

میں روتی اور سر ٹکراتی رہی- ''نہیں میں نہیں ملوں گی کسی سے- میں سب کے لیے مر چکی- اور اب یہیں مرنا چاہتی ہوں- تمہارے پاس ہی مروں گی میں- کہیں نہیں جاؤں گی- کسی سے نہیں ملوں گی-''

دروازہ گھنٹے تک بند رہا- وہ دونوں میرے دروازے سے ناکام لوٹ گئے تھے- میں بے سدھ ہو کر بستر پر گری- تو ہوش نہ رہا- بخار ہو گیا- کمزوری بڑھتی ہی جا رہی تھی-

''میں چاہتا تھا- یہ دونوں چلے جاتے- نازی اپنے اماں ابا سے بہت دن سے نہیں ملی-'' وجیہہ کسی سے کہہ رہے تھے-

''کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا؟'' خالہ جی کی آواز میں نے سنی ''تمہیں اس حال میں چھوڑ کر وہ کیسے چلی جائے-''

''وہ بھی تو بہت کمزور ہے خالہ- اسے بھی آرام کی ضرورت ہے- بخار رہتا ہے اسے-''

''میٹا جی- بیوی کا سکھ پیمن آرام سب شوہر کے قدموں میں ہوتا ہے- تم فکر نہ کرو- میں کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی-''

اور خالہ جی مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں بے بی ساتھ تھی- خالہ جی کو کوئی ملنے والی مل گئیں وہ ان کے ساتھ چلی گئیں- بے بی کے رشتے کے لیے وہ ہر وقت ہر جگہ جانے کو تیار رہتیں- بہت فکر مند تھیں- ڈاکٹر نے طاقت کی دوائیں ٹانک، انجکشن، کیپسول جانے کیا کیا لکھ دیا- خون کی کمی تھی- کیلشیم کی کمی- ایک انجکشن لگوا کر باہر نکلی تو چکرا گیا- بے بی جلدی سے کلینک کے اندر میرے لیے پانی لینے چلی گئی- کار کے بریک چرچرائے- نظر اٹھا کر دیکھا- آصف بھائی کار سے اتر رہے تھے-

''خیریت تو ہے؟'' کافی پریشان لگ رہے تھے-

''بیمار ہوں-''

''کب سے؟ بہت کمزور لگ رہی ہو'' وہ تاسف سے کہہ رہے تھے-

''آپ لوگوں کی مہربانی-'' میں تلخی نہ چھپا سکی-

''تمہاری آپی سے سب اگلوا لیا ہے میں نے-'' آصف بھائی نے بتایا- ''ان کا دماغ خراب

ہے۔مگر تم تو صحیح الدماغ ہو۔اگر تم مجھے وجیہہ سے مل لینے دیتیں تو حالات کافی سدھر جاتے۔''

''مجھے اب سدھرنے بگڑنے کی پروا نہیں رہی۔''میں بڑبڑا کر رہ گئی۔بے بی پانی کا گلاس لے آئی آصف بھائی کو دیکھ کر ٹھٹھکی۔پھر گلاس مجھے دیتے ہوئے بولی۔

''میں اس میں گلوکوز بھی ملوا لائی۔''وہ گلاس واپس لے گئی تو آصف بھائی وجیہہ کی طبیعت کا پوچھنے لگے۔پتا نہیں میں نے کیا جواب دیا۔میں بے ہوش ہونے والی تھی۔بے بی آ گئی تو مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

''میں چھوڑ آؤں گا۔تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔''آصف بھائی نے پیش کش کی۔میں نہیں نہیں کرتی رہی۔بے بی نے کہا۔''بھابھی آپ کو بہت کمزوری ہو رہی ہے چلیے نا کار میں۔''

''جب آئی تھی۔تب بھی ایسی ہی تھی۔''میں نے لڑکھڑاہٹ سے کہا مگر بے بی زبردستی کرنے لگی۔

''شاید تم کو مجھ پر اعتماد نہیں۔''آصف بھائی مایوسی سے بولے۔''یاد رکھو نازی۔خواہ ساری دنیا تم سے بدگمان ہو جائے۔میں تمہارا ساتھ دوں گا۔جب بھی تمہیں کوئی مسئلہ پیش آئے کوئی الجھن ہو۔تم بلا تکلف مجھے بلا لینا۔دنیا کی پروا نہ کرو۔تم نے دنیا کو دیکھ لیا ہے نا۔کوئی کسی مطلب کے بغیر کسی کا ہمدرد نہیں ہوتا۔مگر میں بھی تم سے غافل نہیں رہ سکتا۔میں تمہیں خوب جان گیا ہوں۔اور آج کے دور میں یہی غنیمت ہے۔''

بے بی میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔میں نے پشت سے سر ٹیک لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔کار روانہ ہوئی اور بے بی آصف بھائی کچھ بات کرنے لگے مگر میری سمجھ میں نہیں آیا۔وہ کیا کہہ رہے ہیں۔میں کسی اور دنیا میں سفر کر رہی تھی۔تصور مجھے کہاں سے کہاں لے جا رہا تھا۔اماں۔ابا۔وجیہہ۔گل۔یہ میرے اپنے مجھ سے کتنے دور ہیں۔گھر آ گیا تھا۔آصف بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔پتا نہیں آج انہوں نے وجیہہ سے ملنے کی کوشش کیوں نہ کی۔آج میں مزاحمت بھی نہ کر سکتی تھی۔

بے بی نے دواؤں کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے وجیہہ کو بتا دیا۔ہم آصف بھائی کے ساتھ آئے ہیں انہی نے راستے میں ٹیسٹ کی دکان سے دوائیں لے دیں وجیہہ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔میرے خدا میں سانس روکے بے بی کو دیکھ رہی تھی۔کب انہوں نے دوائیں لیں میں اپنے تصور میں اتنی گم تھی کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔وجیہہ نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔اف خدا۔ان کی نگاہ میں کیا تھا۔میری موت۔بے یقینی حقارت۔افسوس۔

میں نے بھی اب ہر طرف سے آنکھیں بند کر لیں کان بند کر لیے۔کبھی سلائی آ جاتی۔تو کسی طرح بے بی کی مدد سے سی لیتی ورنہ پلنگ پر بے سدھ پڑی رہتی۔خوابوں کے جزیروں میں سہانے نغموں کی مدھ بھری تانیں مجھے جھولے جھلاتیں۔ننھی پریاں رقص میں مصروف رہتیں۔

میں خوبصورت پھولوں کی کیاری میں خوشبو سونگھتی رہتی بے خبری بے گانگی کی دنیا نہایت حسین دلکش تھی۔اسی زمانے میں خالہ جی کی تلاش کامیاب ہوئی۔کوئی اچھا رشتہ آیا تھا۔اور وہ بے بی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔میری اور وجیہہ کی بیماری کے پیش نظر وہ اپنی ایک پڑوسن بی کو میرے گھر چھوڑ گئی تھیں جو وجیہہ کے لیے کچھ پکا لیتی تھیں۔مجھے معلوم نہ تھا خالہ جی انہیں خرچ کے لیے کچھ دے گئی ہیں یا نہیں۔گھر میں کون آتا کون جاتا ہے۔غفلت میں پڑی رہتی۔دھوپ اور سائے کی بھی پہچان نہیں رہی تھی۔

بڑی بی بہت ہمدرد اور مہربان عورت تھیں۔میں خود کو اللہ تعالیٰ کی کسی عنایت کی مستحق نہیں سمجھتی تھی۔مگر وہ اپنے کرم کا سایہ مجھ گناہ گار پر پھیلائے جاتا تھا۔خالہ جی کے بعد بڑی بی کی محبت اور خلوص نے مجھے ان کا گرویدہ کر دیا۔مجھے ماں کی شفقت محبت،اور غم گساری کہاں سے نہیں ملی۔پہلے ساس پھر خالہ جی۔اب بڑی بی۔

کس نے مجھے جگایا تھا۔میں نیند میں غٹ بمشکل اٹھی۔آنکھیں چیر چیر کر سامنے دیکھنا چاہا۔آپی پھر آ گئی تھیں۔ان کی آنکھوں میں غصے کے شرارے نہیں تھے۔آنسوؤں کی چمک تھی۔شکست کا ملال تھا۔وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

''بتاؤ نازی آصف کہاں ہیں۔''

میں بمشکل آنکھیں کھول کر انہیں دیکھ سکی۔''دیکھ نازی۔میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔مجھے آصف کا پتا بتا دے۔''

''میرے پاس تو نہیں ہے۔''میں نے پلکیں جھپکیں۔

''تیرے پاس نہیں۔مگر اس کالی کلوٹی بے بی کے پاس تو ہے۔جس سے ملاقاتیں کرنے وہ یہاں آتے تھے۔''

''کون بے بی؟''میں بمشکل پپوٹے اٹھا سکی۔

''تیری لاڈلی چہیتی بے بی۔اور کون۔پرسوں وہ آئے تھے۔اور بتا گئے ہیں۔انہوں نے بے بی سے شادی کر لی ہے۔سنا۔اور اسی دن سے پھر وہ گھر نہیں آئے۔نازی مجھے ان کا پتا بتا دے میں ان سے اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں گی۔میں ان کی۔ساری زندگی خدمت کروں گی انہیں دیوتا بنا کر پوجوں گی۔مجھے صرف ایک بار ان کا پتا تو دے دے۔''

آپی کی آواز میں شکست کی جھنکار تھی۔لہجہ بجھا ہوا تھا اور وہ پچھتاووں کے جنگل میں ضمیر کی تلاش سے تھک کر اپنی منزل سے مایوس ہو کر سمجھوتے کی پگڈنڈی پر کھڑی تھیں۔کتنی دیر میں عقل آئی تھی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں۔اب مقابلے کی دوڑ میں شریک ہونا۔میرے لیے ممکن نہیں

رہا- نازی- بس تو مجھے ان کا پتا بتادے- میں انہیں ایک بار حاصل کرلوں- آخری کوشش-''

جانے مجھے کیا ہوا- میں تن کر بیٹھ گئی- ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی-''آپی، مجھے معلوم ہوتا نا- تب بھی تمہیں نہ بتاتی- خدا کے لیے انہیں بھی جینے کا حق دو- وہ زندگی کے لیے ترس گئے ہیں-''

آپی کے چہرے سے وہ چند لمحے پیشتر کے جذبات غائب ہونے لگے- کوئی زندگی کا حق مانگے- جبکہ زندگی پر تو وہ محض اپنا اور اپنا ہی حق سمجھتی تھیں- میں نے آصف بھائی کی سفارش کر کے ان کی حاکمیت اور برتری کا مذاق اڑانا چاہا تھا- وہ فوراً پرانے روپ میں ڈھل گئیں- چہرہ غصے سے سرخ اور آنکھوں میں چنگاریاں- ان کا ہاتھ میرے بالوں پر آکر رکا- وہ اشتعال سے کانپ رہی تھیں-

''بتادے- بتادے مجھے- نہیں بتائے گی- تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی-'' وہ مجھ پر پل پڑیں-

انہوں نے مجھے پلنگ پر گرا کر رگیدنا شروع کیا- وہ مارتی رہیں میں پٹتی رہی- بوا چلاتی رہیں-

''میں مار ڈالوں گی تجھے- زندہ نہیں چھوڑوں گی-'' زخمی شکست خوردہ شیرنی غرا رہی تھی-

''مار ڈالو آپی- میں بھی اب زندگی سے تنگ آ چکی ہوں-'' میں بغیر کسی احساس کے ہاتھ پیر ڈھیلے کر کے ان کے سامنے نرم چارے کی طرح بچھ گئی- بڑی بی کی چیخ پکار مجھے بھی سنائی دے رہی تھی-

''چھوڑ دو- ارے چھوڑ دو- کیا جان لوگی- ارے وہ دو جی سے ہے- ہائے اللہ یہ تو پیٹ کے بچے کی دشمن ہو رہی ہے کوئی روکو- ارے اسے روکو-''

وجیہہ بھی پوری طاقت سے چیخ رہے تھے- میں کب بے ہوش ہوگئی- پتا نہیں- کتنی دیر بعد ہوش آیا- کمرے میں اندھیرا تھا- میں وجیہہ کے برابر والے پلنگ پر لیٹی تھی- بڑی بی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں-

''جان لینے میں کسر ہی کیا چھوڑی ڈائن نے- پیٹ میں بچہ مرجاتا- تو دو جانوں کی قاتل بنتی- رحم کر خدایا-'' میں نے آنکھیں کھول کر بڑی بی کو دیکھا-''گل کہاں ہے بوا؟''

بڑی بی خوش ہوگئیں-''سلمیٰ بی بی لے گئی ہیں اسے بہت رو رہا تھا- تم- تم کیسی ہو بیٹی؟''

''ٹھیک ہوں- پانی پلا دو-'' بوا اٹھیں تو وجیہہ نے کہا-''کہیں دوائیں رکھی ہوں گی بوا- پوچھ کر طاقت کی دوا کھلا دو- ٹانک ہوں گے-''

بوا نے کہا-''دوائیں تو الماری میں بہت ساری رکھی ہیں میاں- مگر سب بوتلیں بند ہیں- ابھی کھلی نہیں-''

میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی- اٹھا نہیں گیا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا-''تم نے مجھے کیوں بچالیا بوا- مرنے دیتیں-'' میں نے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا-''میرے گناہوں کا

کفارہ ہو جاتا-''

''میں نے کہاں بچایا؟ وہ شیر کی طرح غرا رہی تھی- یہ تو میاں بے چارے اس کے سامنے آ گئے- تب وہ رکی جانے کیا کہہ رہی تھی کہ مجھے بدلہ لینا ہے- اور میاں سے کہہ رہی تھی کہ جسے دیکھو اسی کی تعریف- اسی کا ذکر- میں تم اور آصف دونوں کی محبت سے محروم کرنا چاہتی تھی اسے- مگر یہ بہت ڈھیٹ ہے- یہ بھی کہا کہ آصف تو بے بی کے لیے یہاں آتا تھا- اور اب اس سے شادی کر کے کہیں چھپ گیا ہے-

پھر سلمیٰ بی بی شور سن کر سامنے کے گھر سے آ گئیں- اور گل کو ساتھ لے گئیں-''

تو دوسروں نے بھی میری رسوائی کا تماشا دیکھ لیا- شاید یہ بھی میرے گناہوں کی سزا ہوگی- رات کو سلمیٰ بی بی گل کو لے آئیں- سلمیٰ ہمارے سامنے کے گھر میں رہتی تھیں- انہوں نے بھی مجھے کافی سلائی لا کر دی تھی- گل سہما ہوا میرے پاس آیا- میں نے اسے سینے میں چھپا لیا- وہ رونے لگا سکنے لگا-

''بیٹا کیوں روتے ہو-؟'' میں نے اسے پیار یا-''میں زندہ تو ہوں نا-''

''خالہ نے مارا تھا-'' وہ بھیگی آنکھیں ننھے منے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے بولا-''کیوں مارا تھا خالہ نے امی؟''

''مت کہو اسے خالہ-'' وجیہہ نے چیخ کر کہا-''وہ تمہاری کوئی نہیں ہے-'' اور گل کو گھسیٹ کر اپنے قریب کر لیا- اسے سینے سے لگا کر گھٹی گھٹی سسکیوں سے رونے لگے- گل بھی رو رہا تھا- میں بھی-

سلمیٰ بی بی اپنی ایک سہیلی کو لے آئی تھی لیڈی ڈاکٹر کو- وہیں بڑی بی نے وجیہہ اور میرے پلنگ کے درمیان پردہ تان دیا- اور ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا- میرا سارا جسم درد سے پھٹا جا رہا تھا مگر پیٹ میں تو جیسے کسی نے پتھر بھر دیے تھے- ڈاکٹر دیر تک دیکھتی رہی- پھر بولی-''شکر کرو- بچہ بچ گیا- مگر صورت سے تو تم اتنی لڑاکا نظر نہیں آتیں- پھر لڑائی کیسے ہوئی؟'' وہ خوش مزاج لڑکی تھی-

''بی بی او تو پاگل ہوگئی تھی-'' بوا نے انہیں مطلع کیا-

ڈاکٹر نے کہا کہ کمزوری بہت ہے میں دوائیں لکھ دیتی ہوں- مگر دوا کے استعمال کے علاوہ آپ خوش رہا کریں فکر نہ کریں-

بوا نے الماری میں رکھی سب دوائیں انہیں دکھائیں تو سنجیدہ ہوگئیں-''سب دوائیں موجود ہیں- آپ نے انہیں استعمال کیوں نہیں کیا- یہ آپ اپنے ساتھ دشمنی کر رہی ہیں- فوراً دوا کھائیں- دودھ پئیں-'' اور انہوں نے وجیہہ کو مخاطب کر کے انہیں میرا خیال رکھنے دوا کھلانے

کی ذمہ داری سونپی اور چلی گئیں۔

بوا دودھ لے آئیں۔ سرگوشی میں بولیں۔ ''دودھ والا پیسوں کا تقاضہ کر رہا ہے۔ اور وہ موا سبزی والا بھی۔''

میں صحن میں پڑے پلنگ پر آ گئی۔ بوا کے سہارے سے۔ مجھ سے دو قدم اٹھانے دشوار تھے۔ اندھیرا۔ آسمان تاروں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ چاند اپنی روشنی زمین پر نچھاور کر رہا تھا۔ مہربان آسمان، تابناک آسمان کوئی رنجش نہیں۔ کوئی گلہ نہیں۔ ہر روز رات یونہی زمین سے محبت کے رشتے کو مضبوط بناتا ہے۔ میں ایک تارہ ہوتی چمکتی رہتی پھر ایک دن آسمان کی وسعتوں میں سمندر کی گہرائیوں میں گم ہو جاتی۔

''لو۔ اٹھو۔ دوا پی لو۔'' آواز کانوں سے ٹکرائی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ بوا کی آواز نہیں تھی۔ وجیہہ ہاتھ میں دوا لیے کھڑے تھے۔ آصف بھائی کی خریدی ہوئی دوا۔ میرے جرائم کا ثبوت۔ میں نے تو ان دواؤں کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ وجیہہ نے دواؤں کے معاملے میں کس نظر سے مجھے دیکھا تھا۔ میں اس نظر کو کبھی بھول نہ پاؤں گی۔ میری غیرت پر تازیانہ لگانے والی وہ نظر آج بھی اتنی ہی گہری نوکیلی اور تازہ تھی۔ روح کو چھیدنے۔ چھیلنے کھرچنے والی۔

میں نے وجیہہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ شیشی زمین پر گری۔ اور چھنا کے سے ٹوٹ گئی۔ وجیہہ بہتی ہوئی دوا کو دیکھتے رہے۔ سوتے میں ایسا لگا جیسے کوئی مجھ سے دور جا رہا ہے۔ میں اس آواز کی طرف بڑھ رہی ہوں مگر مجھے سمت کا علم نہیں ہوتا۔ بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہوں۔ سخت چوٹ لگتی ہے۔ زور کی ٹیس۔ میں چیخ مار کر جاگ گئی۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اور ٹیس بھی بدستور۔ آوازیں بھی۔ روشن آپا مجھے پکار رہی تھیں۔ روشن آپا میری مسیحا۔ میری دلدار۔ رازدار۔ میں چیختی ہوئی ان سے لپٹ گئی اور پھر درد کی اذیت ناک لہروں میں ڈوبنے ابھرنے لگی۔

ہاسپٹل مخصوص دواؤں کی بواور پرسکون خاموشی میں لپٹا ہوا تھا۔ نہ صرف مجھے۔ بلکہ بچی کو بھی بچا لیا گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں مجھے علم ہوا۔ بچی بہت کمزور تھی۔ وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ روشن آپا اچانک آ گئی تھیں۔ انہوں نے وجیہہ کے آفس کے پتے پر خط اور ٹیلی گرام بھیجا تھا۔ مگر انہیں علم نہ تھا وجیہہ تو اس آفس کو کئی ماہ پہلے چھوڑ چکے۔

وہ میری زندگی کے اس خطرناک موڑ پر اچانک نمودار ہوئیں۔ ہمیشہ کی طرح درد کے فاصلے کم کرنے۔ غم بٹانے۔ دکھ منانے کے لیے۔ انہوں نے ہمارے تمام قرض ادا کیے۔ بہترین ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا۔ میں ایک بڑے ہاسپٹل کے مہنگے کمرے میں تھی۔ روشن آپا تیماردار ہوں تو کوئی زیادہ بیمار ہو سکتا ہے۔ میں تیزی سے روبصحت ہو رہی تھی۔ جوس سوپ۔ دودھ۔ دوائیں اور انجکشن میری صحت بحال کرنے کو کافی تھیں۔ ڈھیٹ تو میں تھی۔ اس دن روشن آپا گھر چلی گئیں اور

بڑی بی میرے پاس تھیں۔ وہ وارڈ میں اپنے ملنے والے ایک مریض سے ملاقات کے لیے چلی گئیں سایہ سا میری آنکھوں سے لہرایا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں آصف بھائی تھے۔ بہت متاثر تھے۔ بار بار معذرت کر رہے تھے کہ ان کی وجہ سے مجھے ہر بار اذیت سہنی پڑتی ہے۔

''اچھا ہاں۔ نازی۔ وہ شہناز تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔'' انہوں نے قدرے ہچکچا کر کہا۔ تب مجھے یاد آیا بے بی کا اصل نام تو شہناز ہی تھا۔ میں بے چین ہو گئی۔ میں اس سے ملنا اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنے دنوں سے دیکھا نہیں تھا وہ میری ہمدرد اور محسن تھی۔

جب وہ اندر آئی تو وحشی ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ گلابی ساڑھی میں لپٹی سمٹی۔ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھی۔ آصف بھائی کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر جھانکنے لگے۔ بے بی کے چہرے پر نئی دلہنوں والا نکھار تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ آج سے پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں لگی تھی۔

ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے؟ ''آپ مجھ سے خفا تو نہیں؟'' وہ چپکے سے پوچھنے لگی۔

''نہیں۔ بے بی۔ اوہ۔ شہناز۔'' میں نے اسے چوم لیا۔ ''تم خوش تو ہو نا۔ آصف بھائی تمہیں تنگ تو نہیں کرتے۔'' وہ شرما گئی۔ اور جھکی جھکی نظروں سے آصف بھائی کو دیکھنے لگی۔

''میں نے کبھی ارادتاً کسی کو تنگ نہیں کیا نازی بی بی۔ یہ تو وہ تہمت ہے۔ جس سے دامن بچا بچا کر میں اب تھک گیا ہوں۔ میں نے روح پر عذاب سہے۔ دل کو کچلتا پیستا رہا ضبط کے سارے ہنر آزما لیے۔ تب مجبور ہو کر اس راستے کو چھوڑ دیا۔ جس پر چلتا رہا تھا۔ کسی آس میں۔ اچھے دنوں کی امید میں۔ مگر تمہاری بہن نے مجھ سے وہ آس امید اس طرح چھین لی۔ کہ میں خوشی کے لفظ کے لیے ترس گیا۔''

''اب۔ اب خوش ہیں آپ؟'' میں نے آصف بھائی کی پلکوں پر چمکتے ستارے دیکھے۔ اور آنکھوں میں شبنم کی بوند جیسی نمی۔ میرا سوال سن کر اور بھی سرسیمہ ہو گئے۔

''خوش۔ شاید کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو خوشی کا مطلب ہی مجھے کسی نے نہیں سمجھنے دیا۔''

''بے بی۔ میرا مطلب ہے شہناز آپ کو سمجھا سکتی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا ہے بی بھی نیچی نظروں سے مسکرا رہی تھی اور آصف بھائی کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ شبنم اور ستارے سمیت۔

''تم تو۔ مجھ سے ناراض نہیں ہو۔'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کی خوشی سے میں ناراض کیونکر ہو سکتی ہوں۔ آپ خوش رہنا سیکھ لیجیے۔ میں بھی بہت خوش رہوں گی۔''

بے اختیار آصف بھائی کا ہاتھ میرے سر پر پہنچ گیا انہوں نے انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بہت اطمینان سے کہا۔ ''اف خدا کا شکر۔ میں ڈر رہا تھا۔ میرے سر کا بوجھ اتر

گیا- اب واقعی میں خوش ہوں- اور تمہاری ان بے بی نے مجھ تو ایک نئے جہان کی سیر کرادی ہے- اب میں کل ہی ان کو لے کر امی کے پاس جا رہا ہوں- وہ بھی بہو کے نئے معنوں سے متعارف ہو جائیں- ویسے نازی- ایک بات ہے- شاک مارنے کی ان کی عادت ہے- میں ایک بار پہلے بھی جھٹکا کھا چکا ہوں اس لیے عادی ہو گیا ہوں- ورنہ- اب تک جل کر راکھ ہو گیا-''

بے بی نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر ان کے منہ پر انگلی رکھ دی وہ چپ ہو گئے- اور پھر ہنسنے لگے مجھے بھی ہنسی آ گئی- میری آنکھیں جگمگانے لگیں- کاش ان کی خوشی سدا سلامت رہے- اے خدا- میرے سر پر ایک پیار بھرا چپت رسید کر کے وہ پھر واپسی میں گھر پر ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے- ان کے جاتے ہی یونہی میری نظر سرہانے کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی باہر کی طرف وجیہہ کھڑے تھے- اندر دیکھ رہے تھے- فق چہرہ اور خاموش نگاہوں سے میرے چہرے پر رقصاں ہنسی پر حیران تھے- میں نے کروٹ دوسری طرف کر لی-

اب بہت سخت جان اور سنگدل ہو گئی تھی- کسی بات کا زیادہ اثر نہیں لیتی تھی- پھر بھی آصف بھائی کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے ہوئے میں ان کی بہتر زندگی کی دعا کرتے ہوئے اس قدر جذباتی کیوں ہو گئی- وجیہہ شاید اس بات پر بھی مجھ سے بدظن ہو گئے ہوں گے- ہوں- مجھے اب کسی کی پروا نہیں- مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں والا مضمون مجھ پر صادق آتا تھا- وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اندر آ گئے میں ان کی طرف پیٹھ کیے لیٹی رہی- انہوں نے میرا ہاتھ چھوا- شاید کچھ کہنا چاہا- میری ہمدردی- اپنی صفائی میں- میں نے ہاتھ جھٹک دیا- اور دوپٹہ منہ کانوں پر لپیٹ لیا- بالکل اسی طرح کا سلوک وہ بھی میرے ساتھ کرتے تھے- ان کے ساتھ ایسا کر کے آج مجھے بڑا قلبی سکون محسوس ہوا- تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد آواز آئی- ''خدا حافظ- پھر ان کے قدموں کی چاپ- میں خاموشی سے آنسو بہاتی رہی- وہ چلے گئے-

ماضی مجھ سے اپنا ہرنا تا توڑ چکا تھا- اور حال لنگڑاتا ہوا تھکن سے چور مایوسیوں میں ڈوبا میرے قدم کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا- میں بھی اتنی ہی زخمی- تھکی ہوئی اور بے حال تھی- اب- میں زندگی سے کیا لوں گی- اسے کیا دوں گی- اس راز کو مستقبل ہی بتائے گا- میرے سامنے ایک لق و دق صحرا تھا- تا حد نظر سراب کی فرماں روائی-

یہ میرے حال کی پوزیشن تھی تو میرا وجود بھی صحرا تھا اور میری حیات سراب- تپتی دھوپ- آتشیں سورج- درد کے بگولے- اندیشوں کی آندھیاں، خوف کے طوفان بڑھتے بڑھتے ہر آس پر امید پر محیط ہو گئے تھے- صحرا- میدان بیاباں- تکان- پیروں میں آبلے- ہونٹوں پر چھالے یہ دیا تھا مجھے اس دنیا نے- اب تو میں مجسم درد- مسلسل کرب کا نشان تھی- لمحہ لمحہ خطرناک حد تک جراحیت نے مجھے بے انداز ہ قوت عطا کر دی- اب کوئی ڈر نہ رہا- جب منزل ہی گم ہو جائے تو بے خوفی کو شعار بنانا

ہی حوصلہ مندی کا نشان ٹھہرتی ہے میں بھی پژمردہ دل اور مردہ احساس کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی- سراب کی حقیقت جان کر سراب کے ساتھ چلنے میں بھی ہمت کا امتحان ہوتا ہے اور میں ہر امتحان سے گزر گئی-

گھٹا بہت زور سے امڈی تھی- کئی مہینوں کی پیاسی دھرتی تیز کی بارش سے نہا کر سیراب ہو گئی- پیڑ پتے- جھل کر نکھر گئے- سب لوگ برآمدے میں بارش کا مزا لے رہے تھے- خانساماں گرم گرم پکوڑے لا رہا تھا- اور پر لطف باتوں قہقہوں سے فضا کا ذرہ ذرہ مجسم مسرور تھے- میں کمرے سے ان کی باتیں سن رہی تھی- تبھی کسی نے کہا-

''ارے نازی کو بلاؤ- پکوڑے کھلاؤ-''

میں باہر آ گئی- یہ نئی دنیا تھی- مجھے اس دنیا میں داخل ہوئے کافی دن ہو گئے تھے- اور اب روشن مستقبل کی مسکراتی سنہری کرنوں کی جگمگاہٹ مجھ سے دور بھی نہ تھی- ایک خواب تھا- بڑا خوش رنگ- خوش آیند- اس کی تعبیر بہت بعد میں ملی- ملی تو سہی- تمام تر صلاحیتوں کی یکجا کرنے میں بروئے کار لانے میں مہینوں تو گزر ہی گئے- مگر اٹل ارادے اور شوق نے ہر مشکل آسان کر دی- اور پھر اللہ کا کرم اور مدد جس نے ہر بار میری دادرسی کی تھی- اب بھی ایک خضر رہنما کی شفقت عطا کر دی- ڈاکٹر ظفر اللہ اور بیگم ظفر اللہ میرے سر پرست کیا بنے- ترقی کی منزلیں خود بخود میرے سامنے آ گریں- ظفر کلینک کہنے کو ایک کلینک تھا مگر وہ پورا ادارہ تھا جہاں علاج کے علاوہ سماجی بہبود کے کتنے ہی کام انجام پاتے بے آسرا کسی ذمے داری کے امین بن جاتے- میں بھی پہلے پہل بے آسرا بن کر ان کے کلینک میں پناہ لینے آئی تھی- اور بہت جلد وہ میری کم گوئی- زیادہ محنت اور سلیقہ مندی کے معترف ہو گئے- کلینک میں امان اور روزی ہی نہیں مستقبل میں ایک ذمہ دار شہری بننے کی تربیت بھی دی جاتی تھی- مختلف کام سکھا کر مکمل ٹریننگ دے کر روزگار فراہم کیا جاتا تھا-

مجھے پہلے پہل انہوں نے کلینک میں بچوں کی نرسری کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا- میری بے بی بھی ان بچوں میں شامل تھی- پھر میری صلاحیت سے متاثر ہو کر آفس میں ڈاکٹر کمال کی اسسٹنٹ بنا دیا- ڈاکٹر کمال بہت خوبیوں والے اور بے حد اصول پرست انسان تھے- انہوں نے پہلے میری کڑی تربیت کی- نرسنگ کے تمام اصول سکھائے آفس کے قاعدے اور ضابطے ذہن نشین کرائے- پھر اتنی سختی سے امتحان لیا- کچھ کر کے- کر دکھانے کا عزم- قدم جما کر زندہ رہنے کی کوشش اور دوسری جائے پناہ نہ ہونے کے باعث اسی ادارے سے منسلک ہونے کا پر یقین ارادہ مجھے ہر امتحان میں کامیابی کی نوید سناتا گیا-

میں سلیمہ بھابی تو نہ بن سکی- کہ ان کی زندگی میری زندگی سے ان کے حالات میرے حالات

سے قطعاً الگ تھے۔ مگر میرا وہ خواب ضرور پورا ہو گیا۔ اب میں ایک معزز ہستی تصور کی جانے لگی تھی۔ میری محنت دیانت اور کام کی سچی لگن مجھے اس منزل تک لائی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب میں ہر کمزوری پر قابو پا چکی تھی۔ اور نڈر بن کر جی رہی تھی۔ تبھی تو زندہ تھی۔ ظفر کلینک کا تمام عملہ اور محنت مزدوری کرنے والے بے آسرا لوگ۔ تعلیم اور ٹریننگ لینے والے طالب علم سب میری عزت کرتے تھے۔ ظفر اور بیگم ظفر مجھ پر اپنی تمام شفقت نچھاور کرتے نہ تھکتے ان کی اولاد نہ تھی۔ اسی لیے وہ معاشرے کے ستائے لوگوں کو علم و ہنر اور روزی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ان کا ادارہ کافی ترقی کر رہا تھا۔

ہاسپٹل میں جب بے بی کی۔ پیدائش پر میں آصف بھائی سے ملی تھی اس دن وجیہہ بھی مجھ سے ملنے اور اپنی نوزائیدہ بچی کو دیکھنے آئے تھے۔ اس کے بعد وہیں کے ایک ڈاکٹر سے باتوں باتوں میں مجھے ظفر کلینک کے بارے میں معلوم ہوا۔ ڈاکٹر اور نرسیں ڈاکٹر ظفر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو اس ہاسپٹل کے معاینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کلینک کے لیے حکومت کی گرانٹ کے بارے میں طریقہ کار کا جائزہ لینے اور ڈاکٹروں سے سلاح مشورہ کرنے آئے تھے ان کے بارے میں مکمل جانچ پڑتال ان کی شہرت اور کلینک کی نیک نامی کا علم مجھے ہاسپٹل میں ہی ہو گیا اور بالکل فلموں جیسی چوکنٹین اور عجب اتفاق کہ اس دن بھی روشن آپا گھر گئی ہوئی تھیں۔ بواجنرل وارڈ کی سیر میں مگن تھیں۔ نرس بے بی کو میرے پاس لے کر آئی۔ ٹمپریچر لے کر مطمئن انداز میں یہ کہہ کر چلی گئی کہ اب کل مجھے چھٹی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر ظفر کے مشن کے بارے میں ایک پمفلٹ کوئی نرس میرے کمرے میں بھی ڈال گئی تھی۔ جس سے کلینک کے نام شہر اور فون نمبر کا مجھے خوب اچھی طرح علم ہو گیا۔ اس پمفلٹ کو مٹھی میں دبا کر بے بی کو گود میں لیے جب میں ملتی ہوئی باہر نکلی تو کسی کو شبہ تک نہ ہوا کہ ہاسپٹل کی ایک مریضہ فرار ہو رہی ہے۔ روشن آپا کی مہربانی سے میرے پاس اب کافی روپے ہوتے تھے۔ نرسوں، جمعدارنی اور آیا کو خدمت کے صلے میں انعام دینے کے لیے اس دن ڈھلتی شام کو میں ڈاکٹر ظفر کے پاس پہنچی تو بہت تھک گئی تھی۔ مگر ظفر اور بیگم ظفر نے میری صورت سے اندازہ لگا لیا کہ میں شریف گھر کی تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔ اس کے بعد ادارے میں داخلے اور رہائش کا پورا انتظام انہی نے فوری احکام کے ذریعے کیا۔

جب سے ہی بیگم ظفر مجھے ایک بیٹی کی طرح چاہنے لگیں وہ ایک بڑے بنگلے میں رہتی تھیں اور ان کے ساتھ کلینک کے کئی ڈاکٹر بھی رہتے تھے۔ وہ سب مجھے بچوں کی طرح چاہتے تھے۔ آج موسم کی رت اچانک بدلی تھی اور ڈاکٹر نے تمام عملے اور مریضوں کو دعوت عام دی تھی۔ مریضوں کے لیے چکن سوپ اور ان کے مرض کے مطابق بہترین غذا کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رات گئے تک سب لوگ

کھاتے پیتے ہنستے بولتے رہے کسی کو کسی سے شکایت تھی نہ رنج۔ وہ سب ایک کنبے ایک قبیلے کی طرح رہتے تھے۔ اور اب میرا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ رات کو برتن اٹھوا کر دھلوانے میزیں صاف کروا کے ان پر صاف چادریں بچھا کر برآمدوں کی روشنیاں گل کر کے امن ہال جس میں بے آسرا لاوارث لڑکیاں رکھی جاتی تھیں میں داخل ہوئی۔ سب سے فرداً فرداً ان کی ضروریات معلوم کرنے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔ انہیں تسلیاں دلاسا دیتی ہوئی جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رہ گئی۔

سامنے میرے پلنگ پر ایک میگزین لیے بھیا آڑے لیٹے تھے۔ بے بی اپنے بستر پر محو خواب تھی۔ ظاہر ہے۔ میں نہ لاوارث تھی۔ نہ بے اماں۔ دکھی بھی تھی تو خود اپنی حرکتوں کی بدولت۔ یہ بات بھیا نے سو بار ڈاکٹر ظفر کو سمجھائی۔ ان کو خوشامد کی تب وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ میں ان کے آفس کی گمراہ۔ ڈاکٹر کمال کی اسسٹنٹ۔ ادارے کی روح رواں۔ بیگم ظفر کی منہ بولی بیٹی محنتی اور بے طلب بے غرض۔ وہ آسانی سے مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ میں نے ان کی سوالیہ نظروں سے بچنے کے لیے بھیا کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ملال کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بے حد پر شفقت اور پر اعتماد تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت ہی محبت یقین ہی یقین تھا۔ انہیں مجھ سے ذرہ بھر شکوہ بھی نہ تھا۔ پھر میں اپنی جانب بڑھتی مامتا کی آہٹ کو کیسے دھتکار دیتی۔

بھیا مجھے اپنے گھر لے آئے۔ اونچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ان کا لکڑی کی دیواروں والا گھر۔ سامنے گھاٹی تھی۔ اور گھر کے پچھلے حصے میں ایک پہاڑی ندی شور مچاتی بھاگتی رہتی مجھے یہ درختوں اور اونچے چناروں میں گھرا خاموش گھر پسند آیا۔ البتہ ندی کا شور رات کو بھی نیند اچاٹ کر دیتا مگر پناہ کا احساس ہر بے چینی پر حاوی ہو جاتا۔ بھیا نے بتایا تھا کہ میرے ہاسپٹل سے فرار ہونے کے بعد آصف بھائی نے آپی کو طلاق دے دی تھی۔ حالانکہ پہلے ان کا یہ ارادہ نہ تھا۔ مگر آپی کسی طور بے بی یعنی شہناز کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں۔ اور اب آپی پھر اماں ابا کے پاس تھیں۔ اور ان کی شادی کے لیے اماں پھر سے کوشاں۔

بھیا نرمی سے مجھے وجیہہ کے پاس جانے کی تلقین کرتے رہے۔ وجیہہ کی محبت۔ گل کی چاہت۔ اپنے گھر کی تمنا مجھے اب کوئی لالچ کوئی ترغیب متاثر نہ کرتی۔ میں نے بھیا سے کہہ دیا کہ اگر وہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ تو اب میرے لیے بہت سے راستے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر مجھے بخوشی واپس لینے کو تیار ہیں۔ اب مجھے کسی پر بوجھ بننا گوارا نہیں۔ اس لیے میں نے کئی جگہ سروس کے لیے اپلائی کر دیا۔ بھیا کو یہ بات گوارا نہ تھی وہ خفا رہنے لگے۔

لیکن محض میری خوش قسمتی کہ بھیا کے ہی آفس میں ایک بہت اچھی جگہ نکلی۔ میں مینجنگ ڈائریکٹر

سے جاکر خود ملی- ڈاکٹر ظفر کے دیے ہوئے تعریفی سرٹیفکٹ اوران کے ادارے میں کام کیے جانے اور زینہ بہ زینہ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے آفس کی انچارج مقرر ہونے اور اس میں بھی کامیابی سے عہدہ برا ہونے کا ثبوت انہوں نے آفس کی مہر کے ذریعے اپنے ادارے کے جاری کردہ رجسٹرڈ سرٹیفکٹ پر دیا تھا- مینجنگ ڈائریکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا- دو دن بعد مجھے آفس کی کرسی پیش کی گئی- اب میں بھیا کی سیکرٹری تھی- گو کہ چپراسی میرے لیے دروازہ نہیں کھولتا تھا- مگر میں بحیثیت سیکریٹری بھیا کے عقب میں ہوتی- اور چپراسی ڈرائیور اور کلرکوں کی نیازمندی بھیا کے ساتھ مجھے بھی مل جاتی- جب میں نے نہایت طمانیت سے بھیا کو اپنے اس خواب کے بارے میں بتایا- سلیمہ بھابھی کے اعلیٰ عہدے اور ان کی پروقار پوزیشن کو اپنے لیے پیمانہ سمجھ کر قبول کیا- یہ جدوجہد اسی خواب کا نتیجہ ہے- میں اپنی اس پوزیشن کو خوش قسمتی سمجھ رہی تھی- مگر میری بات سن کر بھیا خلاف توقع مسکرائے نہیں- صرف خیال انگیز لہجے میں کہا-

''کاش- تم نے اپنے گھر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھا ہوتا تو یوں بے گھر نہ ہوتیں-''

میری خوشی دم توڑ گئی- سارا فخر و غرور ایک جملے نے مٹا دیا- میں بے گھر تھی- بھیا کی پناہ میں ہونے کے باوجود ایک بڑی فرم میں باعزت پوزیشن کے باوجود بے گھر ایسا لگتا تھا کہ آج پھر ابا نے مجھے قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر نفرت سے دھتکار دیا ہو- میں بے گھر ہوں- اپنے کمرے میں بند ہو کر بے بی سے لپٹ کر میں خوب روئی آصف بھائی نے میرا دھکا نا تلاش کر لیا- وہ آئے اور اپنے ساتھ فائلیں بھی لائے- میں ان کی بزنس پارٹنر تھی- میرے نام سے جو کاروبار انہوں نے کیا تھا اس میں منافع پر منافع ہو رہا تھا- وہ مجھے ہر جگہ تلاش کرتے ہوئے جانے کس طرح ظفر کلینک پہنچے تھے- ہاسپٹل سے میری پراسرار گمشدگی نے انہیں ادھر متوجہ کیا- ڈاکٹر ظفر کے کلینک کے بارے میں پمفلٹ وہ میرے کمرے میں دیکھ چکے تھے- ان کی معرفت آفس آئے اور مجھے وہاں دیکھ کر جلنے لگے-

بھیا کی موجودگی میں ان کی خفگی کے اظہار کے باوجود کہنے لگے- ''تمہیں یہ دو ٹکے کی سروس کرنے کی ضرورت نہیں- تمہارا جما جمایا کاروبار ہے- کچھ کرنا ہی ہے تو اپنے بزنس کے لیے کرو- اپنا آفس سنبھالو- میں دو طرف کے مسائل سے نبٹتے- نبٹتے گھن چکر بن گیا ہوں- تجربے کار تو ہو ہی گئی ہو-''

''مجھے بزنس کا کوئی تجربہ نہیں-'' میں نے متانت سے کہا-

''آفس کے کام کا تو ہوا ہے- سب جگہ ایک جیسا ہی ضابطہ ایک سا قاعدہ ہوتا ہے- باقی ملکیت

کا فخر ہوتا ہی کچھ اور ہے اس کی لذت ہم سے پوچھو-''

وہ باتیں کر رہے تھے- اور بھیا اپنی سیٹ پر بے چینی سے حرکت کر رہے تھے- کبھی مجھے کوئی کام بتاتے کبھی فون کرنے کا حکم دیتے- آصف انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھتے رہے- دونوں میں کوئی ایک دوسرے سے مخاطب نہ ہوا- اس دن انہوں نے چند کاغذات پر میرے دستخط لیے- اس کے بعد وہ گھر پر بھی آنے لگے- بھیا اس آمد و رفت سے بہت بھناتے- آپی کو طلاق دینے کے بعد ان سے ہمارا رشتہ ختم ہو گیا تھا- اس لیے اب ان سے ملنا مناسب نہیں- یہ بات وہ کئی بار مجھے سمجھا چکے تھے- مگر آصف بھائی میرے پاس اس کاروبار کے سلسلے میں آتے تھے جو انہوں نے میرے نام سے شروع کیا تھا- میں انہیں منع کرتی تھی- مگر فائلوں میں جگہ جگہ میرے دستخط تھے- اب وہ پھر نئے سرے سے اس بہانے تعلقات استوار کرنے پر تلے ہوئے تھے- میرے منع کرنے پر بھی نہ مانتے- میں نے بھیا کے نام سے انہیں ملاقاتوں سے باز رہنے کی کوشش کی-

''دراصل تمہارے منافع کی رقم بہت زیادہ ہو گئی ہے-'' وہ بھیا کے سامنے فائل پھیلا کر بیٹھ گئے-

''انکم ٹیکس کی ادائیگیوں کے بجائے اگر تم اجازت دو تو ہم کوئی انڈسٹری وغیرہ لگا سکتے ہیں-''

''انڈسٹری؟'' میں تعجب کے اظہار سے باز نہ رہ سکی-

''ہاں- تمہارا یہ منافع لاکھوں سے بڑھ چکا ہے- اور اگر کم ہوا تو حکومت ہمیں لون دینے کی پابند ہے-'' آصف بھائی کی بات پر بھیا بھی بھونچکا سے ہو گئے-

''تم لکھ پتی ہو- اور اگر انڈسٹری کے لیے رضامند ہو جاؤ- تو کروڑ پتی بننے سے کون روکے گا تمہیں-'' وہ طنز سے کہنے لگے- ''ہاں اگر اس کرسی پر بیٹھی رہیں- تو البتہ ترقی کے راستے خود بند کر دو گی-''

بھیا نے بھی اس کاروبار کی فائلیں دیکھیں- گوشوارے چیک کیے- اور کچھ چپ سے ہو گئے-

''یہ کاروبار تمہاری بربادی کا باعث ہے-'' وہ کھوئے ہوئے لہجے میں کہنے لگے- میں چونک گئی- یہ بھی حقیقت تھی- اس کاروبار کے نام پر جو پانچ ہزار روپے آصف بھائی مجھے دے گئے تھے- اسی کو دیکھ کر وہ جیسے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے- دراصل میری ان سب سے علیحدگی اسی دن ہو گئی تھی-

''تم آصف سے نہیں ملو گی-'' بھیا نے دوٹوک لہجے میں مجھ سے کہا- ''میں تمہاری بہتری کی کوشش کر رہا ہوں- اور تم ہو کہ بربادی کے راستے کو دعوت دے رہی ہو- یہ شخص تمہیں مکمل تباہ کر کے چھوڑے گا-''

پتا نہیں کیوں مجھے آصف بھائی کی آمد اچھی لگتی تھی بھیا چڑ جاتے تھے-

''دنیا میں رہنے کے کچھ قوانین ہیں- مذہب اور شریعت نے بھی ہمیں چند اصولوں کی پابندی کا

حکم دیا ہے- نازی -تم ضدی ہو- مگر خدارا خود کو ضائع کرنے کی کوشش تو نہ کرو-'' بھیا لجاجت سے مجھے سمجھا رہے تھے-'' تم جب تک اپنے شوہر کی زوجیت میں ہو- کسی غیر سے ملاقاتوں سے اجتناب برتنا چاہیے- یوں بھی مجھے اس شخص کا کیریکٹر پسند نہیں- وہ شروع سے تمہاری بربادی کا باعث بنتا رہا خدا کے لیے اب تو آنکھیں کھولو- اور مستقبل کے بارے میں سوچو- کیا تمہیں گل بالکل یاد نہیں آتا؟''

گل- میری بہار حیات کا اولین پھول- میں اسے بھول نہیں سکتی تھی- مگر اس کی خوشو ہواب مجھ سے بہت دور تھی- بھیا نے آصف بھائی کو آفس میں داخلے سے منع کر دیا- اس طرح کافی دن میں ان سے نہیں ملی- مگر وہ بھی بہت ضدی نکلے- گھر پر آنے لگے- بھیا نے مجھے باہر نہیں جانے دیا- انہیں کمرے میں نہ آنے دیا- باہر لان پر کھڑے ہو کر کبھی مجھے پکارتے- کبھی بے بی کو- مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی- جب ہمارے دل میں کوئی چور نہیں- تو ملنے میں کیا قباحت- میں نے اپنا کمرہ کھول کر انہیں بلا لیا- میں خود مختار تھی- اپنا حق استعمال کرنا جانتی تھی- وہ بے بی سے کھیلتے- گل کو یاد کرتے- شہناز کی باتیں کرتے اور چلے جاتے ایک روز آصف بھائی آئے- بھیا ان سے ملنے خود باہر گئے- میں جستجو میں باہر نکلی- بھیا نہایت سنجیدہ تھے-

''یا تو تم روز روز کے اس تماشے کو ختم کرو- یا پھر عزت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لو-''

''کیا بکتے ہو؟'' آصف بھائی نہایت غضب ناک ہو کر بولے-'' وہ کسی دوسرے کی بیوی ہے-''

''تم کسی دوسرے کی بیوی کو کیوں ورغلانے آتے ہو-'' بھیا طنز سے مسکرائے- آصف بھائی کی زبان کو گرفت میں لے کر انہیں خوشی ہوئی تھی-'' اس کے علاوہ- وہ میرے گھر پر ہے- میرے اختیار میں ہے- اور میں اس کی بھلائی چاہتا ہوں-''

''بھلائی -؟ جو لفظ تم نے ابھی زبان سے ادا کیے- وہ بھلائی ہے؟''

''ہاں -تم نہیں سمجھ سکتے -ایک بھائی کے نقطہ نظر سے یہی بھلائی ہے- تم اس سے شادی کر لو-''

میرا خون رگوں میں جمنے لگا- ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ ہو رہی تھی- میں چوکھٹ تھام کر زمین پر بیٹھ گئی-

''شادی؟'' آصف بھائی نے خوفزدہ ہو کر کہا-'' وہ آزاد ہو گئی ہے؟ اس کے لیے تیار ہے؟ نہیں- ارشد میں نہیں مان سکتا- ایسی ذلیل بات کی توقع بھی نہیں کر سکتا-''

''اور میں تم سے ہر نیچ فعل کی توقع کر سکتا ہوں-'' بھیا تلملا کر کہنے لگے-'' اس لیے ایک غیرت مند بھائی کی عزت سے کھیلنے کی جرات نہ کرو- ایک فیصلہ کو کرنا ہی ہو گا شادی - یا قطع تعلق-''

''ارشد!'' آصف بھائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے-'' تم لوگ کوئی بھی میرے جذبات

سے واقف نہیں ہو سکتا- بخدا- میں ایک دیوی کی طرح نازی کی عزت کرتا ہوں-''

''چھوڑو فضائی-'' بھیا کی بدگمانی عروج پر تھی-'' دیویوں کا ہمارے مذہب میں کوئی گزر نہیں- وجود نہیں-''

میں دیوار سے لگی کانپ رہی تھی- یہ تھا تمام انجام پر خلوص دوستی کا- آصف بھائی جو آپی کے شوہر بنے تو انہوں نے انہیں زندگی سے نفرت کرنا سکھا دیا- پھر وہ بے بی شہناز کے شوہر بن گئے- اس نے زندگی سے محبت سکھا دی- اس نفرت اور محبت کے درمیان میرا وجود بے معنی ہی تو تھا-

بھیا نے کئی دن مجھ سے بات نہ کی- وہ خفا تھے میں شرمسار- سب لوگ ہمیشہ مجھ ہی کو قصوروار سمجھتے رہے جیسے اور کوئی تو غلطی کر ہی نہیں سکتا- کاش کوئی بیگانہ ہوتا تو میں اپنی خطاؤں اور دوسروں کے قصور کا موازنہ کر کے بتاتی- کس نے زیادہ غلطیاں کی ہیں- اب بھیا مجھ سے- خواہ مخواہ بدظن ہو گئے- مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ اماں ابا سے ملنے جا رہا ہوں- مگر مجھے معلوم تھا وہ وجیہہ سے بھی ضرور ملیں گے- اور ان کی واپسی میں یہ قیاس صحیح ثابت ہوا-

''گل بہت بیمار ہے-'' بھیا اخبار کے پیچھے چہرہ چھپائے ہوئے تھے- میں ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکی-

''جس بچے کی ماں جیتے جی جدا ہو جائے- اور وہ حساس بھی ہو- تو صحت مند کیسے رہ سکتا ہے-''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئے- دفتر جاتے ہوئے تیار ہو رہے تھے- بولے-'' میں نے وجیہہ اور فوزیہ کو بلایا ہے-'' بریف کیس بند کرتے ہوئے عینکیوں سے میری جانب دیکھنے لگے-'' بہتر ہے گل کو کوئی بھی ماں مل جائے- جو اس کی صحیح دیکھ بھال کر سکے- فوزیہ اولاد کی ترسی ہوئی ہے وہ اس کی بہت قدر کرے گی- اور بہترین ماں بن سکے گی- اماں ابا بھی بہت پریشان ہیں- فوزیہ کو گھر ملے گا- ساتھ ہی بچہ ہے- اس سے بہتر فیصلہ اور کیا ہو گا- تمہارا کیا خیال ہے؟'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا-

''اور- پھر- میرا کیا ہو گا-؟''

''جواب ہو رہا ہے-'' بھیا تیزی سے بولے-'' آفس- افسری خوابوں کی تعبیر- تمناؤں کی تکمیل- تمہیں ایسی ہی زندگی پسند ہے- تم بعد میں بھی آفس سنبھالتی رہنا- اپنا آفس- آصف کا-''

دل پر کسی نے گھونسا مارا-'' بھیا! تم کتنے بے درد ہو بہن کا غم نہیں جانتے-''

''تمہارا کیا خیال ہے- وجیہہ سے بات کروں- فوزیہ کے سلسلے میں-؟'' پھر میری خاموشی سے اکتا کر بولے-'' اب جواب دو نا- چپ کیوں ہو؟ تمہاری علیحدگی کی بات کروں؟''

''اگر وجیہہ- آپی سے شادی پر رضامند ہو گئے- تو ٹھیک ہے-'' میں نے چڑ چڑے پن سے کہا-

''کمبخت۔'' بھیا آگ بگولہ ہو گئے۔ ''اتنا اس پر بھروسہ ہے۔ تو اس کے پاس جا کر کیوں نہیں مرتی۔ مجھے سولی پر لٹکایا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے۔ کسی قیمت پر سہی۔ میں وجیہہ کو رضامند کرلوں گا۔ پھر تو خوش ہوگی نا۔''

''ان کو رضامند کر لیجیے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''پھر میری خوشی دیکھیے گا۔ جشن منائوں گی جشن آزادی۔''

خوب۔ تو اب آخری تیر بھی میرے سینے میں پیوست کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ آپی گل کی ماں کہلائیں گی مجھے شکست دینے کے لیے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے گزرے دنوں کی یادیں۔ باتیں۔ گل کی پیدائش۔ اس کا پہلا قدم۔ اس کے منہ سے پہلی بار امی ابا کا ادا ہونا۔ وجیہہ کی محبت۔ گل سے عشق، عشق تو انہیں مجھ سے بھی تھا۔ مگر اب تو یادوں کا کارواں غبار چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا راستہ گم ہو گیا منزل کھو گئی۔ اب میری جگہ آپی لیں گی۔ انہیں ایک پرسکون گھر ملے گا۔ پیارا سا بچہ۔ اور پرخلوص شوہر جانے کیا ہوا۔ بہت ضبط کے باوجود آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ آبشار کی طرح۔ تن بدن ایک تپتی چلچلاتی ریت میں دھنسنے لگا۔ دھوپ میرے انگ انگ کو جھلسانے لگی۔ پوری رات روتے تڑپتے گزر گئی۔ پورا دن کمرے میں بند ہو کر۔ بھیا نے دروازہ توڑنے کی قسم کھائی تھی شاید تنگ آ کر میں نے کھٹکا کھول دیا۔ غصے سے تمتمایا چہرہ لیے مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔ کیا؟'' میں اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ہاں۔ بہت ضروری کام ہے۔'' وہ چلانے لگے ''وجیہہ آ گیا ہے۔ اور وہ اس شرط پر علیحدگی کے لیے تیار ہے اگر۔''

جانے بھیا کیا کہہ رہے تھے۔ اس سے آگے میں نے کچھ سنا ہی نہیں میرا جسم میرے قابو میں کب رہا تھا۔ حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ کان میں کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ دھمک دھمک۔ سانس رکی جا رہی تھی۔ میرا سارا غرور میرا اعتماد ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ لڑکھڑا کر بھیا کے قدموں میں گر گئی۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ زندگی کی خواہش۔ کچھ کر کے دکھانے کا عزم۔ اپنی معصومیت ثابت کرنے کی جرات آموز کوشش میں بے نام ہو گئی۔ بے جان ہو گئی۔ کتنی دیر بعد بھیا کی آواز پھر سے سنائی دی۔ اور ایک بار پھر اس صدمے کے اثر سے بیہوش ہو گئی۔ پھر ہوش آیا۔ بھیا نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''پگلی۔ پوری بات تو سنی ہوتی۔'' وہ گلوگیر آواز میں بول رہے تھے۔ ''میں نے تمہیں موت کی سزا تو نہیں سنائی تھی۔''

''بھیا کیا ہوا۔ کیا سچ مچ۔''

''کیا سچ مچ؟'' وجیہہ نے کہا ہے اگر نازی اپنی زبان سے گل کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ اسے علیحدگی چاہیے تو وہ یہ خواہش بھی پوری کر دے گا۔ پگلے میرا یار۔ جب پہلی بار میں نے اسے یہ تجویز سنائی تھی۔ اس کی بھی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ ارے پاگلو یہ جھوٹی خودداری اور مصنوعی ضد کے تعاقب میں کب تک جدائی کے عذاب سہو گے تم لوگ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ اب بھی دونوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے کے نام پر زندہ ہیں۔ میں نے تو محض آزمائش کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی۔ کہ کسی طرح ناؤ ساحل نہیں لگتی۔ تو ڈوب ہی جائے۔ مگر جس کشتی کے تم دونوں کھویا ہو۔ اس کا ڈوبنا مشکل۔ پار لگنا بھی۔ اب ہوش کرو۔ میرے کمرے میں وجیہہ اور گل بیٹھے ہیں۔ بے بی کو لے جاؤ۔ اپنے ساتھ اسے بھی بھوکا مار دیا تم نے۔''

بھیا کے کمرے میں پوری بارات اتری تھی۔ اماں ابا۔ آپی۔ وجیہہ، نادیہ افروز۔ روشن آپا۔ خوابوں کی تعبیریں کتنی دلکش ہوتی ہیں۔ اور جو خواب جاگتے میں دیکھے جائیں۔ ان کو کبھی نہ کبھی تعبیر ملتی ہے۔ میرا اعتقاد ہے۔ اماں کی پرشوق بانہیں میرے جسم کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ابا کے لرزتے ہاتھوں کا سایہ میرے سر پر تھا۔ رحمتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور میں اس آب حیات کا ذائقہ محسوس کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اماں ابا کے بازوؤں میں میرا نچلا لے کھاتا جسم تھا۔ پتھر کی چٹان موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ میں اماں میں، اماں مجھ میں سمانے کی کوشش کر رہی تھیں برسوں کی حسرتوں نے اپنا مقام پالیا۔ ضبط و برداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور میرے حلق سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ سب پریشان ہو گئے۔ کوئی پانی لا رہا ہے کوئی دودھ کو رامن لاؤ۔ گلوکوز دو۔ انجکشن لگواؤ۔

بھیا باہر کھڑے بھرائی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''رونے دیں اماں اسے رونے دیں۔ برسوں کی بچھڑی ہوئی کونج اپنے قافلے سے ملی ہے۔ روئے گی نہیں تو کیا قہقہے لگائے گی۔''

میری چیخیں کسی طرح نہ تھمیں تو وجیہہ نے آگے بڑھ کر ایک زور کا تھپڑ میرے منہ پر لگایا۔ جانے اس تھپڑ میں کیا تھا۔ چیخیں رک گئیں۔ آنکھیں بہنے لگیں۔ پھر روشن آپا نے گل کو میری گود میں بٹھا دیا۔ گل کے لمس نے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ اف خدایا۔ اتنے برسوں سے میں اماں کی آغوش کے لیے ترستی رہی تھی۔ ان کی محبت کی متلاشی تھی۔ میں بیٹی تھی۔ اور جب ماں بنی تو جدائی کا سمندر اپنے اور گل کے درمیان موجود پایا۔ یہ خود ساختہ سمندر۔ میرا ہی پیدا کردہ تھا۔ میں کیسی ماں ہوں۔

میں نے اماں کو دیکھا۔ اماں نے مجھے۔ میں نے گل کو آغوش میں سمیٹ لیا۔ میں اماں کی بانہوں میں تھی۔ گل میرے بازوؤں میں۔ اور ابا نے ہم سب کو اپنی وسیع آغوش میں سمو لیا۔ بچھڑے ہوئے یوں ملے جیسے لہر لہر سے مل جائے۔ ملن رت آ گئی تھی۔

بہکا ہوا موسم- مہکی ہوئی فضا- کوئی رنجش رہی نہ محرومی کا شکوہ- اب سوچتی ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے- میرے وہ گزرے ہوئے سال- جدائی کے دن- فراق کے لمحے- کس خواہش کے تحت گزرے- اقتدار کی خواہش مجھے نہ تھی کوئی بے لوث مضبوط بے شکن محبت کرے- میں ہزار بار غلامی کے لیے تیار ہوں- آج بھی- رہا کاروبار- تو بخدا- میرا اس سے کوئی تعلق نہیں-

پہلی بار ہی میں نے آصف بھائی سے انکار کر دیا تھا- میرے دستخط لینے کا یہ قصہ تھا کہ آصف بھائی کسی قانونی رکاوٹ کی وجہ سے اس کاروبار میں اپنا نام استعمال نہیں کر سکتے تھے- محض نمائشی طور پر میرا نام فائلوں میں درج تھا اور آصف بھائی صرف مجھے زچ کرنے والوں کو زچ کرنے کے لیے اس راز سے پردہ نہیں اٹھاتے تھے- بہت شریر ہیں آصف بھائی- میرے خیر خواہ مگر- میرے ساتھ ہی ناکردہ گناہی کے مجرم ٹھہرائے گئے- آپی کی غلط فہمیاں اور نازک مزاجی نے مشتعل فطرت احساس کمتری کے باعث اپنی زندگی خود ہی تباہ کر لی- کسی دوسرے کا اس میں ذرہ بھر دخل نہ تھا-

جگ مگ تاروں سے بھرا آسمان آج بھی زمین پر محبتوں نوازشوں عنایتوں کی بارش کرتا ہے- ہمیشہ کرتا رہے گا- تاابد- زمین بھی شکرانے کے لیے اس کے سامنے بچھی رہتی ہے- یہ قانون قدرت ہے- اور قدرت بہت مہربان- میں نے اپنی زندگی سے یہی سبق سیکھا ہے- صبر و برداشت عزم و اٹل ارادے ہر مشکل کو آسان کر دیتے ہیں- مایوسی کے بجائے حوصلہ بڑھاتے ہیں- زندہ رکھتے ہیں- زندگی ہی ہمتوں کی پہچان ہے-

☆☆ ☆☆

اس ایک خواب کو سوچا تھا بہت....

وقت جو کسی قانون کا پابند نہیں- کسی نظریے' کسی فلسفے کا قائل نہیں- ہر حالت میں گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جاتی ہیں- موسم بدلتے رہتے ہیں- ثبات کہاں ممکن ہے- انسان غفلت کا شکار- تبدیلی کو خوشی کا ذریعہ بنا لینے پر کوشاں- تبدیلی موسم کی ہو' حالات کی یا واقعات کی- تجربوں سے گزر کر کبھی خوشی کا ذریعہ بنتی ہے' کبھی ناخوشی کا انسان مجبور ہے- ایک طاقت کے سامنے- قدرت کے آگے ورنہ اس نے اپنی قوت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے- سائنس کے ذریعے- ذہانت سے ترقی حاصل کی ہے- لیکن اسے خدائی کا اختیار نہیں- گو کہ بعض لوگ خدا بن جانے کی آرزو کرتے رہتے ہیں-

یہ دنیا بھی عجیب ہے- کبھی خوشی کے رنگ اوڑھ کر سارے دکھ بھلا دیتی ہے' کبھی دکھوں کے سمندر میں خوشیوں کے جہاز ڈبو دیتی ہے- ثناء اپنی کم عمری کے باوجود دنیا کے بہت سے رنگ دیکھ چکی تھی اور اب اس نے حیران ہونا کم کر دیا تھا- اسے آس پاس کی رنگ برنگی دنیا نے تجربے مشاہدے سے گزارا تھا- وہ خود کو کافی عقل مند سمجھتی تھی- یہ احساس اسے ابھی کچھ دن پہلے ہوا تھا

بلکہ جب سے فریال ان کے گھر آئی تھی- فریال نے دنیا کا بس ایک رنگ دیکھا تھا- خوشی' سکھ آرام کا رنگ جبکہ ثناء نے اور بہت کچھ دیکھا اور سمجھا تھا-

اس دن صبح ہی سروری خالہ نہ جانے کون سا مسئلہ حل کرنے آئی تھیں- گھنٹہ بھر سے اماں کے پلنگ پر سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں- اب ثناء کو فت میں مبتلا سوچ رہی تھی- یہ سروری خالہ اماں سے اتنی نزدیک بیٹھی کھسر پھسر کر رہی ہیں اور اپنے سر سے پلی پلائی جوئیں اماں کے بالوں میں منتقل کر رہی ہیں- شام تک اماں سر کھجا کھجا کر زخم ڈال لیں گی- آدھی رات کو بے چین ہو کر کنگھی کی تلاش-

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آج وہ اماں سے دوپہر کے لیے پکنے کا مشورہ نہیں کر سکی- اب اگر انہیں فرصت ملی بھی تو نظر اٹھا کر اس کے سوالیہ چہرے کے تاثرات دیکھنے کی تو خفا ہوں گی کہ وہ خود اپنی عقل کیوں استعمال نہیں کرتی- گھر میں گوشت بھی تھا- سبزی بھی- مگر شاید سروری خالہ کھانا کھا کر جائیں- اماں انہیں روکتی تھیں- کبھی کبھار آتی تھیں یہ خالہ اماں سبزی کی دلدادہ- فریال سبزی کے نام سے الرجک- سروری خالہ بھی کھانے کی شوقین-

مگر ابھی تو ان کی کانفرنس کے خاتمے کا امکان نہ تھا کہ پاندان کے ڈھکن کھلنے بند ہونے کی آوازیں تواتر سے آ رہی تھیں- وہ بلی کو گود میں لیے بیٹھی انتظار کر رہی تھی- آخر کار انہی-

صحن کی دیوار کے ساتھ پلنگ پر فریال بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی- سورج اس کے منہ پر تھا- جب سورج دیوتا کی شوخیاں مزید بڑھیں تو فریال جھلا کر کھڑی ہو گئی-

''ثناء' ثناء!'' اس کی چیخیں سن کر ثناء اس کی طرف دوڑی آئی-

''یہ تمہارے گھر کا رخ کتنا غلط ہے- دیکھو عین منہ پر سورج آتا ہے- یہ دیوار اگر اس طرف ہوتی تو کیا حرج تھا- سورج منہ پر تو نہ پڑتا-''

''دیوار اس طرف ہے- مگر ادھر دھوپ نہیں ہے اور تمہیں دھوپ چاہیے- جو سورج کے چھپے بغیر نہیں ملتی-

''ہاں مگر ضروری تو نہیں کہ منہ پر ہی ہو- یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سورج پیچھے سے آتا-''

''تم سورج سے کہو- وہ تمہارے سر کے پیچھے سے طلوع ہوتا کہ تمہارا منہ شعاعوں سے محفوظ رہے-''

''ایسا مشورہ تم دے سکتی ہو- بقراط کی خالہ جان-'' فریال چڑ گئی-

''تو بھئی' دیوار تو اب ہٹ نہیں سکتی-'' ثناء نے کندھے اچکائے-

فریال کھڑی ہو کر اسے گھورنے لگی- پھر اس نے پلنگ کو دیوار سے دور ہٹایا اور مخالف سمت منہ کر کے بیٹھ گئی- اب سورج اس کی پشت پر تھا- غصے سے بولی-

''اتنی سی بات تم مجھے بتا نہیں سکتی تھیں-''

''بتا سکتی تھی- مگر تم ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدلنے پر اصرار کرنے لگیں-'' ثناء مسکرائی-

''خیر- گھر کا نقشہ کیا بدلتی- میں تو لوگوں کے نقشے نہیں بدل سکتی-''

''لوگوں سے مراد اگر سرفراز بھائی ہیں تو اطمینان رکھو- وہ جیسے ہیں- ویسے ہی رہیں گے- میں انہیں بیس سال سے ایسا ہی دیکھ رہی ہوں- تم دو چار دن میں کیسے بدل لو گی-''

''بدلیں گے نہیں تو ترقی بھی نہیں کریں گے- یہ بہت تیز رفتار زمانہ ہے- جو زمانے کا ساتھ نہ دے- گا- وہ پیچھے رہ جائے گا- سمجھا' اپنے بھائی کو-''

فریال کو سرفراز کی سادگی پسند تھی نہ شائستہ انداز' وہ شوخ و شریر لڑکی چاہتی تھی سرفراز اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرے' تفریح کے لیے لے جائے- کبھی کبھی' بہت شاندار لگ رہی ہو- کبھی اس کے لباس کو سراہے- کبھی ذہانت کی داد دے- مگر سرفراز- اس کو حماقت کی ملکہ' بدھوؤں کی شہزادی اور بے عقلوں کی شاگرد کہہ کر غصہ دلاتا تھا- فریال کو غصہ بہت جلد آتا تھا- اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی- وہ تن فن اِدھر سے اُدھر پیر پٹختی- ثناء اس کے مزاج کا خیال رکھتی تھی-

''آج کھانا نہیں پکے گا؟'' فریال کے یاد دلانے پر ثناء کو ہوش آیا- وہ کچن کی طرف دوڑی- سروری خالہ اور اماں کے مذاکرات ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے-

جو کچھ کرنا تھا' جلدی ہی کرنا تھا- اس نے فٹافٹ گوشت بگھارا- آلو گوبھی' گاجر چھیل کر کاٹ کر رکھی مٹر فریال چھیلنے لگی- ساتھ ہی کھاتی جاتی اور باتیں بھی کرتی رہی- ثناء نے ٹوکا تو بولی-

''مٹر نہ کھاؤں تو کیا تمہیں کھالوں- اتنی بھوک لگی ہے- بابا کے ساتھ ناشتا کیا تھا میں نے- صبح سویرے-''

''میں نے بھی اسی وقت کیا تھا- مجھے تو بھوک نہیں لگی-''

''تمہارا کیا ہے- بھوک پروف ہو تم' پتا ہے میں گھر میں سارا دن کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی-''

''ہوں' یوں کہو چرتی رہتی تھی- گائے بکری کی طرح-'' ثناء نے مذاق اڑایا-

فریال اسے گھورنے لگی- پھر بولی- ''میری خالہ اور مامی تو کہتی ہیں کہ فریال کچھ کھاتی نہیں- خوراک ہی نہیں ہے کچھ- اسی لیے سوکھتی جا رہی ہے- وہ کہتی ہیں کھایا کرو بیٹا- اللہ نے نعمتیں دی کس لیے ہیں-''

''واقعی- مگر تم تو دن بھر کھاتی ہی رہتی ہو- اسی پر ایک محاورہ ہے- کھائے بکری کی طرح سوکھے لکڑی کی طرح-''

شلغم سبزی بگھار چکی تھی- اب چاول چننے لگی-

فریال نے گھبرا کر کہا- ''ارے ارے- یہ کیا؟ ابھی چاول بھی بنیں گے- گوشت ہے' سبزی ہے'

یہ کم ہے کیا؟''

''سروری خالہ آئی ہوئی ہیں- اماں انہیں کھائے بغیر جانے نہیں دیں گی- اس لیے چاول بنا رہی ہوں-''

''تو کیا وہ بہت زیادہ کھاتی ہیں-''

''نہیں بھئی' دراصل وہ مہمان ہیں- ان کی خاطر کچھ تو کرنا پڑے گا-'' شاہ نے کہا-

''ہاں- یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ تم مہمانوں کی خاطریں بہت کرتی ہو- میں جب سے آئی ہوں- نت نئے کھانے کھلا کھلا کر مجھے موٹا کر دیا ہے-''

اماں نے کچن میں آ کر پوچھا- ''کیا پکا رہی ہو ثر کیو؟''

''لڑکی پکا رہی ہے- میں تو بک بک کر کے اس کے کان کھا رہی ہوں-'' فریال نے کہا-

اماں نے ہانڈیاں کھول کر چیک کیں- چاول دم پر تھے- اماں نے شاہ کو شاباش دی-

''شاباش' تم نے اچھا کیا مٹر پلاؤ بنا لیا- سروری آپا کے دانت دکھاوے کے ہیں- وہ روٹی نہیں چبا سکتیں-''

سالن لذیذ- سبزی خوش رنگ' خوش ذائقہ- مٹر پلاؤ خوشبودار- یہ ریمارکس سروری خالہ کے کھانے کے لیے تھے- سروری خالہ اماں کی دور کے رشتے سے بہن ہوتی تھیں-

اماں ان کے آنے پر خوشی ہوتی تھیں' اس لیے شاہ بھی ان کا لحاظ کرتی تھی-

رات کو شاہ نے کباب بنائے- کھانا دن کا رکھا تھا- سبزی خوب بھون کر مٹر پلاؤ کے اوپر بچھا دی- اس پر ہری مرچ' ہرا دھنیا کاٹ کر ڈالا اور توے پر چاول رکھ دیے-

گوشت میں آلو تل کر ڈالے- کھانا بالکل تازہ ہو گیا- فریال کے ابا کو بہت پسند آیا- انہوں نے شاہ کو انعام میں سو روپے کا نوٹ دیا- شاہ سلام کرتی ہوئی باہر آئی' فریال نے کہا-

''بتا دوں بابا کو اس کھانے کی تاریخ-''

''تاریخ' جغرافیہ- سب کچھ بتا دو- اس کی لذت کو چیلنج نہیں کر سکتیں محترمہ-'' شاہ خوش تھی-

''میں کیوں چیلنج کروں گی- تمہیں اتنی ترکیبوں کے کھانے آتے ہیں' میں صرف حیران ہوتی ہوں- میں تو سوچ کر بھی نہیں کر سکتی- تمہیں یہ نسخے کس نے سکھائے' پھپھو نے؟''

''بھئی نسخہ نہیں ہے یہ- موقعے کی ڈش ہے- اس کا نام ہے-''

''ڈش اینڈ نیا-'' فریال نے جملہ پورا کیا اور ہنس پڑی-

فریال پھوپھو کے گھر کافی دن کے بعد آئی تھی- پچھلے سال تو خالہ اسے گرمی کی چھٹیوں میں کاغان لے گئی تھیں- اس بار مامی کے ساتھ مری جانے کا پروگرام تھا- سنو فال دیکھنے کے لیے- مگر بابا اسے لاہور لے آئے- حالانکہ اسے برف باری دیکھنے کا بہت ارمان تھا- مگر بابا نے کہا- تم

برف باری پھر بھی دیکھ سکتی ہو- میں لاہور جا رہا ہوں- آپا پرا مانیں گی کہ تم کو نہیں لایا' تمہارا پوچھیں گی- تو میں کیا کہوں گا-''

''یہی کہ وہ برف باری دیکھنے مری جا رہی ہے-''

''میری بیٹی زندہ سلامت رہے- میں ایسے لفظ اس کے لیے نہیں کہہ سکتا-''

اسے پھپھو سے خاص لگاؤ نہ تھا- پہلے جب بھی وہ آتی' اس کی امی اسے پھپھو سے دور رکھنے کی کوشش کرتیں- پھپھو کی برائی کرتیں- ان کی محبت کو دکھاوا ان کے سلوک کو تصنع کا نام دے کر وہ اسے بدظن کرتی تھیں- پھر یہ کہ ننھیال سے وہ مانوس تھی' قریب ہونے کی وجہ سے- لاہور تو بہت کم آنا ہوتا تھا- ماموں خالہ نزدیک ایک شہر میں تھے- پھر اس کی امی کی وفات کے بعد ماموں خالہ اس پر توجہ زیادہ دینے لگے- قدرتی طور پر وہ ان سے زیادہ ہی نزدیک ہوتی گئی- یوں بھی اپنی ماں کی وہ بھتیجی جو وہ اپنی تند پر کسا کرتی تھیں' مضحکہ اڑاتی تھیں- پھپھو کی جزرسی پر طنز کرتیں- اسے یاد تھیں حالانکہ پھپھو تو ہمیشہ حیثیت سے بڑھ کر خاطر تواضع کیا کرتی تھیں-

جب بھی بابا ان لوگوں کے ساتھ پھپھو کے گھر آتے پھپھو کی خوشی کی حد نہ ہوتی- مگر فریال کی امی کی تیوری پر بل ہی رہتے- وہ بہت نکتہ چیں قسم کی خاتون تھیں- فریال نے ماں کا اثر قبول کیا تھا- انہیں اپنے خوشحال میکے کا غرور تھا- گو کہ خود بھی خوشحال تھیں بابا خوب کما رہے تھے- میکے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خود میاں کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹاری تھیں- انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر کچھ پیسہ بچ گیا تو وہ اپنی بہن کا گھر بھر دیں گے- یہی وجہ تھی کہ ان کو اپنا گھر بنانے کا موقع ہی نہیں ملا-

پھر جب امی کا انتقال ہوا- پھپھو کافی دن اس کے پاس رہیں- تو اسے ان کی محبت میں سچائی اور گہرائی نظر آئی اور اب جو وہ آئی تھی تو شاہ سے اس کی خاصی دوستی ہو گئی- امی نے اسے ان لوگوں کے قریب ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا- جب وہ یہاں آتی' پھپھو اسے کھلونے' چوڑیاں اور کپڑے دیتیں- گھر جاتے ہی امی انہیں کام والی مامی کے حوالے کر دیتیں- خواہ وہ فریال کو کتنے ہی پسند ہوتے- اب کافی دن بعد آنا ہوا تھا- تو پھپھو' پھپھا' شاہ اور سرفراز سب اس کا خیال رکھتے-

پہلے تو شاہ بھی مہمانی کے تیور فریال کا گریز دیکھ کر زیادہ فری نہیں ہوتی تھی- اس کی پڑھائی بھی خاصی محنت طلب تھی- پڑھنے کا بہانا کر کے وہ مہمانی سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی- مگر اب وہ اپنے گھر کی کرتا دھرتا اور فریال بھی ملتفت ہے- بی ایس سی کر کے اب اس کا پروگرام ایم ایس سی کرنے کا تھا مگر اماں اسے گھر داری کے رموز سکھانے پر کمربستہ' کیا معلوم ..... قسمت میں کیا لکھا ہے' سسرال کیسی ہو' لڑکیوں کو تمام ہنر آنے چاہئیں شاہ ایسی فرماں بردار کہ چپ چاپ گھر میں مصروف

ہوگئی- فریال کی حیرت پر کہتی کہ یہ بھی تعلیم کا ایک حصہ ہے- اگلے سال داخلہ لے لوں گی- بہت مطمئن تھی ثناء-

''تم کو زندگی میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا-'' فریال کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا-

''کمی ہے نہیں- تو احساس کیوں ہو-''

''یعنی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح ہر خواہش کا پورا نہ ہونا- کم آمدنی میں گزر کرنا-''

''ہزاروں نہیں لاکھوں سے بہتر زندگی ہے اور میں فضول خواہشوں کے چکر میں نہیں پڑتی-'' ثناء کے لہجے میں اطمینان تھا- ''پڑھی لکھی ہوں- کام کاج کر سکتی ہوں- صحت مند ہوں اور کیا چاہیے-''

''اور کچھ نہیں چاہیے؟'' فریال پر حیرت کے در وا ہو رہے تھے- ''اگر ملا تو لوگی نہیں؟''

''اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہے- قدرت نے کرم کیا- کچھ اور بھی دیا- تو شکر کے ساتھ وصول-''

ثناء ہنسنے لگی- فریال تعجب سے اسے دیکھنے لگی- ''یوں کیا دیکھ رہی ہو؟ بھئی جب سے میں نے اماں کے حکم پر گھر داری میں دلچسپی لی ہے- مجھ میں بڑا اعتماد آ گیا ہے اور لگتا ہے کہ مجھے سب کچھ آ گیا ہے- اب میں ہر چیز خود حاصل کر سکتی ہوں- کوئی کام مشکل نہیں لگتا-''

''کمال ہے- کھانا پکانے سے اتنی خود اعتمادی؟''

''صرف کھانا پکانا نہیں- گھر کی ضروریات' لوگوں سے تعلقات' لین دین اور رویے' عمل کے لیے تجربہ ضروری ہے- اب ہی تو مجھے پتا چلا کہ عزت نفس کیسے محفوظ رکھی جا سکتی ہے- پہلے میں اماں کے اشارے پر ہی سب کچھ کرتی تھی- اب مجھے خود سوچنا پڑتا ہے اور میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں-''

''تم کتنی بڑی بڑی باتیں کر لیتی ہو- کیا یہ سب بھی سیکھنا پڑتا ہے کھانا پکانے کے علاوہ-''

''بھئی آپ کے گھر بے شک خانساماں ہے- لیکن آپ کو کھانے کی پہچان آنی چاہیے- اسی طرح دیگر معاملات میں واقفیت ضروری ہے- تم بھی کچھ سیکھ لو- شاید کبھی ضرورت پڑ جائے-''

''شکریہ- مجھے اناڑی رہنے دو- آ گیا تو کرنا بھی پڑے گا اور ویسے ماموں کے گھر نوکروں کی فوج ہے- کسی کو خود کرنا نہیں پڑتا-''

''میں سسرال کے لیے کچھ سیکھنے کو تو نہیں کہہ رہی- اپنے گھر میں بھی کرنا پڑتا ہے- سیکھنے میں کوئی نقصان تو نہیں- صرف کھانا پکانا ہی ہنر نہیں ہوتا اور بھی کئی کام ہوتے ہیں-''

''ہر کام کے لیے نوکر ہوتے ہیں- ویسے ماموں بہت دولت مند ہیں- فکر نہ کرو- مجھے کچھ کرنا نہیں پڑے گا-''

فریال مذاق مذاق میں اسے اس کی حیثیت یاد دلا رہی تھی- دراصل امی کی زندگی میں ہی ماموں

اپنے بیٹے سے فریال کا رشتہ طے کر چکے تھے- گو کہ بابا کو اعتراض تھا- مگر ابھی معاملہ معلق تھا- فریال کے ماموں کی طرف جھکاؤ نے بھی بابا کو صاف انکار کرنے سے روکا ہوا تھا اور وہ ابھی زیر تعلیم تھی- ماموں کی طرف سے شادی کا تقاضا نہیں ہوا تھا- شہریار کے ایم بی اے میں بھی دیر تھی-

''ایک بات بتاؤ فری!'' ثناء سنجیدہ ہوگئی- ''یہ جو بہت زیادہ دولت مند ہوتے ہیں- ان میں احساس کی کمی ہوتی ہے- کچھ کچھ بے مروتی ان کے خون میں شامل ہو جاتی ہے- ممکن ہے تمہاری مومانی تم سے توقع رکھیں اور پھر انہیں مایوسی ہو- اس وقت سے ہوشیار-''

''میری مامی' او ہو ہو-'' وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی- ''ارے بابا! انہیں خود کچھ نہیں آتا- وہ مجھ سے کیا توقع کریں گی- وہ بھی مل اونر کی بیٹی ہیں- بابا! نوکر آخر کس لیے ہوتے ہیں-''

ثناء چپ ہوگئی- فریال میں برداشت کی کمی تھی- اکلوتی ہونے کے خوب فائدے اٹھاتی- غصے میں ہوش کھو دیتی- ثناء سوچتی کہ زیادہ نصیحت فریال کو اس سے برگشتہ نہ کر دے ورنہ وہ تو یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ فرض کرو کسی وجہ سے ماموں مومانی یا ان کا بیٹا تم کو ریجیکٹ کر دے- پھر تمہارا ٹھکانا ہمارے جیسے متوسط گھرانے میں ہوگا- مگر وہ کچھ نہ کہتی کہ کبھی فریال نے زبان کھولی اور بے دھڑک کہہ دیا کہ تم میری خوش قسمتی سے جلتی ہو-

وہ باتوں باتوں میں سناتی رہتی تھی کہ منہ سے جس چیز کا نام لیتی ہے بابا فوراً مہیا کرتے ہیں- ورنہ وہ ماموں سے طلب کر لیتی ہے- مامی اس کی ہر خواہش پوری کرنے میں مستعد رہتیں- اسے شہریار کی شاندار شخصیت نے مسحور کر رکھا تھا-

شہریار کا معیار زندگی' اعلیٰ درجے کا لباس- اس کی تعلیم' مشاغل' شوق' سب کچھ فریال کی پسند- اس کے مزاج کے مطابق تھے- پھر شہریار نے خود اس کو پسند کر کے خواہش ظاہر کی تھی- وہ اکثر سرفراز کو شہریار کی مثال دے کر چڑاتی- سرفراز ہنس کر ٹال جاتا' ثناء کو برا لگتا- سرفراز کے لباس کو اوٹ پٹانگ' بے جوڑ غیر معیاری غایت کرنا فریال نے فرض سمجھ لیا تھا-

''جب شہریار خاندانی دولت کما لوں گا- تو میں بھی قیمتی لباس کا حقدار ہوں گا- وہ تو باپ کی دولت اڑا رہے ہیں- میں اسے گناہ سمجھتا ہوں- میں اپنے باپ کے مسائل بڑھانا نہیں چاہتا-''

سرفراز کے جواب پر فریال چپ ہوگئی- کبھی وہ ثناء کو دلچسپیوں سے بے نیاز دیکھ کر کہتی-

''مجھے یقین نہیں آتا' تم مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑی ہو- لگتا ہے تم میں تمہاری دادی کی روح سما گئی ہے- کوئی تفریح نہیں' گانوں کے شوق نہیں' فلمیں نہیں دیکھتیں' فیشن سے واسطہ نہیں اور کام' میرے خدا میں ابھی سوچ رہی ہوتی ہوں تم کر گزرتی ہو-''

ثناء ہنس دیتی- ''تم بچی ہو- تمہارے طبقے میں پچیس برس کی لڑکی بچی کہلاتی ہے اور میرے معاشرے میں بیس سال کی لڑکی عورت ہوتی ہے- بے نیازی بے پروائی ہم افورڈ نہیں کر سکتے

شوق کے لیے کچھ اور لوازمات چاہئیں۔ جو ہم مہیا نہیں کر پاتے اس لیے میری بہن! ہم جس کنویں میں سانس لے رہے ہیں۔ وہی ہمارا مزاج ہے۔''

''تمہارا دل تو چاہتا ہوگا۔ پکنک پارٹی۔ ہوٹلنگ وغیرہ۔''

''کبھی کبھی یہ عیاشی ہم کر لیتے ہیں۔'' ثناء ہنسی۔ ''بالکل ہی کنویں کے مینڈک نہیں ہیں اور اس وقت بھی میرے ذہن میں وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو میرے جیسی ہیں مگر انہیں یہ کبھی کبھی کی تفریح بھی میسر نہیں۔''

''کمال ہے۔ کیسا ذہن ہے تمہارا۔'' فریال دنگ ہوگئی۔ ''انجوائے کرنے کے بجائے کڑھتی ہو دوسروں کے لیے' میں تو' میں تو سب کچھ بھلا دیتی ہوں۔ ہر طرح خوشی حاصل کرتی ہوں۔ ہر موقع پر زیادہ ہی ہلا گلا۔ بھئی اللہ نے ہمیں موقعے عطا کیے ہیں۔ اس سے خوب لطف لینا چاہیے جی بھر کے۔ نہ کہ دوسروں کے لیے فکریں پال کر اپنا مزا کرکرا کرلیں۔''

ثناء اسے غور سے دیکھنے لگی۔ فریال ہنس دی۔ ''کیوں میری شکل پہلے نہیں دیکھی۔''

''غور سے نہیں دیکھی۔ آج دیکھ رہی ہوں۔'' ثناء بھی ہنسی۔ ''بھائی ٹھیک کہتے ہیں تم بہت بدھو ہو۔ ارے جتنی ہر بات کا جواب ضروری تو نہیں ہوتا۔'' ثناء کہہ کر کسی کام میں مصروف ہوگئی۔

فریال سوچتی رہی اس کا کیا مطلب۔ بابا شام کو آئے۔ تھکے ہوئے تھے۔ ثنا فوراً چائے لے آئی اور ان کے کندھے دبانے لگی۔ وہ منع کرتے رہے۔ ثناء نے کہا۔

''ارے ماموں! کبھی کبھی تو آپ کی خدمت نصیب ہوتی ہے۔ آپ اتنا کام کرتے ہیں۔ میں تو ایسا دباتی ہوں کہ ابا کہتے ہیں ساری تھکن اتر جاتی ہے۔''

''تم بھی تو تھکی ہوئی ہو۔ میں دیکھتا ہوں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہو۔ کبھی خالی بیٹھے نہیں دیکھا تم کو۔ کبھی آرام بھی کر لیا کرو۔''

''رات کو آرام کرتی ہوں' ماموں! اماں تو کہتی ہیں۔ میں نکمی کام چور ہوں۔''

''مذاق کرتی ہیں۔'' کہہ کر ماموں نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور ثناء کی گود میں ڈال دی۔

وہ پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ ''یہ کیا ہے ماموں جان؟''

''بیٹا! کچھ بھی نہیں۔ تمہارا حق ہے۔''

''نہیں ماموں جان! میں نہیں لے سکتی۔'' وہ بے حد سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے رقم واپس کرنی چاہی۔

''ارے پگلی! اپنا حق تو چھین کر لینا بھی جائز ہے۔ یہ تو میں خود دے رہا ہوں۔''

ثناء نے اپنی ماں کو بتایا۔ وہ بھی پیسے واپس کرنے لگیں۔ غرض یہ بحث چلتی رہی۔

فریال کچھ چپ سی ہوگئی۔ باہر نکل کر اس نے ثناء سے سرسری سا پوچھا۔ ''بابا پہلے بھی تم کو پیسے دیتے ہوں گے۔ اب تم انکار کیوں کر رہی تھیں۔''

''پہلے ماموں جان ہمارے پاس کب آ کر رہے تھے۔'' ثناء اس کا مطلب سمجھ گئی۔ ''مومانی ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے کپڑے تحفے کے نام پر دے جاتی تھیں۔ میں نے کم از کم کبھی بھی ماموں جان سے کچھ نہیں لیا۔''

''پھپھو نے تو لیا ہوگا وہ بھی تو انکار کر رہی تھیں۔''

ثناء کو فریال کا جملہ اچھا لگا نہ لہجہ۔ ''وہ بڑی بہن۔ چھوٹے بھائی سے لیتے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔ ماموں جب یہاں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اماں ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیا کچھ ماموں کو دے دیں۔ جب وہ ہوسٹل جا رہے ہوتے اماں ان کی جیبوں میں نہ جانے کیا کچھ ٹھونستی جاتی تھیں۔ ماموں انکار کرتے جاتے' مگر ان کو مجبور ہونا پڑتا۔ یہ بھائی بہن کے معاملے ہیں فری! مسکرا کر بات کر لینا یا سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنا بھی لین دین کے زمرے میں آتا ہے۔ پیسہ تو ثانوی چیز ہے۔ مقدم چیز تو محبت اور رواداری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوست دشمن میں تفریق نہ ہو۔''

''میرا کوئی بھائی نہیں ہے اس لیے میں کسی قسم کے لین دین سے واقف نہیں۔'' فریال منہ بنا کر بولی۔

''بھئی اماں تو ہماری اپنے چچا زاد' خالہ زاد بھائیوں سے بھی ایسے روابط رکھتی ہیں۔ ابھی تک انہیں عیدی دیتی ہیں۔ چھوٹے ہیں اماں سے اس لیے۔''

''میں؟ عیدی؟ ابھی تک؟'' فریال دنگ رہ گئی۔

''جی۔ اماں کہتی ہیں چھوٹے موٹے تحفے' معمولی رقم عیدی کی۔ بظاہر معمولی سہی مگر محبت اخلاص کی ضمانت ہوتی ہے اور ان ہی رابطوں کے ساتھ ہم بندھے رہتے ہیں' دکھ سکھ کے شریک بن کر۔''

فریال نے ماموں خالہ کے ہاں ایسے رابطے نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے وہ چپ ہوگئی۔ مگر دل میں ایک پھانس تھی۔ وہ بابا کے سامنے نکلی۔ وہی سوال۔

''بابا! آپ پہلے بھی پھپھو کو دیتے ہوں گے۔ اب کیوں واپس کر رہی تھیں پھپھو۔ کیا پیسے بہت تھے۔''

''نہیں میں نے ان کو کبھی دیا نہیں۔ ان سے لیا ہی ہے۔'' بابا نے اسے حیران کر دیا۔ ''اس بار میں آفس کے کام سے آیا ہوں۔ مجھے ہوٹل میں ٹھہرنے کا خرچ ملا ہے۔ وہی بچت میں نے بہ اصرار آپا کو دے دی۔ وہ بھی تو ہم پر خرچ کر رہی ہیں۔ اتنا خیال کرتی ہیں۔ ثناء کتنے مزے مزے کے کھانے پکا کر کھلاتی ہے۔ اتنا لطف اور آرام ہوٹل میں کہاں ملتا۔'' بابا نے سمجھایا۔

''بابا! ثناء بتا رہی تھی پھپھو آج بھی اپنے چھوٹے کزنز کو عیدی دیتی ہیں۔ ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔''

''ان کے پاس پیسہ کم ہے' دل بڑا ہے- میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو آپا میرے اخراجات پورے کرتی تھیں- بہت خیال رکھتی تھیں میری ضروریات کا' مجھ پر ان کے اور بھائی صاحب کے بہت احسان ہیں- آج میں جو کچھ ہوں- ان ہی کی دعاؤں اور کاوشوں کے نتیجے میں بنا ہوں-''

بابا اسے پھپھو کے قصے سنانے لگے- ان کی محبت شفقت اور قربانیوں کے- وہ حیرانی سے سوچتی رہی- پھپھو دوسروں پر خرچ کرنے کے بجائے اپنے گھر پر خرچ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا- ڈرائنگ روم کا فرنیچر انتہائی پرانا اور بوسیدہ' قالین صدیوں پرانا' جس کا سارا رواں اڑ چکا تھا- گھر میں برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی تھی- ڈرائنگ روم کے پردے بھی پرانے تھے- صوفوں پر ان کی بدرنگی چھپانے کے لیے شاء نے کڑھائی کر کے صوفہ بیک ڈالے ہوئے تھے- روزانہ شاء ڈرائنگ روم کی صفائی کرتی- ہر چیز رگڑ رگڑ کر چمکاتی- شاء مسلسل کچھ نہ کچھ کرتی رہتی' کبھی فریال اسے اپنے پسندیدہ گانے سنانا چاہتی تو وہ ٹھہرو ابھی آتی ہوں کہہ کر کہیں غائب ہو جاتی- فریال کے شکوے پر کہتی-

''ارے یہ فراغت کے کام ہیں- رات کو سن لوں گی-''

اور رات کو بستر پر گر کر ایک سیکنڈ میں نیند کی وادی میں گم ہو جاتی-

☆☆

اس دن سروری خالہ آئی ہوئی تھیں- فریال کے سامنے ان کا یہ تیسرا چکر تھا- شاء ان کی خوب خاطر کرتی تھی مگر اس دن وہ چائے کے ساتھ بس بسکٹ لے گئی-

''کیوں بھئی' تم سروری خالہ کی روز روز آمد سے عاجز آ گئی ہو کیا- آج صرف چائے پر ٹرخا رہی ہو-''

''شام کے وقت کچھ نہیں کھاتیں وہ' ہاضمے کا مسئلہ ہے بوڑھا معدہ ہے نا-''

اور سروری خالہ کی آمد کا عقدہ اس دن کھلا- جب وہ چند خواتین کے ہمراہ ان کے اس پرانے ڈرائنگ روم میں آ براجیں- شاء نے معمول سے ہٹ کر اچھا لباس پہنا تھا- اس نے کئی چیزیں تواضع کے لیے بنا کر رکھی تھیں- فریال بھی چائے لے کر شاء کے ساتھ اندر چلی گئی- کافی معقول' متمول اور تعلیم یافتہ خواتین تھیں- جاتے وقت وہ شاء کے ہاتھ پر ہزار روپیہ رکھ گئیں شگون کا' سروری خالہ طمانیت سے پان چباتی رہیں- پھپھو نے روپے لینے سے ہر چند انکار کیا مگر انہوں نے کہا-

''یہ ہمارے گھر کا دستور ہے- بچی کی پسندیدگی کا نذرانہ-'' پھپھو مجبور ہو گئیں-

سب کے جانے کے بعد شاء لباس تبدیل کر کے آئی تو فریال نے ٹوکا-

''کیوں چھنیج کے کپڑے' اتنے اچھے لگ رہے تھے- گھر میں اچھے حلیے میں رہنا گناہ تو نہیں- یا

پابندی ہے؟''

''کام کاج میں خراب ہو جاتے ہیں- اس لیے احتیاط کرنا ضروری ہے-''

''تو کیا ان خواتین کو دکھانے کے لیے ہی پہنے تھے-''

''ہاں- جب ایسا موقع آئے- ہمیں سج بن کر اپنی نمائش کرنی پڑتی ہے- معمول سے ہٹ کر- لوگ بھی چاہتے ہیں کہ انداز ہ کر لیں- بن سنور کر کیسی لگتی ہے قربانی کی گائے-''

شاء افسردہ ہو گئی- اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچی تھی-

''ہاں' مڈل کلاس طبقے میں لڑکیوں کی نمائش کا سنا تھا-'' فریال سر ہلا کر بولی-

''میرے ماموں کی دو بیٹیوں نے تو اپنی پسند کی شادی کر لی- ایک کو مینا بازار میں لڑکے کی ماں بہنوں نے دیکھا- وہیں رشتہ دے دیا- فون پر تقاضا ہوا- فون پر ہی مامی نے اقرار کر لیا- چلو چھٹی- نہ کسی کا آنا' نہ جانا' خاطر نہ تواضع-''

''اچھا؟'' شاء کا موڈ بحال ہو گیا-'' پھر تمہاری سب کزنز خوش تو ہیں- مطلب انہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہوگا-''

''لو جی' ایسا کیسے ممکن ہے-'' فریال منہ بنا کر بولی-'' وہ لو میرج والی دونوں بہنیں تو سخت پریشان ہیں- ان کے شوہر بس دیکھنے میں اچھے ہیں- اندر سے لالچی اور زہریلے' طعنے دینے میں جاہل عورتوں سے بدتر- آئے دن مطالبے کرتے ہیں- ماموں بچارے پورے کرتے ہیں ورنہ ان کے گھر میں مار پیٹ کی نوبت آ جاتی ہے-''

''اور.... وہ تیسری جس کا رشتہ مینا بازار میں ہوا تھا-'' شاء کو عموماً جستجو کا شوق نہ تھا- لیکن موڈ بحال رکھنے کے لیے بولنا ضروری تھا-

''وہ.... مامی نے عجلت میں رشتہ طے کر دیا تھا- ان کے گھر میں سے کسی کو ایک کے بعد پھر دیکھا ہی نہیں- نہ ان کے گھر کبھی گئیں- لڑکا ہے تو بینڈ سم تعلیم یافتہ- انجینئر ہے- مگر گھر والے سب بڑے پینڈو ہیں- گھر بھی پرانا- ماموں جا کر اسے آفس میں دیکھ آئے تھے- بس ہوٹل میں شادی ولیمہ ہوا بعد میں گھر دیکھا' رہن سہن بھی دقیانوسی اور ذہنیت بھی- بچاری عطیہ نہ تو ہر مہینے نیا جوڑا بنا سکتی ہے نہ میک اپ کا سامان خرید سکتی ہے- ساس کہتی ہیں- جوتوں کے ڈھیر رکھے ہیں- یا تو انہیں پہنو ورنہ نیلام کر دو- ایک ٹوٹ جائے تب دوسرا سینڈل ملتا ہے- میک اپ کے بارے میں بہانا موجود ہے- تم خود خوب صورت ہو میک اپ کی کیا ضرورت ہے' بس یہ ہے صورت حال- عطو سخت ٹینشن میں وقت گزار رہی ہے- اسے گھر بھی پسند نہیں اوپر سے میاں ساری تنخواہ اپنی ماں کو دے دیتے ہیں- گھر چلانے کے لیے- حالانکہ عطیہ کی دو نندیں جاب کرتی ہیں مگر وہ اپنی کمائی سے جہیز بنا رہی ہیں- مامی کی تو داماد سے کھٹ پٹ رہتی ہے-''

''مگر عطو کو تو میاں سے شکایت نہیں ہے نا' تب ہی تو وہ گزارا کر رہی ہے۔''

''ہاں' عطو میاں سے تو خوش ہے۔ ساس سے ناراض کہ وہ بیٹیوں کی کمائی گھر میں کیوں خرچ نہیں کرتیں۔ جبکہ وہ رہتی کھاتی پہنتی ہیں۔ ساس کہتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ کما رہی ہیں ورنہ بہنیں بھائی کی ذمہ داری ہوتی ہیں۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔'' ثناء نے تائید کی ''جہیز بنا رہی ہیں۔ بھائی کا یہی بوجھ ہلکا ہو رہا ہے ورنہ شادیاں بھی بھائی کی ذمہ داری تھی اور تمہاری خالہ کی بیٹیاں؟''

''ان کی نہ پوچھو۔ حد سے زیادہ ایڈوانس اور بے باک ہیں۔ دو تو ایئر ہوسٹس ہیں۔ میری ان سے اچھی دوستی ہے۔ دو بڑی شادی شدہ ہیں۔ وہ سسرال سے کیا شوہر سے بھی خفا۔ آئے دن میکے میں موجود۔ سب بے حد ایڈوانس ہیں۔ ایئر ہوسٹس دونوں جو ہیں۔ ان کے مرد دوستوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایئر لائن کے سارے آفیسرز دوسرے لوگ بھی دوست ہیں روز کوئی نہ کوئی پارٹی پکنک پلا گلا ہوتا ہے۔ ایک بھائی ہیں ان سے بہنیں لاتعلق ہیں۔ بھائی کی زندگی بھی دوسری طرح کی ہے۔ خالہ خوش تو نہیں ہیں اولاد کی حرکتوں سے۔ مگر کیا کریں نصیحت کریں تو لڑکیاں گھر چھوڑنے کی دھمکی دیتی ہیں۔ خالہ چپ۔''

ثناء ہنس پڑی۔ ''ارے نصیحت کرتی رہیں۔ کبھی تو اثر ہوگا۔ جائیں گی کہاں گھر چھوڑ کر' لڑکیوں کے لیے ماں باپ کا گھر ہی محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے۔''

''ارے نہیں' تم نہ سمجھو وہ کسی بھی دوست کے گھر جا سکتی ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔ اسی وجہ سے خالہ ڈر جاتی ہیں کہ رسوائی نہ ہو وہ چاہتی ہیں کہ شادی ہو جائے پھر یہ کچھ بھی کرتی رہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ دو کی شادیوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ جو ہمیں بھی پھنسانا چاہتی ہیں۔ ہمیں پابندی پسند نہیں۔ بس اکثر یہی کچھ ہوتا رہتا ہے خالہ کے گھر۔''

فریال ہنس ہنس کر سنا رہی تھی۔ ثناء پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ تو ایسا ہوتا ہے دنیا میں یعنی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

''فری! ماں باپ کو بلیک میل کرنا۔ اچھی بات تو نہیں۔ تم انہیں سمجھاؤ۔ شاید۔''

''میں؟ انہیں سمجھاؤں۔'' فریال آنکھیں پھاڑ کر بولی ''وہ تو مجھے لیکچر دیتی رہتی ہیں کہ میں پابند زندگی گزار کر اپنے لیے ترقی کے راستے بند کر رہی ہوں۔ مجھے اپنے دوستوں سے ملاتی ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ تفریح کے لیے لے جانا چاہتی ہیں۔ وہ تو بابا مجھے کہیں جانے نہیں دیتے۔ سوائے ماموں ممانی کے ساتھ کے۔''

''شکر ہے ماموں جان نے فریال کو بے لگام ہونے نہیں دیا۔'' ثناء نے اطمینان کا سانس لیا۔

''اور شہریار ان کے کیا مشاغل ہیں۔ کیسے ہیں وہ؟''

''نہ پوچھو۔'' فریال سرشاری کی کیفیت میں ڈوب کر بولی۔ ''میرے آئیڈیل ہیں وہ۔ خوبصورت' ہینڈسم' اعلیٰ تعلیم اور۔ غیر ممالک کے بزنس ٹورز نے انہیں آفت چیز بنا دیا ہے۔ کیا لباس ہوتا ہے۔ کیا سچوئیشن' آہا! پرفیومز کے عاشق۔ مہنگی مہنگی پرفیومز لاتے ہیں اور ہر دم مہکتے رہتے ہیں۔ ڈانس ایسا غضب کا کرتے ہیں کہ سانس رکنے لگتا ہے۔''

''واہ' بھئی' یہ کیسی تعریف ہے۔ سانس رکنے کا مطلب جانتی ہو۔ مر جاتا ہے بندہ۔''

''ہاں۔ میں تو بس مرنے کے قریب ہو جاتی ہوں۔ آواز زبردست ہے۔ گاتے بھی ہیں۔''

''واہ' ہر فن مولا ہیں۔'' ثناء نے جھوم کر کہا۔ ''تم سے بھی کہتے ہوں گے ناچو گاؤ اور تم۔''

''میں..... بابا نے منع کر رکھا ہے ویسے آتا ہے مجھے ڈانس۔ عطو کی شادی میں میں نے شہریار کے ساتھ ڈانس کیا تھا۔ بابا نہیں تھے۔ پھر انہوں نے مووی میں مجھے دیکھا تو ناراض ہوئے میں شادی کے بعد کر سکوں گی کوئی بات نہیں۔'' وہ مطمئن تھی۔

''شادی میں کتنی دیر ہے۔ مطلب تمہارے ڈانس کے ارمان پورے ہونے میں۔''

''شہریار کا بس چلے تو فوراً۔ ماموں کو کچھ انتظار ہے۔''

''ویسے فری! تم ڈرامے خوب دیکھا کرتی ہو مفت میں۔ مزا تو آتا ہوگا۔'' ثناء نے کہا۔

''ڈرامے؟''

''ہاں بھئی۔ بلکہ طویل دورانیے کے ڈرامے۔ لڑکیوں کی سسرال سے خفگی۔ میکے میں قیام فیشن ایبل لڑکیوں کے رومانس۔ شہریار کی گرمجوشی۔ ہلچل ہی ہلچل۔'' ثناء ہنستی رہی۔

''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟'' فریال نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ لطف لے رہی ہوں۔ غیر فطری زندگیوں سے۔ ماں باپ کی بے چارگی۔ پچھتاوے۔ افسوس ناک ضرور ہے۔ مگر اس میں خطا وار اولاد نہیں۔ خود ماں باپ ہوتے ہیں۔ جو صحیح تربیت نہیں کر سکتے۔ نصیحت کرتے ڈرتے ہیں۔ نصیحت کرنا غلط قدم کی نشاندہی سیدھا راستہ دکھانا' یہ والدین کے فرائض ہیں۔ ان سے روگردانی' ماں باپ کی خطا ہے بلکہ جرم۔''

فریال کو یہ باتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے سوچا۔ بے چاری ثناء اس نے وہ چمکتی دمکتی زندگی دیکھی ہی کہاں ہے۔ دولت کی بہاریں' فیشن کی دوڑ' پکنک پارٹیوں کا لطف' آزادی کا بے مہابا استعمال' ریستورانوں میں لنچ' ہوٹلوں' فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ڈنر' پارٹیوں میں گانا بجانا' ڈانس اور ہلا گلا' ثناء تو لڑکوں سے کوسوں دور رہتی تھی۔ کبھی کوئی رشتے دار لڑکا آیا بھی۔ چھپو ہی اس سے نبٹ لیتیں۔ ثناء چائے ٹرے کر آ جاتی۔ لڑکے بھی اسے خاص لفٹ نہ کراتے' جبکہ فریال کے کئی اسکول فیلوز کے اور اب کالج میں بھی کئی دوست تھے۔ خالہ کے ہاں تو زیادہ ہی آمد و رفت تھی۔ ماموں کے ہاں بھی خاص پابندی نہ تھی۔ ایمی اور شیما کے کئی لڑکے دوست تھے۔ فریال بھی دوستی کو برا نہیں

سمجھتی تھی- اپنا دل صاف ہونا چاہیے-

☆☆

اب کے جو خالہ سروری آئیں- ان کے ساتھ وہی خواتین بھی تھیں اور لڑکا خود بھی سرفراز اور پھوپھا لڑکے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے' خواتین پھپھو کے کمرے میں آ گئیں- ثناء نے چائے کے ساتھ کے لیے کچھ چیزیں بنالی تھیں- سرفراز آ کر مردانے میں چائے لے گیا- فریال نے تو پیش کش کی تھی کہ وہ خود جا کر چائے دے آئے گی' مگر سرفراز نے منع کر دیا-

فریال کو برا لگا' اسی دوران اس کے بابا آ گئے اور اس نے سرفراز کی شکایت کی کہ وہ اسے چائے لے جانے سے منع کر رہا ہے- حالانکہ وہ تو لڑکے سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتی تھی-

''نہیں بیٹا! تمہارا مردانے میں کیا کام-'' بابا یہاں آ کر اتنے ہی دقیانوسی ہو گئے تھے-

اس کا منہ پھول گیا- بابا بھی خوب ہیں- انہیں پہلے تو کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا- خاندان کے لڑکوں کے ساتھ وہ کرکٹ بھی کھیلا کرتی تھی- رات کو سب بڑوں کی کانفرنس ہوئی- فریال بھی گھس کر بیٹھ گئی- پھپھو کہہ رہی تھیں کہ جب تک اچھی طرح معلومات نہیں کروالی جائے وہ کوئی جواب نہیں دیں گی- بابا کو لڑکا پسند آ گیا تھا- پھوپھا بھی مطمئن تھے- پھپھو کو نہ جانے کیا کمی نظر آ رہی تھی- حیرت کی بات تو یہ تھی کہ لوگ خاصے خوشحال تھے- بلکہ دولت مند تھے- لڑکے کا کاروبار پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا- ڈیفنس میں کوٹھی تھی-

''پھپھو! اتنے تو امیر لوگ ہیں- ان میں کیا خرابی ہوگی بھلا- جو آپ معلومات کروائیں گی-''

''خرابی ہو بھی سکتی ہے- شرابی جواری' غیر قانونی کاموں میں ملوث ہونا- ان ہی چیزوں کی معلومات کرانی ہے اور بچے یہ تو بس دل کی تسلی کے لیے ہے ورنہ لڑکی کے نصیبے سے کون لڑ سکا ہے-'' پھپھو اداس ہو گئیں- ''شراب تو انسان کے ضمیر کی قاتل ہوتی ہے اور امیروں کو تو شوق بھی ہوتا ہے-''

''اگر وہ غریب ہوتا تو آپ پھر بھی معلومات کرواتیں-''

''ہاں بیٹی! ضرور' بیٹی کوئی بے جان گڑیا نہیں ہوتی کہ اسے کسی بھی کنویں میں پھینک دیا جائے-''

''پھپھو! آج کل کے زمانے میں پیسے کی بڑی مانگ ہے- وہی عزت دار کہلاتا ہے جس کے پاس خوب دولت ہو- میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پیسہ ہر عیب چھپا لیتا ہے-''

پھپھو کو اس کے بھولپن پر پیار آ گیا- ہنسنے لگیں- ''بیٹا! وقت بدلتے دیر نہیں لگتی- اگر پیسہ نہ رہا تو باقی رہ جائیں گے عیب ہی عیب-''

''مگر پیسہ کہاں چلا جائے گا-'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا-

''جہاں سے آتا ہے وہیں جا سکتا ہے- غریب لوگ امیر ہو جاتے ہیں- امیروں پر برا وقت آتا

ہے تو وہ فقیر ہو جاتے ہیں- سب قدرت کے اشارے پر ہوتا ہے-''

غریب کیوں کر امیر ہوتے ہیں- امیر کیسے غریب ہو سکتے ہیں- یہ الجھن ذہن کو پریشان کر رہی تھی پھپھو بابا سے مخاطب ہو گئیں- وہ اٹھ کر ثناء کے پاس آ گئی اور اس سے یہی بات کی تو وہ خود بقراط سے کم نہ تھی- تائید کرنے لگی- فریال بحث کرنے لگی- ثناء نے کہا-

''فری! حالات بدل جایا کرتے ہیں- کبھی خود اپنی غلطی انسان کو گہرائی میں غربت کے غار میں پھینک دیتی ہے- کبھی قدرت کی منشا- بادشاہوں کے تخت الٹ جایا کرتے ہیں میری بہن-

شاہ مصر' شاہ ایران وطن چھوڑ کر جلاوطن ہوئے- کہاں وہ شان شوکت- وہ محلوں کی پر آسائش زندگی حکومت کا طمطراق- اشارہ کرتے تو سینکڑوں سر قدموں میں گر جاتے اور پھر کہاں وہ بے کسی در بدر پھرتے رہے- امان کی خاطر-''

فریال گم صم اسے دیکھتی رہی- شاہ ایران کے بارے میں سنا تھا پڑھا تھا- آخر ایسا کیسے ممکن ہوا- اچانک حالات کیسے بدل گئے- اچانک تو نہیں ہوا ہوگا ایسا' تدارک کیوں ممکن نہ ہوا- وہ کیوں اور کیسے کی بھول بھلیوں میں الجھ گئی-

'اچھا' اور امیر کیسے ہو جاتے ہیں غریب لوگ- اگر ہو سکتے ہیں تو پہلے ہی کیوں نہیں امیر ہو جاتے-''

سرفراز دروازے پر کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا- اندر آ کر بولا- ''تمہاری ناقص عقل میں یہ فلسفہ نہیں سما سکے گا- بہرحال کچھ دن بعد میں امیر ہو کر اس کا جواب دوں گا-''

''ہونہہ' بٹکل دیکھی ہے- امیر ہو کر جواب دوں گا-'' وہ بھنا گئی-

''بھئی' جب کہہ رہا ہوں تو یقین کر لو- چند سالوں میں نہ امیر ہو کر دکھایا- انشاء اللہ تو نام بدل دینا-''

''چند سال' چھپر بھی تو نہیں کہ پھٹے اور دولت برسنے لگے-''

''حالات بدلنے میں تو منٹ کا فاصلہ ہے- میں نے تو پھر چند سال کا وقفہ دیا ہے-''

''کیسے؟ اور امیروں کے غریب ہونے کا راز کیا ہے-''

''دیکھو' ایک سرمایہ دار- اس کا کاروبار ہے' ملیں ہیں' فون آتا ہے- سرکار بم تباہ ہو گئے' ہمارے شیئرز ڈوب گئے' قرض کیسے ادا کریں گے- مل میں آگ لگ گئی' یا مل ملازمین نے ہڑتال کر دی- پروڈکشن صفر ہو گئی- چلو جی لاکھ پتی خاک پتی ہو گیا-''

''جی نہیں' ایسا فلموں میں ہوتا ہے یا ڈراموں میں- سرمایہ دار اتنا احمق نہیں ہوتا کہ پائی پائی کاروبار میں لگا دے- ضروری نہیں کہ وہ مقروض بھی ہو-''

''نہیں ہے تو ہو جائے گا- اسے جس شاہانہ زندگی کی عادت ہے- اس کے لیے بڑی رقم درکا

ہے- پھر مارکیٹ میں اپنا سکہ جمائے رکھنے کے لیے قرض تو لینا پڑے گا- یقین کرو- کتنا بڑا سرمایہ دار ہو- اس کا کاروبار قرض کے سہارے چلتا ہے اور سن لو کہ آدمی اپنے دست و بازو کی مدد سے- حوصلوں کے بل بوتے پر ترقی کر کے دولت حاصل کر سکتا ہے-''

''ہاں جی سنا ہے- کسی جی مالک کو کلرک پسند آ گیا- اس نے اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر کے آدھی جائیداد کا مالک بنا دیا- اب وہ کلرک' سرمایہ دار بن گیا- لنگڑی یا اندھی بیوی کی بدولت' ہیں ہوتا ہے نا فلموں ڈراموں میں-'' فریال مذاق اڑانے کے موڈ میں تھی-

''ہم ان پر یقین نہیں رکھتے' یہ اتفاق ہو سکتا ہے- ہمیں اپنے دست و بازو اور حوصلوں پر اعتماد ہے- ہم نے جس ماں کی گود میں پرورش پائی ہے اور جس اولوالعزم باپ کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی ہے- ان کی خواہشوں اور تمناؤں کو اوج کمال پر پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے- محنت جد و جہد اور ماں باپ کی دعاؤں کے یقین کے ساتھ-''

''توبہ- دونوں بہن بھائی کتنی مشکل باتیں کرتے ہیں- بقراط سقراط نہ ہوں تو-'' وہ بیزار ہو گئی-

ایسی باتیں کب سنی تھیں اس نے' وہاں اس کے نھیال میں تو بس ڈیوٹری' فیشن' یا کسی پارٹی ہولڈنگ یا میوزیکل گروپ کے متعلق زور شور سے گفتگو ہوا کرتی- اسے بھی دلچسپی تھی- آخر اسے اسی دنیا میں رہنا تھا- بابا کی پوزیشن تھی- ان کے گھر پر سرکاری آفیسران آیا کرتے تھے- فیشن ایبل آزاد منش خواتین امی کے انتقال کے بعد بھی آیا کرتیں- فریال کو ان سے ان کی دلچسپی کی باتیں کرنا پڑتیں' ان کے شوہر یا بیٹے بھی فریال سے بے تکلفی سے پیش آتے- مگر پھپھو کے گھر کا ماحول- سو سال پرانا تھا- بابا کی وجہ سے اس مرتبہ زیادہ رہنا پڑا-

☆☆

اپنے گھر آ کر ایک سکون سا ملا- روشن ہوادار کمرے' فراخ لاؤنج' دلکش سجا بنا ڈرائنگ روم' بیش قیمت قالینوں سے مزین کمرے' امپورٹڈ ڈیکوریشن کا سامان' سرسبز پھولوں سے بھرا لان ہر کمرہ جدید خوش رنگ فرنیچر سے آراستہ- آہا کیسا دلی سکون تھا- ادھ پھپھو کے گھر کی پرانی دیواریں- پرانا بوسیدہ فرنیچر اندھیرے کمرے بس ایک سکھ تھا- پھپھو کی بے پایاں محبت- ثناء کی خاطریں-

اب وہ حیران ہوتی- کس قدر باتیں ثناء کے ساتھ کرتی تھی- یہاں اول تو بہری بوا کے سوا کوئی تھا نہیں- خالہ ماموں کی بیٹیاں بھی بس ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلی جاتی تھیں- باتیں بھی بس فلموں کی یا فیشن کی ثناء ہر طرح کی گفتگو کر لیتی تھی اور دل جمعی سے اس کی بات سن کر جواب دیتی-

گھر آتے ہی فریال نے نوکروں کو ڈانٹنے ڈپٹنے کا عہدہ سنبھال لیا- بابا نے ایک دن کہا-

''بیٹا! یہ انسان ہی ہیں- ان کی طاقت سے بڑھ کر کام نہ لو-''

''ان کی طاقت سے بڑھ کر؟'' وہ چیخی- ''بابا! کمال کرتے ہیں آپ- اتنے دن گھر میں آرام

ہی کیا ہے انہوں نے- کام نہیں- گھر کی حالت دیکھیں- جالے- گرد' سو کھے پتے-''

''بیٹا جی! کوئی کام خود بھی کر لینا چاہیے- ہر وقت نوکر کی محتاجی اچھی نہیں-''

اسے نوکر کو بلا کر پانی مانگنے دیکھ کر بابا نے نصیحت کی- وہ حیرانی سے بابا کو دیکھنے لگی- انہوں نے کبھی اس طرح اسے نہیں ٹوکا تھا- اس کے بعد بھی- روز کوئی نصیحت تیار رہتی- خصوصاً نوکروں کی حمایت اسے سخت ناگوار ہوتی- یہ پھپھو کے گھر رہنے کا اثر تھا- لیکن اس میں فریال کا کیا قصور- پھپھو کے گھر نوکر تھے ہی نہیں- ظاہر ہے انہیں خود ہر کام کرنا پڑتا تھا- اسی لیے ثناء بھی مصروف رہتی جب کوئی نوکر تھا ہی نہیں تو وہ کس پر حکم چلاتی-

پھر بابا کا لہجہ بدل گیا- اب وہ کہتے ''لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے- ورزش بھی ہوتی رہتی ہے- کام بھی آ جاتا ہے-''

ایک دن بولے ''بیٹا انسان کو ہر حالت میں مضبوط رہنا چاہیے- خصوصاً لڑکیوں کو مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے- ہر کام سیکھنا ضروری ہے- کبھی نوکر نہ ہو تو-''

''کیوں نہ ہو- اگر ایک نہ ہوا- ہم دوسرا رکھ لیں گے-''

''ہاں رکھ لیں گے- مگر ہاتھ پیر چلتے رہیں تو حرج کیا ہے- لڑکیوں کو ہر کام سیکھنا چاہیے-''

''بابا! لگتا ہے پھپھو نے میرے بارے میں آپ کو خاص ہدایات دی ہیں-'' وہ مشکوک ہو گئی-

بابا نے قہقہہ لگایا- ''ارے نہیں- دراصل اتنے دن ثناء کو دیکھ دیکھ کر عادت ہو گئی ہے- اس کو ہر لمحہ متحرک دیکھ کر مجھے تمہاری ڈل زندگی کا احساس ہو رہا ہے- اسے ہر کام میں مہارت تو ہے ہی- لیکن اس کے علاوہ بھی ماں باپ کی خدمت' مہمانوں کی تواضع' گھر کی دیکھ بھال میں کس قدر چوکس رہتی ہے- تم نے دیکھا ہو گا- ان کے گھر کوئی بازار کی چیز نہیں آتی بسکٹ' کیک وغیرہ نمک پارے' سموسے سب وہ خود بنا لیتی ہے اور کس قدر لذیذ-''

فریال پر بھلا کیا اثر ہوتا- اسے تو بابا کے اس ریمارک نے کہ انہیں فریال کی زندگی ڈل نظر آتی ہے چکر میں ڈال دیا-

''ڈل زندگی بابا؟ کیا ہر وہ کام کرنے سے آدمی متحرک زندگی گزارتا ہے- ایسے کام جو کوئی بھی نوکر کر سکتا ہے-''

''نوکر انسان کو سست بنا دیتے ہیں- یہ تو ماننا پڑتا ہے- کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ جو کام ثناء کرتی ہے- وہ نوکر کر سکتے ہیں؟ وہ احساس کہ اس کے ماں باپ کو بلکہ مجھے بھی ہاتھ نہ ہلانا پڑے- وہ خود دوڑ پڑتی ہے- بستر درست کرنے سے لے کر تکیہ سر کے نیچے رکھنے' سر دبانے' بغیر منہ سے کہے چائے' بلکہ پانی پلانے تک' اس کا چاق چوبند ذہن اپنے آس پاس رہنے والوں کا خیال رکھنے میں ہمہ وقت آنکھیں کھلی رکھتا ہے- کس لیے؟ اسے نوکر کا آسرا نہیں-''

''بابا! پھپھو نے انہیں تربیت ہی ایسی دی ہے۔'' وہ قائل ہوگئی۔

''تم یقین نہیں کروگی۔ آپا نے اپنے گھر میں یعنی ہمارے اماں ابا کی موجودگی میں کبھی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کھانا پکانے والی ایک بوا تھیں۔ اماں نے آپا سے کبھی برتن نہیں دھلوائے۔ سلائی وغیرہ تو سکھلانا لازمی تھا۔ سسرال میں آپا کو کچھ تکلیف بھی ہوئی کہ وہاں نوکر رکھنے کا دستور نہ تھا۔ کنبہ بھی بڑا تھا۔ مگر آپا نے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ اپنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا۔ میں چاہتا تھا تم اتنے دن جو وہاں رہی ہو تو ان سے کچھ سیکھ لیتیں۔''

''سیکھ لوں گی۔ پھپھو کی بھتیجی ہوں آخر۔'' وہ لاپروا بنی رہی۔

وہ بابا سے متفق نہ تھی۔ ماموں کے ہاں کیا کمی تھی۔ اسے بھلا کیا کرنا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ آواز دے کر چائے منگوالے۔ جیسا کہ مامی کرتی ہیں۔

''شکور! چائے لے آؤ۔''

''نصیر! کولڈ ڈرنک لاؤ۔''

''شانو! کرسیاں لان میں لے جاؤ۔''

''میرے کپڑے ڈرائی کلین کے لیے لے جاؤ۔''

اور بس یا پھر وہ کسی ملازمہ کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے چلی جاتی ہیں۔ ان کی بیٹیوں کو کچھ بھی نہیں کرنا ہوتا سوائے باتوں کے۔ مگر بابا انہیں کیسے سمجھائے۔ میں وہ متوسط طبقے کی لڑکی نہیں ہوں۔ جنہیں بن سنور کر اجنبی خواتین کے سامنے چائے لے کر جانا پڑتا ہے اور اپنی نمائش پر افسردہ ہو کر اعتماد کھونے کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔ شہریار تو مجھ سے کبھی کوئی کام لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ابھی اس دن آتے ہی۔ بھرپور نظروں سے جائزہ لے کر بولے۔

''ہاں جچ رہی ہو۔ یہ رنگ تم پر جچ گیا ہے۔ جیسے خاص تمہارے لیے بنا ہو۔ فری تم نے کیا جادو کردیا ہے مجھ پر اب تو تمہارے بغیر جینا مشکل لگنے لگا ہے۔''

میں شرما گئی۔ کیسے بیباک انسان ہیں اف۔ شکر ہے اس وقت بہری بوا کے سوا کوئی نوکر نہ تھا۔

''تم ہمارے ہاں کیوں نہیں آتیں۔ کیا انکل نے پابندی لگائی ہے۔''

''نہیں' نہیں۔ دراصل اتنے دنوں کے بعد آئی ہوں۔ سیٹنگ چینج کروا رہی ہوں ڈرائنگ روم کی۔''

''ٹھک جاتی ہوگی۔ میں شانو کو بھیج دوں گا وہ کرلے گا۔ تم یہ کام نہ کیا کرو۔ انکل منع نہیں کرتے تم کو۔'' کتنا پیار تھا ان کے لہجے میں۔ وہ سرشار ہوگئی۔

''انکل سے کہو' میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لیں اب اور انتظار نہیں ہوتا۔''

وہ اس کے بالکل قریب آگئے۔ اس کے کان میں کوئی بات کہنا چاہتے تھے۔ سانس کے ساتھ

ایک ناگوار سی بو نے اسے چوکنا کردیا۔ وہ پیچھے ہٹی۔ شہریار نے سر اوپر اٹھا کر قہقہہ لگایا۔

''شرمانے کی کیا بات ہے۔ کچھ دن کی بات ہے تم میری ہوگی۔''

وہ واپس جانے کے لیے مڑے۔ قدم لڑکھڑائے۔ لہراتے ہوئے پورچ میں چلے گئے۔ فریال ان کے جملے اور انداز میں ایک عجیب سا فرق محسوس کیے بغیر نہ رہی۔ شاید آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

بابا کے آتے ہی وہ انہیں دکھانے کو کوئی کپڑا لے کر ڈسٹنگ کرنے لگتی کبھی ملازمہ کو پکار کر اس پر اعتراض کرتی۔

''کہاں تک سب کی نگرانی کروں۔ سب کے سب نکمے' ناکارہ۔''

''تو انہیں نکال دو۔ خود کرلیا کرو صفائی۔'' بابا کے پاس مشورہ' تجویز یہی تھی بس۔

اس دن بھی باپ کو دیکھ کر وہ ادھر ادھر پھرنے لگی' گویا بہت مصروف ہو۔ بابا اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ فریال ڈیکوریشن پیس اٹھا کر آنچل سے رگڑنے لگی۔

''آج بشیراں نے خاص صفائی کی ہے۔ نظر کمزور ہوگئی ہے شاید۔''

کچھ دیر کے بعد بابا کی تھکی تھکی آواز آئی۔

''فریال بیٹے! کیوں خود کو تھکا رہی ہو' بشیراں کو بلالو۔''

''پتا نہیں' کہاں غائب ہے۔''

''فری بیٹے! آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے ایک بار شناء کی مثال دی تھی کہ وہ صرف گھر کے کام ہی نہیں کرتی۔ دوسروں کا خیال بھی رکھتی ہے۔ آدھا گھنٹہ ہوگیا ہے مجھے۔ انتظار میں ہوں کہ کب میری بیٹی کو خیال آئے گا اپنے بابا کا۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ چائے کی طلب ہے۔''

فریال شرمندہ ہو کر خانساماں کو آوازیں دینے لگی۔

''بیٹا! ایک پیالی چائے خود ہی بنالو۔ بلکہ اپنے لیے بھی۔ دونوں باپ بیٹی ایک ساتھ بیٹھ کر پئیں گے اور باتیں کریں گے۔''

''میں؟ بابا۔ مجھے چائے بنانی نہیں آتی۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

''اچھا؟ شناء کے ساتھ رہ کر بھی.... خیر چلو۔ میں تمہیں چائے بنانا سکھاتا ہوں۔'' کہہ کر بابا اٹھے اسے پکڑ کر کچن میں لائے۔ مگر افو کچن کی تو حالت ہی عجیب تھی۔ بدنظمی' ابتری چائے ملی نہ چینی۔ جھوٹے برتن' خالی ڈبے نہ جانے کیا کیا الم غلم' وہ مزید شرمندہ ہوگئی۔

''بیٹا! تم نے آپا کا کچن دیکھا تھا نا؟ چھوٹا۔ جدید سہولتوں سے عاری۔ پرانے زمانے کا' کتنی صفائی اور ترتیب تھی وہاں۔ بغیر تلاش کیے ہر چیز مل جاتی تھی۔ ایک بار جب تم اور شناء اوپر چھت پر گیمس مار رہی تھیں میں نے خود چائے بنائی۔ ہمارا کچن تو امریکن اسٹائل کا ہے۔ ہر قسم کی سہولت ہے۔ پھر یہ اس قدر گندا بے ترتیب کیوں ہے۔ اس لیے بیٹا! کہ آپ نے صرف حکم چلانا سیکھا

ہے- ہاتھ ہلانا نہیں- آپ کو خود پتا نہیں کہ کون سی چیز کہاں ہونی چاہیے- چلو خیر خانساماں آئے گا تو چائے بنالے گا-''

بابا اسے شرمندہ دیکھ کر بہلانے لگے-''چلو آج کہیں سیر کے لیے چلتے ہیں- ہاں وہ تمہاری ٹیچر ملی تھیں- فریال بیٹا کیا آپ نے کالج چھوڑ دیا ہے؟'' اچانک بابا کو خیال آیا تھا-

''دل نہیں لگتا میرا پڑھائی میں-'' وہ منہ بنا کر بولی-''کرنا کیا ہے مجھے ڈگری لے کر-''

بابا رک گئے-''علم اور عقل دونوں کو حاصل کرنا ہے-'' بابا کا لہجہ خاصا سخت تھا-

''شاء کو دیکھو- حالانکہ اس کے والدین زیادہ تعلیم یافتہ نہیں- وہ اب بھی پڑھائی کے لیے بے چین رہتی ہے- مجھ سے سفارش کروائی تھی اس نے کہ اسے ماسٹرز کے لیے اجازت دی جائے- تعلیم کام آتی ہے بیکار نہیں جاتی-''

اس دن خانساماں کی شامت آئی- خوب مٹی پلید کی فریال نے- کھڑے ہو کر صفائی کروائی- مگر بابا کو اس کا چیخنا چلانا پسند نہیں آیا- بابا کچھ سست اور چڑچڑے ہو گئے تھے- وہ فریال کو گھر کے کاموں میں فعال دیکھنا چاہتے تھے- مگر وہ شاء نہیں بن سکتی تھی' کبھی نہیں' اسے ضرورت ہی نہیں تھی-

☆☆

پھپھو کا خط آیا تھا- شاء کی شادی طے ہو گئی تھی- بہت اصرار سے بلایا تھا- شادی اسی جگہ طے ہوئی تھی جہاں کی خواتین بار بار آئی تھیں- شاید پھپھو ''معلومات'' کروا کر مطمئن ہو گئی تھیں-

بابا نے کہا''تیاری کرلو- جس چیز کی ضرورت ہو' لے لو-''

شادی میں جانے کے لیے بابا کو اس کا کالج یاد آیا نہ تعلیم- اسے بھی کب پروا تھی- یوں بھی شہریار نے اس کو ناران جانے کی دعوت دی ہوئی تھی- ابھی مامی نے کنفرم تو نہیں کیا تھا- مگر ظاہر ہے وہ اس ٹرپ کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی- کاغان' سوات تو دیکھے بھالے تھے- اب ناران اور کالام کا شوق-

وہ سوچنے لگی- کیا بہانا کرے بابا سے- کیونکہ شاء کی شادی اور ناران کا سفر ایک ہی تاریخ کو تھا- اس نے شہریار کو فون کر کے کہا کہ کیا ناران مجوزہ تاریخ سے پہلے نہیں جاسکتے- شادی کے بارے میں بتایا- شہریار گڑبڑ گیا-

''گولی مارو شادی کو- شادیاں تو ہوتی رہتی ہیں- تم اپنے باپ سے کہو- ناران جانا زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ میں کہہ رہا ہوں-''

اور اس نے بابا سے کہہ دیا-''میں ناران جارہی ہوں- کیونکہ ماموں کی فیملی مجھے لے جانا چاہتی ہے- پھپھو سے بعد میں آ کر مل لوں گی- اس شادی کے لیے میں ناران کی سیر کی قربانی نہیں دے

سکتی-''

بابا اسے گھورتے رہے پھر بولے-''ناران کیا کہیں اٹھ کر چلا جائے گا؟ کہ تم اسے نہیں دیکھ سکو گی-''

سخت لہجہ تھا- اس نے پھر شہریار کو فون کیا- مجبوری بتائی-

''شادی سے آ کر پھر چلے جائیں گے- اسی دن جانا ضروری ہے کیا؟''

شہریار بگڑا-''ہاں ضروری ہے- کیونکہ میں ارادے نہیں بدلا کرتا- بس تمہیں چلنا ہے-''

''بابا نہیں مانیں گے- پھپھو کے گھر کی پہلی خوشی ہے-''

''واٹ؟ پہلی خوشی-'' وہ فون پر اتنے زور سے چلایا کہ فریال کے کان میں سنسناہٹ ہونے لگی-

''کیا چیز ہے یہ پہلی خوشی؟ اور ہے تو ان کے لیے- تمہاری پہلی خوشی میرے ساتھ ہے اور زندگی بھر کی خوشیاں بھی میرے ساتھ شیئر کرنی ہیں تمہیں- آیا سمجھ میں-''

اس کے بعد زنانے سے اس نے انگلش میں ایک لمبا لیکچر دیا کہ کیوں فریال کا ساتھ جانا ضروری ہے- کیونکہ اس کے بغیر ناران کی وادی کا حُسن ماند پڑ جائے گا- اس کا یہ سفر بے کار جائے گا- وہ ہر حال میں فریال کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے اور فریال کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ ابھی سے اگر وہ اس کے اشاروں پر چلنے سے انکار کرے گی تو اپنا نقصان کرے گی وغیرہ-

فریال ڈر گئی- اس نے بابا کو رضامند کرنے کی کوشش کی-

''افسوس بیٹا!'' بابا کمزور لہجے میں بولے-''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم میری چھوٹی سی خواہش اپنی سیر و تفریح پر قربان کرو گی- شاید میری تربیت میں کوئی کسر رہ گئی- مگر تربیت ملی بھی کب- میں ادھر سے لاپروا رہا- چلو تمہاری مرضی-''

بابا کا شکست خوردہ لہجہ اور مایوس چہرہ.....وہ اداس ہو گئی- باپ کی خوشی شہریار کا حکم- اس نے مامی کو فون کیا- انہوں نے خیریت پوچھی-

''مامی دراصل میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جن تاریخوں میں آپ لوگوں نے ناران کا پروگرام بنایا ہے- پھپھو کی بیٹی کی شادی ان ہی دنوں ہے- میں چاہتی تھی کہ آپ پروگرام بعد میں رکھ لیں- میں شادی سے آ جاؤں تب' شہریار کو صدمہ ہے کہ میں ناران ان کے ساتھ ضرور جاؤں-''

''بائیں- مگر ہم تو ناران نہیں جارہے- وہ تو شہریار کا اپنے دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے- تمہارے ماموں اسے منع کر رہے ہیں- انہیں اس زمانے میں شہریار کی مدد کی ضرورت ہے- خیر- میں اسے سمجھا لوں گی- تم پھپھو کے گھر ضرور جاؤ-''

کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا- وہ حیرت سے سوچتی رہ گئی- شہریار اپنے دوستوں کے ساتھ جارہا ہے- مجھے کس لیے ساتھ لے جانا چاہتا ہے-

کچھ دیر بعد شہریار کا فون آ گیا۔ سخت مشتعل تھا۔

''تم نے ماما کو کیوں بتایا۔ میں نے کب کہا تھا کہ ماما ساتھ جا رہی ہیں۔ کیا تم میرے ساتھ کبھی کہیں گئی نہیں ہو۔ بہت فضول چیز ہو تم بے عقل میرا سارا پروگرام تباہ کر دیا تم نے ٹھیک ہے جاؤ۔ مگر یاد رکھو آئندہ میں تمہاری ایسی کوئی حرکت برداشت نہیں کروں گا۔ تم ہو کیا۔ میں نے تمہیں اہمیت دی ہے۔ تمہیں احسان ماننا چاہیے۔''

نہ جانے اور کیا کیا کہتا رہا۔ فریال سنتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ کس قدر صدمہ پہنچا تھا اسے شہریار کے الفاظ سے۔ آخر کیا احسان تھا اس کا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی مرضی معلوم کر کے رشتہ دیا تھا۔

وہ فون بند کر کے چپ چاپ کمرے میں آ گئی اور پھر اس نے سوٹ کیس میں کپڑے بھر شروع کر دیے۔ شہریار کو ناراض کر کے اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس نے بھی تو دھوکا دیا تھا۔ غلطی کون مانتا ہے۔ الٹا احسان جتانے لگا۔ کیا میں اس کے ساتھ اس کے دوستوں کے ہمراہ دور جا سکتی تھی۔ بابا تصدیق کے بغیر اجازت دے دیتے کیا؟ مگر شہریار ایسی بات سوچنا پسند نہ کرتا۔ وہ اس کی منگیتر ہے اور اسے اپنے ساتھ ہر جگہ لے جانا اس کا حق ہے۔ خواہ وہ ناراض کالام ہو یا جہنم اگر ایسی بات وہ بابا کو بتا دے تو... نہیں وہ نہیں بتا سکتی۔

بابا یوں بھی کچھ دنوں سے ماموں سے ناراض تھے یا کم از کم خوش نہیں تھے۔ انہوں نے اس کہا تھا کہ جب ماموں کے ہاں جانا ہو مجھ سے کہو۔ میرے ساتھ جایا کرو۔ یہ ان کی خفگی کی علامہ تھی۔

فریال نے جب بابا کو بتایا کہ وہ بالکل تیار ہے۔ بس بینک لاکر سے کچھ جیولری نکالنی ہے۔ یکدم بشاش ہو گئے۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور کہا۔

''آپا کی ایک ہی بیٹی ہے۔ تم نہ جاتیں تو ان کو جتنا صدمہ ہوتا اس سے زیادہ مجھے۔ سیر تفریح کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر شادی تو ایک بار ہی ہوتی ہے۔ تم دیکھنا انجوائے کرو گی۔ ہمارا خاندان ہو گا۔ میں تو سب سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہوں۔ آپا کا سب سے تعلق ہے تم لوگ خوش ہو گی۔''

بابا بے حد مسرور تھے اور فریال کو بھی ان کی خوشی سے خوشی ہو رہی تھی۔

☆☆

وہ پھپھو کے ہاں آ گئی۔ ان کے گھر میں خوب رونق تھی۔ ابھی شادی میں کئی دن باقی تھے۔ کئی فیملیز جمع تھیں اور ابھی آنے والی تھیں پنڈی کراچی سے جو لوگ لاہور میں تھے وہ روز لگاتے۔ گانے گائے جاتے اور ہنسی مذاق ہوتا۔ شاء کا سب نے ناطقہ تنگ کیا ہوا تھا۔ شا

پھپھو جان انگلینڈ میں رہتی تھیں۔ وہ بطور خاص اپنی بیٹی اور بیٹے کو شادی کی رونق دکھانے کے لیے لائی تھیں۔ ان کے بچے کئی سالوں بعد آئے تھے اور خوب لطف لے رہے تھے۔ انہیں پھپھو جان ہر بات بڑی تفصیل سے بتاتی تھیں۔ یہ گانا اس موقع کا ہے۔ یہ گیت اس وقت کا اس کا مطلب ہے۔ وغیرہ وغیرہ ان بچوں کی لاعلمی اور بے خبری بھی دلچسپی کا سبب تھی۔ شادی میں شریک ہونے والے سب خاندان کے لوگ تھے۔

پھپھو نے سب سے فریال کو ملایا۔ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ لڑکے لڑکیاں سب تعلیم یافتہ، فیشن ایبل، خوش لباس، خوش مزاج، بابا کے بچا زاد خالہ زاد، ماموں زاد بھائی بہنوں کی لمبی فہرست تھی۔ ان کی اولادیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔

سب کو شکوہ تھا کہ بابا نے خاندان سے لاتعلقی اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے ہاں تو لڑکیاں سسرال سدھارتی ہیں۔ یہاں ہمارا بھائی سلمان سسرال سدھار گیا اور وہیں کا ہو رہا اللہ بھلا کرے آپا کا جو ہر موقعے پر ہمیں یاد کرتی ہیں۔ ورنہ ہم کیا کرتے اولاد کو کیا بتاتے۔

پھپھو کے جیٹھ، دیور، نندیں معہ اولادوں کے روز آ جاتیں۔ خوب شور شرابا ہوتا۔ لڑکے بھی برابر شریک رہتے اور لڑکیوں کا خوب مذاق اڑاتے۔ گانوں کی پیروڈی بنا کر سناتے، لڑکیاں خوب شور کرتیں۔

''کیسے بھائی ہو، بہنوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے۔ دولہا والوں کے خلاف گیت بناؤ۔''

لڑکے کہتے ''بہنوں کے خلاف کب محاذ بنایا ہے؟''

اس پر واویلا ہوتا۔ مایوں والے دن خوب اچھل کھیلا گیا۔ بڑا ہنگامہ رہا۔ شاء عموماً ان شیطانوں کی ٹولی میں شریک نہیں ہوتی تھی اپنے کمرے میں ہی محدود تھی۔ جس پر پھپھو جان کے بچے سوال کرتے ''شاء آپی سب کے ساتھ کیوں شریک نہیں ہوتیں۔ گانا کیوں نہیں گاتیں۔ کیا انہیں شادی کی خوشی نہیں؟''

''بیٹا! شاء ایک مشرقی لڑکی ہے۔'' شاء کے تایا زاد سجاد نے بتایا۔ ''اور مشرقی لڑکی اپنی حد کے اندر رہتی ہے۔''

''اور جو لڑکی حد سے باہر ہو۔ اسے رافعہ کہتے ہیں۔'' شاہد نے طنزاً کہا۔

رافعہ ان کی پھپھی زاد بہن تھی کافی ایڈونس۔ دراصل وہ لڑکوں سے جلد فری ہو جاتی تھی، اس پر اس کا لڑکے ہی ریکارڈ لگاتے۔ وہ برا نہیں مانتی تھی۔ بہت پراعتماد تھی، ہر بات کو مذاق میں اڑا دینا دیر بنا رکھا تھا اس نے۔ بلکہ شاء کی وہ دھیال سب ہی روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھی اور فریال نے محسوس کیا کہ وہ سب کزنز شاء کی بہت عزت کرتے تھے۔ فریال سے رہا نہیں گیا۔ اس نے پوچھ لیا۔

''سب لوگ ثناء کا اس قدر احترام کیوں کرتے ہیں- حالانکہ کئی کزنز سے چھوٹی ہے وہ-''

جواب ملا-''کیونکہ وہ قابل احترام ہے- وہ ہماری ہر محفل میں شریک ہوتی ہے- لیکن پوری محفل میں اس سے زیادہ شائستہ اور سمجھدار کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہوتی- اس میں جو وقار ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم اس کا احترام کریں- وہ بلا ضرورت کسی لڑکے سے مخاطب نہیں ہوتی- اپنی عزت کروانا جانتی ہے-''

ثناء کی تعریف توصیف سب کرتے تھے- ثناء کی بڑی تائی بہت دلچسپ خاتون تھیں- وہ بڑے لڑکیوں سے خوب ٹھٹھول بازی کرتیں- گھر میں ان کی وجہ سے خوب رونق تھی-

کھانا پکوانے کھلوانے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لی ہوئی تھی- ناشتہ پھپھو جان کی ذمہ داری تھا- ناشتے پر تو محدود لوگ ہوتے- یعنی وہی جو رات کو رہتے تھے- مگر کھانے پر بہت لوگ ہوجاتے- تائی خود کھانا نکلواتیں- لگواتیں- لڑکیوں کو تو کام سے لگاتی ہی تھیں' لڑکوں کو بھی بخشا نہیں سیکھا تھا- اس لیے کسی سے سلاد بنوا رہی ہیں- کسی کو میوہ صاف کرنے پر لگا دیا- ان کے خیال میں لڑکیاں میوے کی صفائی جلدی کر دیتی ہیں- کچھ بچتا ہی نہیں- لڑکوں سے کچھ تو بچ ہی جاتا ہے-

چاول صاف کرنے کے لیے بھی انہوں نے لڑکوں کو جمع کرلیا تھا- کراہتے ہوئے' آہیں بھر بھر کر چاول کی بوری کے گرد بیٹھے تھے-

''بھئی مجھے تو ٹھنڈ لگنے لگی ہے- اس قدر ٹھنڈی آہیں جمع ہوگئی ہیں کہ لگتا ہے میں تو ہم جاؤں گی- عنقریب درجہ حرارت صفر پر آنے والا ہے-''

تائی نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں لڑکوں نے فوراً قوالی شروع کردی اور چاولوں سے ایک دوسرے پر نشانہ بازی بھی-

لڑکیاں فرش بچھانے اور صفائی پر مامور تھیں- کچن میں تو تھیں ہی لڑکیاں- ہر کام وقت پر ہوتا- پھپھو جان بہت سخت ایڈمنسٹریٹر تھیں- انہوں نے اعلان کردیا تھا صبح اٹھ کر ناشتے کی میز پر جمع ہوجائے- اسے ناشتہ ملے گا- سوتے رہنے والوں کو اپنا انتظام خود کرنا ہوگا- کچن میں داخلہ دس بجے کے بعد بند- کیونکہ اس کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوجائے گا- کچن مصروف ہوگا-

پھپھو کو سب نے ذمہ داری سے بری کردیا تھا- وہ بہت خوش اور مطمئن تھیں- ثناء کی سسرال بھی دولت مند ہونے کے باوجود سادہ اور بے تکلف تھی- ثناء کی ساس تو کچن میں گھس کر اپنی خاطر خود کرلیتیں-

''لگتا ہے' ثناء کی ساس کو بھوک بہت لگتی ہے- ان کا سارا وقت کچن میں گزرتا ہوگا-''

''ہوشیار ثناء خبردار! ساس کی خاطر کے لیے تمہیں بھی کچن میں رہنا ہوگا-''

ثناء کا خوب مذاق اڑایا جاتا- تائی مایوں والے دن اپنے خانساماں کو لے آئیں' خوب موٹا' مسٹنڈا' سیاہ فام' تائی کی بیٹیاں فرخندہ تابندہ تو اس کی صورت شناس تھیں مگر بہت لوگ اسے نہیں جانتے تھے- لڑکوں نے لڑکیوں کو ڈرایا' کہا ایک عدد کالا دیو نازل ہوا ہے- ادھر پھپھو کو بھی اس کی آمد پسند نہیں آئی- انہوں نے تند سے کہا-

''میں نے کہا عاشی! بھئی اس مسٹنڈے کو تو میں برداشت نہیں کرسکتی- ہماری بچیوں کو گھورا کرے گا- کیسی موم مالئی جیسی لڑکیاں ان کو تو ہوا نہیں لگی- اب اس کی نظروں میں رہیں گی- کہیں نظر نہ لگادے- یہ بھابھی جان کو کیا سوجھی- کھانا تو پک ہی رہا تھا روز-''

''ارے بھابھی! لڑکیوں کی فکر نہ کریں- وہ تو ہوا کیا گرم دھوپ میں جھلتی رہتی ہیں- اسکول کالج کے آنے جانے میں' بھابھی جان نے مہربانی کی ہے- ہمیں آرام ہی رہے گا- بچیوں کو میں منع کردیتی ہوں- باورچی خانے کا رخ اس وقت کریں جب وہ بھتنا وہاں سے چلا جائے- اس کو بھی کہنا ہے کہ کھانا پکا کر باہر چلا جایا کرے- بھابھی جان خود سمجھا لیں گی اسے- آپ اعتراض کرکے کیوں بری بنیں-''

پھپھو چپ ہوگئیں-

لڑکیوں کے تو مزے ہوگئے' جب بھی کوئی بھائی تھکن کا عذر کرکے چائے بنوانے کا کہتا- لڑکیاں صاف انکار کردیتیں-

''وہاں تو خانساماں ہوگا-''

''وہ کوئی ہوا ہے کہ بھوت ہے؟''

''وہ کوا ہوسکتا ہے ہوا نہیں- دیو ہے' بھوت نہیں-'' شمع نے بتایا-

تایا کے بیٹے واسع نے اپنی بہن سے کہا-''تابندہ! تم چائے بنالاؤ-''

''کیوں؟ میں فالتو ہوں- وہ بھتنا جو ہے وہاں-''

''ارے ہمارا پرانا خانساماں ہے-'' واسع نے خفا ہوکر کہا-''تمہارے لیے نیا تو نہیں-''

''تو پہلے مجھے کب خبر تھی کہ وہ بھتنا ہے-'' تابندہ نے منہ بنایا-

''کمال ہے-'' واسع خود جاکر چائے بنوا لایا-

''دیکھو اس بھتنے نے کتنی اچھی چائے بنائی ہے- ثناء کو پلاؤ- پھر صحیح داد ملے گی-''

''جی نہیں- ثناء کی خیر خیریت سے شادی ہونے دیں- کہیں بھتنے کا اثر نہ ہوجائے-''

''ویسے یہ دیو کھانا اچھا بناتا ہے-'' سب کا متفقہ فیصلہ تھا-

''تم لوگوں نے بے چارے کو بدنام کر رکھا ہے مفت میں- اب بندے کی شکل اللہ میاں نے ایسی بنادی تو وہ کیا کرے-''

''کم از کم کھانا نہ بنائے بلکہ۔''

''بلکہ سیدھا جیل چلا جائے۔ جلاد کا کام فوراً مل جائے گا۔''

''دوسری بات یہ کہ آپ چاہتے ہیں۔ بلکہ آپ کو اعتراض ہے کہ ہم نے مفت میں بدنام کیا ہے تو آپ اس کو واپس لے لیں۔ یعنی ہمیں ہماری کارکردگی پر انعام کیش کی صورت میں دیں۔ کچھ نہ گئے ناراض بھائی۔''

''پھنسے تو ہیں مگر دوسرے طریقے پر۔'' اسامہ نے آنکھ دبا کر کہا اور لگا دی چھلانگ باہر۔ رافع اسے مارنے دوڑے۔ طیبہ کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

☆☆

مہندی کا فنکشن بھی کافی شاندار رہا۔ اس روز سرفراز نے سرخ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سفید پینٹ پر سرخ ٹی شرٹ سرفراز کی گوری رنگت پر کھل رہی تھی۔ سب اس کا مذاق بنا رہے تھے کہ وہ لڑکی لگ رہا ہے۔ گوری گوری لگتا ہے تازہ تازہ ایمکس لگائی ہے۔ سرفراز ٹی شرٹ اتار کر سفید قمیص پہن آیا۔ فریال نے کہا۔

''اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ کیوں اتاری تم نے۔''

''سب مذاق اڑا رہے تھے اس لیے.....''

''تو اڑانے دو مذاق کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔''

''چوٹ بھی لگتی ہے عزت نفس کو۔'' سرفراز سنجیدہ ہو گیا۔ فریال حیران ہو گئی۔

کتنی معمولی باتوں سے ان بہن بھائی کی عزت نفس مجروح ہو جاتی ہے۔

لڑکے والے بہت شاندار بری لائے تھے اور ان کی طرف سے بھی لڑکیاں تیاری سے آئی تھیں۔ گانے کم، فنی مذاق پھبتیاں زیادہ۔

اگلے دن شادی تھی۔ شناء دلہن بن کر بہت حسین لگ رہی تھی۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ جنت کی حور لگ رہی ہے۔ گلابی تیز کلر کے سوٹ پر فیروزی کام بنا ہوا تھا اور بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ تائی نے سب لڑکیوں سے کہا۔

''دیکھو ایسی ہوتی ہے دلہن۔ تم لوگ تو سب میک اپ میں ہوتی ہو۔ کنواری بیاہی کا فرق ہی نہیں رہا۔ شناء نے کبھی کوئی مصنوعی چیز نہیں لگائی۔ آج میک اپ نے اس کو جنت کی حور بنا دیا۔ تم لوگ دلہن بن کر خاص نہیں لگو گی۔ یاد رکھنا۔''

''سچی بات ہے۔ دولہا بھی کم نہیں۔ بڑی حسین جوڑی ہے۔ مبارک ہو۔'' سب نے پھپھو کو مبارکباد دی۔

رخصتی کے وقت پھپھو کی طبیعت خراب ہو گئی۔ شناء نے بھی جہالت کا خوب خوب ثبوت پیش کیا۔

رو رو کر سارا میک اپ تباہ کر دیا۔ شناء کی نند نے تسلی دی کہ ''بیوٹیشن ہمارے گھر میں موجود ہے۔ فکر نہ کریں۔ جاتے ہی تیار کر لیں گے۔'' بابا پھپھو کو تسلی دیتے رہے۔

☆☆

اگلے دن بہنیں بھائی شناء کو لینے سسرال گئے۔ کیا کوٹھی تھی۔ محل تھا پورا۔ باہر سے ہی شان ٹپک رہی تھی۔ مخملی گھاس کا وسیع لان اور پھولوں کی بہتات۔ لائٹنگ کے لیے جدید قسم کے کھمبے۔ بیڈمنٹن کورٹ اندر کوٹھی تو اس قدر حسین تھی۔ کیا ڈیکوریشن کی چیزیں۔ قیمتی فریموں میں بیش قیمت حسین تصویریں۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور بس فریال تو حیرت سے اشیاء کو ہی جانچتی رہی۔

اس کے ذہن میں جیسے کوئی ریلوے انجن شنٹنگ کر رہا تھا۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر جبکہ شناء کے کزنز شناء کے شوہر شہزاد سے گپیں مارنے میں لگے تھے۔ لڑکیاں شناء کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ واپس آ کر بھی فریال پر ایک بوجھ سا رہا۔ شناء اتنی خوش تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ جتنا اسے ہونا چاہیے۔ غیر متوقع طور پر بلندی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اس کی قسمت اتنی زور آور ہو سکتی ہے۔

رات کو ولیمہ تھا اور وہ شہزاد کے شایان شان اتنی چکا چوند اور جگمگاہٹ تھی۔

فریال کو رشک آ رہا تھا۔ ساس نندیں شناء پر واری صدقے جا رہی تھیں۔ کیا تھا شناء کے پاس اور کیا نظر آیا تھا شناء کی ساس کو پھپھو کا وہ پرانی لکھوری اینٹوں کا مکان۔ پرانا بوسیدہ فرنیچر۔ شناء کچھ اتنی زیادہ حسین بھی نہیں تھی۔ ہاں اس کے چہرے پر ملاحت ہے۔ سادہ رہنے کی وجہ سے اس کی جلد میں نرمی اور چکناہٹ ہے۔ یہی خوبی انہیں پسند آئی تھی۔ مگر انہیں اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی مل ہی جاتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شناء کی سسرال کا گھر۔ فریال کے ماموں کے گھر سے زیادہ شاندار تھا۔ پھپھو نے شناء، شہزاد اور ان کے گھر والوں کی دعوت کی۔ اپنے رشتے داروں کو بھی بلایا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ گھر میں ہی کھانے کا انتظام کیا گیا۔

فریال نے کہنا چاہا کہ پھپھو یہ دعوت ہوٹل میں کر لیں۔ گھر میں اتنی جگہ کہاں تھی۔ مگر رشتے دار لڑکے لڑکیوں نے اسی گھر کو اس قابل بنا دیا کہ سمدھیانے والے آرام سے بیٹھے۔ یوں بھی وہ لوگ خاصے بے تکلف قسم کے تھے۔

پھپھو کی معذرت پر شناء کی چچی ساس نے منہ پھاڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''واہ بہن! اب رشتہ ہوا ہے تو آپ ہمیں کچن میں بٹھائیں گی تو ہم بے عذر وہیں جا بیٹھیں گے۔''

دعوت خاصی شاندار تھی۔ سب نے تعریف کی، کھانا تائی، پھپھو اور پھپھو جان نے مل کر پکایا تھا۔ مسٹنڈا خانساماں بھی مددگار تھا۔

اس دعوت میں تائی کی بیٹی تابندہ اور پھپھو کے چچازاد بھائی کی بیٹی شمع کے رشتے طلب کیے گئے۔

شہزاد کے ایک چچازاد اور ایک خالہ زاد بھائی کے لیے۔ تائی تو فوراً ہی اقرار کرنا چاہ رہی تھیں۔ مگر پھپھو نے اشارے سے روکا۔ (وہی معلومات) البتہ شمع کے ابا نے سوچنے کے لیے مہلت طلب کی۔

شناء بہت خوش تھی۔ وہ بار بار منت کرتی۔ ''تائی انکار مت کیجیے گا۔''

ادھر شمع کے والد اور والدہ سے بھی یہی درخواست۔ پھپھو نے کہا۔

''یہ لڑکی تو باؤلی ہوگئی ہے۔ اے ابھی دن کتنے ہوئے ہیں۔ جو تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔ ذرا سب کو پرکھنے تو دو۔''

شمع کو خوب ستایا گیا۔ کیونکہ وہ خاطر تواضع میں بہت آگے آگے رہتی۔ آٹھ دن بعد بابا کے ساتھ گھر واپسی پر فریال کے لبوں پر وہ سوال آ ہی گیا جس نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

''شناء میں ان لوگوں کو کیا نظر آیا۔ جو اس قدر جوش اور پیار سے بیاہ لے گئے؟ گھر دیکھا نہ ان کی پوزیشن۔ شہزاد بھائی کو اس سے بہتر دلہن مل سکتی تھی۔ دولت مند بھی ہوتی۔ ان کی نظر کی۔''

''بیٹا سب کا قبلہ و کعبہ صرف دولت نہیں ہوتا۔ اب بھی کچھ لوگ خاندان' شرافت اور سادگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپا کی بے لوث یگانگت اور شناء کی شائستگی کی وجہ سے دو اور لڑکیوں کے لیے بھی رشتے طلب کر لیے گئے ہیں۔ یاد رکھو۔ دولت کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی پیسہ تو آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ محبتیں ہمیشہ رہتی ہیں۔''

پیسہ کہاں چلا جاتا ہے۔ یہ ابھی تک فریال نہیں سمجھ سکی۔ کچھ دن شناء کی شادی کے دلچسپ واقعات اسے تنہائی میں مسکرانے پر مجبور کرتے رہے۔ پھر وہ کالج' پڑھائی اور دوستوں میں مصروف ہوگئی۔

☆☆

پھپھو کے خط آتے' ہر خط میں بابا کو تاکید۔

''اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ مجھے تمہاری صحت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اپنا خیال رکھو۔''

بابا ہنستے۔ ''دیکھا آپا کی چاہت۔ ابھی تک مجھے بچہ سمجھتی ہیں۔ ماں کی طرح دور بیٹھی فکرمند۔''

پھر ایک بار پھپھو نے لکھا۔ ''میں نے تم سے جس تمنا کا اظہار کیا تھا تم نے سوچ کر جواب دینے کا کہا تھا۔ کب تک سوچو گے۔ انکار کرو گے تب بھی برا نہیں مانوں گی۔ کچھ کہو تو۔''

پھر کسی عزیزہ کے بارے میں لکھا تھا کہ خالہ صاحبہ' ہو بنا کر لے تو گئیں۔ مگر چار دن نبھا نہ سکیں۔ بے چاری سے اس کا پورا جہیز چھین کر دھکے دے کر نکال دیا۔ اب وہ کہاں جائے ماں باپ بھی نہیں۔ میں نے تو سوچا تھا۔ تمہاری تنہائی کی فکر سے نجات پالوں گی۔ مگر تم کچھ کہتے ہی نہیں۔''

''یہ پھپھو نے کیا لکھا ہے۔ آپ سے ان کی کس بارے میں بات ہوئی بابا؟'' فریال اتفاق سے خط پڑھ چکی تھی۔

بابا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''ہاں انہوں نے مجھ سے میری عزیز چیز مانگی تھی۔ انہوں نے مجھ سے تمہارا ہاتھ مانگا ہے' سرفراز کے لیے۔''

فریال سناٹے میں آ گئی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ''کیا پھپھو کو خبر نہیں۔ وہ تو شہریار سے۔ اور' اور یہ تنہائی سے نجات۔'' زبان اور بھی اٹھ گیا۔

''وہ۔'' بابا نے۔ ''کوئی خاتون ہیں۔ ان کو میری تنہائی میں شریک کرنا چاہتی ہیں۔ لو اب اس عمر میں اور میں تنہا کب ہوں۔ بھئی میرا بیٹا تو ہے میرے پاس۔''

''بابا! پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ نے اتنے سال تنہا گزار دیے۔ اب آپ کو دیکھ بھال کرنے والی کی ضرورت ہے۔ پھپھو کو آپ کی صحت کی فکر ہے۔''

''اچھا۔ تقریر کرنے کا شکریہ آپا کے پہلے سوال کا جواب بھی چاہیے مجھے۔ میں کب سے سوچ رہا تھا۔ تم سے بات کروں بیٹا۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی میں تمہاری فکر سے آزاد ہو جاؤں۔ آپا سے بہتر گھر تمہیں نہیں ملے گا۔ وہاں تمہیں اصلی چاہت' حقیقی محبت ملے گی۔ وہاں ڈیکوریشن پیسز نہیں۔ زندہ' سانس لیتے ہوئے گرم جوش انسان رہتے ہیں۔ مجھے بڑا اطمینان ہوگا۔ اگر۔''

فریال کھڑکی کی سمت منہ کر کے کھڑی ہوگئی۔ سامنے لان میں پھولوں کی کیاریوں میں بہار آئی ہوئی تھی۔ مگر اسے لگا۔ سارے پھول مرجھا گئے ہیں۔ اچانک ہی گرم ہوا نے جھلسا دیا پھولوں کو۔

''مگر..... بابا..... یہ کیسے..... مطلب ماموں۔'' وہ لڑکھڑانے لگی۔ زبان بھی لڑکھڑائی۔

''ہاں۔ ممکن ہے انہیں اعتراض ہو۔ دیکھو فری ہر شخص اپنی اولاد کی بہتری چاہتا ہے۔ کیا میں ایسا کر کے مجرم بن جاؤں گا؟ نہیں۔ مجھے تمہارے ماموں کے رویے سے افسوس ہوتا ہے اور ان کا بیٹا وہ تو مجھے اپنے آفس کلرک سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ خیرا گر اتنا ہی ہوتا۔ تب بھی تمہاری خوشیوں کے لیے برداشت کر لیتا۔ مگر صاحبزادے تیز قدمی سے نہ جانے کس راستے پر چل رہے ہیں۔ ان کی بے راہ روی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں کہنا تو نہیں چاہتا تھا۔ ابھی تک چپ رہا۔ مگر اب پانی سر سے گزرتا جا رہا ہے۔ کسی لڑکی نے ان کے اور ان کے دوستوں کے خلاف پرچہ درج کرایا۔ وہ تھانے کی سیر کر آئے۔ مگر پولیس افسر سے بدکلامی کے نتیجے میں پھر پکڑے گئے۔ شرابی' جواری بس زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ مجھے تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔''

بابا اٹھ کر تیزی سے باہر چلے گئے۔ ان کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔ پھر وہ دوا کھا کر لیٹ گئے۔ فریال گم صم اپنی جگہ کھڑی رہی۔ شہریار بابا کی عزت نہیں کرتے۔ یہ وہ کئی بار محسوس کر چکی تھی۔ نہ جانے یہ شہریار کا رعب تھا۔ یا لحاظ کہ وہ کبھی نہ کہہ سکی ''میرے بابا۔ تمہارے بھی کچھ لگتے ہیں۔ ان کو اسی رشتے سے پکارتے ہوئے تمہیں شرم کیوں آتی ہے۔ اس طرح تمہارا۔ اپنے باپ سے کہو یہ طرز تخاطب ذلت آمیز ہے۔ مگر ہر بار زبان پر تالے پڑ گئے۔ شراب' وہ جانتی تھی شہریار دوستوں

کے ساتھ کبھی کبھار شغل کر لیتا ہے- اونچی سوسائٹی میں اسے برا بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن لڑکی دوستوں کے ساتھ تھا نہ حوالات یہ سب کیا ہے-

بابا سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی ہمت نہ تھی یوں تو وہ بابا سے بے تکلفی سے ہر بات کر لیتی تھی مگر..... ان کا موڈ اور وہ شہریار کی بات کرتے ہوئے کافی تلخ ہو گئے تھے فریال نے تنہائی میں دل کو ٹٹولا اگر شہریار بابا کے معیار سے گر گئے پھر کیا اس کی خاطر شہریار خود کو بدل نہیں سکتے؟

وہ یہ تو نہیں سمجھ سکتی تھی کہ شہریار اس کی خاطر کیا کر سکتے ہیں- ہاں وہ خود ان کے لیے خود کو بدل سکتی ہے- اب شہریار کا امتحان تھا- لیکن کیا ان کے زبانی وعدے پر بابا یقین کر لیں گے- وہ تو عمل پر یقین رکھتے ہیں-

اس دن اس کا بڑا دل بے تاب ہوا- یا وہ ماموں کے گھر جا کر الزامات کی تصدیق کرے- یا شہریار خود آ جائیں- ماموں کے گھر جانے کے لیے بابا کی اجازت درکار تھی- نہ جانے دل کو کیا ہو رہا تھا- دل بھر آیا آنسو جمع ہو کر ٹپکنے لگے- پھر فون کی بیل ہوئی- ایمی تھی- کافی دن سے وہ گئی نہیں تھی- خیریت پوچھ رہی تھی- فریال نے گلا صاف کیا-

''تم ٹھیک تو ہو فری-''

''آں ہاں' وہ زکام-''

''اچھا- تم فوراً ڈاکٹر وہاب کے پاس جاؤ- کیا تمہارے باپ کو اس بات کا بھی احساس نہیں کہ تمہاری صحت کا خیال رکھنا ان کی ذمہ داری ہے-'' ایمی کا لہجہ بابا کے متعلق اہانت آمیز تھا- اور آج اسے خیال آیا- ماموں کے گھر میں سب ہی بابا کو غائبانہ طنز یا کوستے ہیں- ایسے ہی الفاظ میں ذکر ہوتا ہے- وہ شخص- تمہارا باپ- تمہارے والد بزرگوار-

''ہاں- میں نے دوا لے لی ہے- سنو ایمی! میں نے کچھ سنا ہے- شہری کے بارے میں-'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی-

''اچھا' تو تمہارے باپ کے پیٹ میں درد اٹھا اور اتنی سی بات ہضم نہیں کر سکا وہ شخص- بڑا احسان کیا تھا جیسے-'' ایمی جیسے پھٹ پڑی-

''بابا نے' مگر بابا نے کیا کیا ہے-'' وہ حیران کن انداز میں چیخی-

''تو پھر تمہیں کس نے شہری کے بارے میں بتایا؟'' ایمی سنبھل کر بولی-

''وہ فون آیا تھا کسی کا' میں تو بابا سے پوچھ بھی نہ سکی کہ شاید انہیں علم نہ ہو اور میرے ذریعے یہ خبر انہیں پہنچے- ایمی! کیا ہوا تھا؟'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی-

''کچھ نہیں یہ (گالی دے کر) فضول لڑکیاں- پہلے چھیڑیں بڑھاتی ہیں- پھر جب بات بڑھ جاتی ہے تو عزت کی دہائی دیتی ہیں- کم بخت گئی کیوں تھی لڑکوں کے ساتھ بھور بن اور گئی تھی تو سوچنا تھا

کہ سب فرشتے تو نہیں تھے- یہ مڈل کلاس لڑکیاں کچھ زیادہ ہی عزت دار بنتی ہیں- دولت مند لڑکوں کے تحفے وصول کرتے وقت تو باچھیں چری ہوتی ہیں اور جب وہ کچھ وصول کرنا چاہیں تو-''

''مگر ہوا کیسے؟ شہری تو ایسے نہیں ہیں-'' ایک امید آس تھی-

''بہت بھولی ہو تم- شہری بھی اپنے دوستوں کے ساتھ ہوش کھو دیتا ہے-'' ایمی ہنسی-

''مگر تم نے بابا کا نام کیوں لیا تھا؟''

''اس لیے کہ شہریار کی مختی نے آواز دی تھی- لڑکی نے تھانے میں شور شرابا کیا- سب لڑکے پکڑے گئے- تمہارے بابا نے شہری کی ضمانت دی تھی- وہ گھر آ گیا تو فون پر پولیس افسر کو گالیاں دینے لگا- انسپکٹر گھر آ گیا تو اس سے ہاتھا پائی کی بھئی نشے میں ہوش کہاں رہتا ہے-'' دھڑام امید آس کا تکیل زمین بوس ہو گیا-

''تو بابا کو تو... مطلب ضمانت-''

''ارے نہیں- ضمانت انہوں نے دوسرے الزام کی کرائی تھی- فکر مت کرو- آئی جی تمہارے باپ کے دوست ہیں- انہیں کچھ نہیں ہوگا- اب پپا شہری کی ضمانت کرانے گئے ہیں-''

''ایمی- شہری سے کہو پلیز- یہ سب..... یہ سب نہ کریں- بابا..... بابا کو اگر اعتراض ہوا تو-''

''ہونے دو- ہمیں پروا نہیں اور تم بھی فکر نہ کرو-''

ایمی نے فون بند کر دیا بغیر یقین دہانی کرائے- فریال پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی- اس روز بابا بھی آرام کرتے رہے- فریال بھی-

فریال کے چمن کی بہار تو وقت سے پہلے گرم ہواؤں کی زد میں آ گئی تھی- کچھ بھی یقینی نہ رہا- ایمی نے کتنے معمولی انداز میں بے رخی سے ذکر کیا تھا- کیا واقعی دولت مند لوگ بے حس ہوتے ہیں- بے مروت شناء کی شادی میں کئی لوگ خوشحال بھی تھے- ان کی لڑکیاں خوش مزاج- خوش مذاق اور سادہ طبیعت کی تھیں- شاید وہ اتنی زیادہ امیر نہ ہوں- ایمی جیسی' وہ جہاں جگہ ملتی لیٹ کر سو جاتیں- باتیں کرتے کرتے اسی جگہ لڑھک جاتیں- کسی کو آرام یا احترام کی خواہش نہ تھی- جبکہ پھپھو نے فریال کے لیے شناء کے برابر آرام دہ بستر تیار کروایا تھا- اس کے کھانے پینے کی پھپھو کو بہت فکر رہتی- اکثر تو وہ سب سے چھپا کر اسے بطور خاص کوئی فروٹ یا مٹھائی کھلا دیتیں- پتا نہیں وہ واقعی اس سے اتنی محبت کرتی ہیں یا بابا کے پیسے پوزیشن کا لحاظ ہے- بعض دفعہ خوشامد سگے بھائی کی بھی تو کی جاتی ہے- وہ خوشامد اور محبت کے فرق کو پہچان نہیں سکتی تھی' ابھی اسے تجربہ نہ تھا-

☆☆

اس دن کے بعد بابا کی پھر اس مسئلے پر گفتگو نہ ہوئی- اب سے کچھ عرصہ پہلے یہ بات ہوئی ہوتی تو وہ بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیتی- بابا کو قائل کر کے رہتی کہ وہ صرف شہری کے ساتھ ہی خوش رہے گی' مگر

ایمی کی گفتگو اس کا لاپروا انداز اور شہری کے مشاغل کی تصدیق کے بعد بابا کو قائل کرنا احمقانہ کارروائی ہوتی - بابا خاموش تھے - تو وہ بھی چپ رہی تھیں پھپھو کو - کچھ جواب بھی دیا کہ نہیں -

اپریل کا مہینہ ابھی بہار رخصت نہیں ہوئی تھی اور گرمی کا آغاز نہایت دھیمے انداز میں ہو رہا تھا - لیکن ابھی جھکڑ چلنے شروع نہیں ہوئے تھے - مجموعی طور پر خوشگوار موسم کہا جا سکتا تھا -

بابا کے دفتر جاتے ہی اسے خیال آیا - بابا تو پانچ بجے آتے ہیں کیا حرج ہے اگر میں ماموں کے گھر کا چکر لگا لوں - اگر بابا کو علم ہوا بھی - زیادہ سے زیادہ ڈانٹ ہی لیں گے - ملازمہ کو ساتھ لے کر وہ ٹیکسی پر ماموں کے گھر پہنچی - ملازمہ کو تو اس نے فوراً روانہ کر دیا - سب نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا - مامی تو بے حد خوش ہوئیں - جب شیما شکوہ کر رہی تھی تو مامی نے اس کی حمایت کی ''وہ نہیں آئی تھی - تو تم ہی جا کر مل آتیں - وہ تو پھر بھی آ گئی ہے -''

وہ تو شہریار سے بات کرنے آئی تھی مگر اس کے دوست آئے ہوئے تھے - شہری نے اسے دیکھ لیا تھا - دور سے ہی ہیلو کہہ کر اپنے کمرے میں گھس گیا - پھر شیما' ایمی نے فریال کو خوش کرنے کے لیے پکنک کا پروگرام بنا لیا وہ انکار کرتی رہی کہ صرف ملنے آئی ہے لیکن انہوں نے شہریار کو بھی بلا کر ارادہ ظاہر کیا ادھر سے بھلا کیا انکار ہوتا - شہریار کے دوست بھی فوراً راضی ہو گئے - فریال کی فریاد کسی نے سنی ہی نہیں -

پندرہ منٹ کے اندر ایمی اور شیما کے دوست لڑکے لڑکیاں بھی آ گئے - کئی گاڑیاں تھیں - فریال بے بسی سے ان کا جوش و خروش دیکھ رہی تھی - کافی دن سے وہ بھی کہیں نہیں گئی تھی - سوچا' بابا سے کہہ دوں گی وہ لوگ گھر پر آ کر زبردستی اسے ساتھ لے گئے - بابا کو نوکروں سے تصدیق کی عادت نہ تھی - یہ سوچ کر وہ بھی مسکرانے لگی -

''ایمی! ایک وعدہ کرو - دیر نہیں ہو گی - مغرب تک ہم آ جائیں گے -''

''سنو فری! پکنک میں ٹائم گزرنے کا پتہ نہیں چلتا - دوپہر کو تو دھوپ بھی تیز ہونے لگی ہے - سورج غروب ہونے کے بعد ہی لطف آتا ہے - یوں بھی جہاں جا رہے ہیں ہم' وہاں سے واپسی رات سے پہلے نہیں ہو گی -''

''کہاں' کہاں جا رہے ہیں -'' وہ خاصی پریشان ہوئی -

''تر یلا ڈیم -'' کہہ کر ایمی بے اعتنائی سے مڑ کر چلی گئی - اسی وقت مامی نے بتایا کہ اس کے لیے فون آیا ہے - وہ ریسیور اٹھا کر ہیلو ہیلو کرنے لگی - مگر فون کرنے والی بوا تھیں - بہری بھٹ - وہ فون پر صرف دو جملے بول رہی تھیں - ریکارڈ کی طرح جیسے سوئی اٹک گئی ہو -

''فریال بی بی! جلدی گھر آ جاؤ - صاحب گھر آ گئے ہیں - وہ اپنی دوائیں تلاش کر رہے ہیں - تم نے کہاں رکھ دیں - ان کی طبیعت خراب ہے - فریال بی بی جلدی آ جاؤ - دوائیں دے دو صاحب

کی -''

وہ چیختی رہی ''بوا بابا کو فون دو - میں انہیں بتا دوں گی -''

مگر بوا کب سنتی تھیں - فون بند کیے بغیر ہی وہ کہیں رفو چکر ہو گئیں -

فریال برابر ڈائل گھماتی رہی - مسلسل انگیج کی ٹون ہو رہی تھی - اف اس نے بھی تو غلطی کی انتہا کر دی -

کل جو دوائیں بابا نے خانساماں سے منگوائی تھیں وہ اس نے بابا کے کمرے میں میز پر رکھنے کے بجائے اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ لیں کہ جب بابا مانگیں گے دے دوں گی - مگر اب آخر بابا خود فون کیوں نہیں کر لیتے - ان کی طبیعت کو ہوا کیا - صبح ٹھیک ٹھاک گئے تھے - گھر کیوں آ گئے - دوا تو وہ مارکیٹ سے اور بھی منگوا سکتے ہیں - یقیناً انہیں اس کی خودسری پسند نہیں آئی - وہ ان کی اجازت کے بغیر یہاں جو آ گئی -

اس نے ایمی شیما کو مسئلہ بتا کر کہا -

''بس ایک منٹ کے لیے مجھے گھر ضرور جانا ہے - دوائیں دے دوں اور طبیعت کا پوچھ لوں -''

اس نے یہ نہیں کہا کہ بابا سے اجازت بھی لے لوں - ورنہ وہ خفا ہوتیں -

''بس ایک منٹ کے لیے ایمی -'' وہ منت کر رہی تھی -

''کیسی باتیں کرتی ہو فری! ایک منٹ کے لیے - تمہارے گھر کا پندرہ منٹ کا راستہ پھر واپس آنے کا بھی پندرہ بیس منٹ اور یہ لوگ جنہیں ہم نے فون کر کے بلایا ہے - سب جلوس لے کر جائیں کیا تمہارے ایک منٹ کے کام کی خاطر؟ چھوڑو وہ دوا کے بغیر مر نہیں جائیں گے -'' کس قدر بے رحم تھی ایمی -

''دواؤں سے سارے شہر کے اسٹور بھرے ہیں - کیا انہیں آب حیات درکار ہے -'' شیما تمسخرانہ بولی -

''ایک بات تو بتاؤ - یہ تمہارے بابا کو خاص ہماری تفریح سے ہی دشمنی ہے - جب پروگرام بنایا - انہوں نے روڑے اٹکائے -'' شہریار کا لہجہ خاصا تکلیف دہ تھا -

فریال روہانسی ہو کر مامی کو دیکھنے لگی - انہیں اس پر شاید ترس آ گیا - کہنے لگیں -

''چلو میں تمہیں اپنی گاڑی پر چھوڑ آتی ہوں -''

''مامی! ان سے کہیے صرف ایک منٹ کے لیے رکوں گی میں -''

اور جب وہ مامی کی کار میں بیٹھ رہی تھی - ایک کے بعد دوسری گاڑیاں گیٹ سے نکلتی چلی گئیں - کسی نے اس کا انتظار ضروری نہ سمجھا - جو پروگرام خاص اس کے لیے بنایا گیا تھا - کتنی چھوٹی بات پر برا مان گئے وہ - ''بے مروت'' اس کے اندر کوئی چلایا -

گھر پر ایک قیامت منتظر تھی- بابا کمرے میں بے ہوش پڑے تھے- بوا نہ جانے کیا کیا کر رہی تھیں- انہیں ہوش دلانے کے لیے- کبھی ادھر جاتیں کبھی ادھر' فریال کی چیخیں نکل گئیں- خانساماں حسبِ معمول غائب- مالی ندارد....کوئی مرد نہ تھا گھر میں- بشیرن کو وہ ماموں کے گھر جاتے ہی بھیج چکی تھی- مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی- لاپروا- نمک حرام-

مامی پڑوس سے دو ڈرائیوروں کو بلا لائیں- ان کی مدد سے بابا کو بمشکل گاڑی میں لٹا کر ہاسپٹل لائیں- ایمرجنسی میں فوراً آکسیجن لگا دی گئی- کئی ڈاکٹر جمع ہو گئے- ''ہاں....نہیں' شاید' دعا کریں-'' ڈاکٹر مایوس تھے-

ہارٹ اٹیک جان لیوا....شام کو ایمبولینس نے گھر پہنچا دیا- فریال پر سکتہ طاری تھا- ماموں شہر میں تھے نہیں- خالہ' خالو آ گئے تھے- خالو نے تدفین کا انتظام کروایا- بوا نے چیخ چیخ کر انہیں یاد دلایا- تو مامی نے پھپھو کو فون کیا- ثناء نے فون ریسیو کیا- ادھر بھی ایک ایسی خبر تیار تھی ثناء کے والد فوت ہو گئے تھے- ایک دن پہلے ہاسپٹل چیک اپ کے لیے گئے تھے وہیں روک لیا گیا اور دوپہر کو وہ بھی دنیا چھوڑ گئے-

ثناء روتے ہوئے' کیا کرتی آنٹی- اماں کو کیسے سناؤں یہ خبر' میرا دل دماغ بیکار ہو گیا ہے- اماں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے- سرفراز بھائی ابا کی ڈیڈ باڈی وصول کرنے گئے ہیں- وہ آئیں تو مشورہ کروں- آپ ہی بتائیے میں کیا کروں-'' وہ بے حد اپ سیٹ تھی-

''بی بی! اب صبر کے سوا اور کیا کر سکتی ہو- تم لوگ خود ہی صدمے سے گزر رہے ہو- اللہ تمہیں صبر دے- اپنی اماں کا خیال رکھو- دو دو صدمے- مگر بندہ کیا کر سکتا ہے؟''

''آنٹی! فریال-''

''بیٹا! وہ تو سکتے کی کیفیت میں ہے-''

''ہائے کیا کروں' میری ننھی منی بہن-''

ثناء بے چین ہو گئی- مامی نے اسے تسلی' دلاسا دے کر فون بند کر دیا- ماموں آ گئے اور فریال کے بابا کو آخری منزل پہنچانے کا انتظام مکمل ہو گیا- جب چار آدمیوں کے کندھے پر ان کا پلنگ اٹھایا گیا تو فریال کا سکتہ ٹوٹ گیا اور آخری وقت اس نے بڑے درد و کرب سے پکارا-

''بابا! مجھے بھی لے چلیں! بابا آپ نے مجھ سے بات بھی نہیں کی- کہاں لے جا رہے ہو میرے بابا کو تم لوگ-''

وہ اتنے زور سے چیخی کہ گلے میں خراش ہو گئی- پلنگ کو اٹھانے والے بابا کے آفس کے لوگ تھے- نہ جانے کیسے سب کو خبر ہو گئی تھی اور سارے آفس والے- جان پہچان والے- بابا کے احباب- پڑوسی سب ہی جمع تھے- پورا گھر لوگوں سے بھرا تھا اور نہیں تھا تو شہریار- وہ ننگے پیر گیٹ

تک دوڑتی چلی گئی-

''روکو' روکو لو بابا کو-''

مگر جانے والا مسافر جا چکا تھا- وہ مامی کی گود میں بے ہوش ہو چکی تھی- رات بارہ بجے شہریار' ایمی اور شیما آئے- وہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے- اس لیے جلدی چلے گئے- صبح آنے کا وعدہ کر کے- شہریار نے اس کا بازو تھپکا- ایمی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنسو جمع کیے- شیما یہ بھی نہ کر سکی- تھکی ہوئی تھی-

ماموں خالہ فریال کو لپٹائے رہے تھے- تسلی دے رہے تھے- مامی کھانا ہاتھ میں لیے منت کر رہی تھیں کہ وہ دو لقمے تو کھا لے- صبح سے ابھی تک قطرہ پانی تک حلق سے نہیں اترا تھا- مگر اس کی تو کیفیت ہی عجیب تھی- جیسے کوئی دل چیرے ڈال رہا تھا اور وہ خون کے دریا میں ڈوب رہی تھی- لہولہان وجود- تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ خود کو ماموں خالہ کے ہاتھوں سے آزاد کر کے پھپھڑوں کا زور لگا کر ایک آواز لگاتی-

''بابا!'' اس قدر درد بھری فریاد- روح فرسا پکار' پھر وہ تڑپنے لگتی- کسی کے قابو میں نہ آتی- اسے ہوش نہ تھا- پھر اسے نیند کا انجکشن دینا پڑا-

صبح کیسی کرب ناک تھی- اتنے بہت سے لوگوں میں فریال کو اپنا وجود بالکل تنہا لگ رہا تھا- کوئی تو ہو- کوئی اپنا- کوئی بہت ہی اپنا ہر طرف قدموں کی آوازیں تھیں- مگر وہ خاص چاپ کہاں جا چھپی جس کی ہلکی سی تھرتھراہٹ حفاظت کا پیام دیتی تھی- میرے بابا کے قدموں کی آہٹیں- اب سنائی نہیں دیتیں- ''بابا'' وہ چیختی ''میں کہاں جاؤں؟'' پھر ماموں مامی اسے سنبھالتے-

تیسرے دن ثناء اپنے شوہر کے ہمراہ آئی- دونوں بہنیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں- دونوں کا دکھ مشترک تھا- دونوں کا صدمہ ایک' رو رو کر ایک دوسرے کو تسلی دیتی رہیں- ثناء بچے کو چھوڑ کر آئی تھی- رک نہیں سکتی تھی- دوسرے دن چلی گئی-

گیارہ دن بعد پھپھو سرفراز کے ساتھ آئیں- پھپھو غم سے نڈھال صبر کی زندہ تصویر- گھر کے چپے چپے میں بھائی کا عکس دیکھ رہی تھیں- صدمے نے قوت گویائی ہی چھین لی تھی- فریال کو گود میں لے کر بیٹھیں تو دل کو قرار آیا- خالہ مامی ان کے بچے سب موجود تھے- ماموں نے بھی پاس بیٹھ کر پھپھو سے تعزیت کی پھپھو نے منہ سر ڈھانپا ہوا تھا- کیونکہ وہ عدت میں تھیں- فریال کی دل دہی کے لیے گھر سے نکلی تھیں- چار پانچ دن ہوا کی طرح گزر گئے- پھپھو کو واپس جانا تھا کیونکہ وہاں بھی لوگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے- پھپھو نے مامی سے کہا-

''فریال کو تو میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں- میرا دل بھی اس کی وجہ سے سکون پائے گا- چین ملے گا-''

''آپ کی خواہش سر آنکھوں پر۔'' مامی نے نرمی سے کہا۔''لیکن ابھی تو شاید ایسا نہ ہو سکے۔ گھر کرائے کا ہے۔ اسے خالی کرنا ہوگا۔ سامان وغیرہ سمیٹنا۔ کہیں رکھوانا۔ آپ فریال سے تو پوچھ لیں۔''

پھپھو نے فریال کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ سوچنے لگی۔''مامی اس سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ ان دنوں جیسا وہ اس کا خیال کر رہی تھیں پھر خالہ بھی تھیں۔ ماموں ہر وقت شفقت کا اظہار کرتے رہتے۔ وہ ان لوگوں کی محبت سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی پھپھو کے ساتھ جانے کی مرضی ظاہر کر سکتی تھی۔ وہاں صرف پھپھو تھیں۔ یہاں سب تھے اور ممکن ہے ساتھ رہنے سے وہ شہریار کو اپنی خوشی کے مطابق ڈھال لے۔

''میں ماموں کے پاس رہوں گی پھپھو۔'' اس نے آہستہ سے کہہ دیا۔''آپ سے ملنے آیا کروں گی۔''

پھپھو کچھ افسردہ ہو گئیں۔ جاتے وقت پھر اسے سمجھایا۔

''جب جی چاہے میرے پاس آ جانا' فون کر دینا۔ میں سرفراز کو بھیج دوں گی لینے۔ ابھی تو خیر تمہارا یہاں رہنا ہی مناسب ہے۔ لوگ بھی آ رہے ہیں اور گھر کا بھی انتظام کرنا ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔ آؤں گی تم سے ملنے۔ ساتھ لے جاؤں گی۔''

پھپھو کے جانے سے کس قدر تنہائی ہو گئی تھی اسے۔ مامی خالہ اپنے گھر بھی جایا کرتی تھیں۔ کبھی دونوں ساتھ چلی جاتیں تو گھر بھائیں بھائیں کرتا۔ بہری بوا مسلسل بولتی رہتیں۔ وہ نہ ہوتیں تو وہ پاگل ہو جاتی۔

بوا کی بیٹی بھی بابا کا سن کر آئی تھی۔ فریال نے مامی کے مشورے پر اسے اپنے بہت سے کپڑے' جوتے' چپل دے دیے۔ کچن سے پرانے برتن اور کچھ اور چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور بھی بہت سی چیزیں۔ بوا برسوں سے ان کے گھر میں تھیں۔ ان کی بیٹی وقتاً فوقتاً آ جاتی تو بہت سا کام کر جاتی۔ کبھی اسٹور کی درستی' الماریوں کی صفائی اور ترتیب' کچن' برآمدہ دھلوا جاتی۔ بہت تیز دست تھی وہ۔

اب گھر خالی کرنا تھا۔ کافی فاضل سامان اور فرنیچر تھا۔ کچھ چیزیں اس نے اپنی مرضی سے بوا کی بیٹی کو دے دیں۔ کچھ ملازمہ زرینہ کو' بشیراں کو پھر گھر خالی کرنے کے لیے پیکنگ شروع ہوئی جو مامی خالہ نے کی۔ بوا نے اسے تاکید کی۔

''اپنے قیمتی سامان' زیورات اور دیگر چیزوں کی خود حفاظت اور دیکھ بھال کرو۔ چیزیں تمہاری ہیں۔ دوسروں کو کیا قدر ہوگی۔''

گھر چھوڑ کر جانے کا اسے ایسا دکھ ہوا جیسے بابا کی ابھی ابھی جدائی ہوئی ہو۔ برسوں سے وہ یہاں

رہ رہی تھی۔ کرائے کا سہی مگر بابا کی وجہ سے گھر سے بھی اتنی ہی وابستگی تھی۔

ماموں کے ہاں جاتے ہوئے دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اکیلے پن کا خوف بڑھ گیا تھا۔

اس نے پھپھو کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔''نہ وہ ماموں کے گھر جاتی۔ وقت پر بابا کو دوا مل جاتی تو وہ اس دور سے کو سہہ جاتے۔'' پھپھو نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''بیٹا! یوں نہ سوچو۔ انسان کی موت اسی وقت ہوتی ہے جو اللہ نے پہلے سے مقرر کیا ہوتا ہے۔ ہر ذی روح خواہ وہ کتنا صحت مند ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ وقت پر کسی بہانے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور بیٹا! دوائیں زندگی کی ضامن نہیں ہوتیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو لوگ مرتے ہی کیوں۔ دواؤں سے زندہ رہتے۔ آب حیات کہیں بھی موجود نہیں۔''

فریال کو یاد آیا۔ شیما نے کہا تھا انہیں آب حیات درکار ہے اور بابا کے منع کرنے کے باوجود وہ ماموں کے گھر چلی گئی۔ بابا کے اعتماد کا شیشہ ٹوٹ گیا ہوگا' شاید وہ اسی لیے۔ وہ سمجھے ہوں گے فریال روزی ہی چلی جاتی ہوگی۔ آہ' کیسے بابا کو بتاؤں۔ وہ پہلی غلطی تھی۔

پچھتاوے نے اسے نیم جان کر دیا۔ کیا بابا کو اس کا یہ اقدام اتنا دکھ دے سکتا ہے کہ جاں سے گزر گئے مگر نہیں۔ ان کا بے وقت گھر آنا' طبیعت کی خرابی کے باعث تھا۔ ان کے آفس کے لوگوں نے بتایا تھا۔ وہ گھر آرام کے لیے گئے تھے۔

☆☆

ماموں کے ہاں سب اس کا خیال رکھتے تھے۔ مامی ہر جگہ ساتھ لے جاتیں۔ ایبی' شیما اسے اپنے پروگراموں میں شریک رکھتیں مگر اسے اب کچھ اچھا نہ لگتا۔ وہ سیر و تفریح کی کتنی شائق تھی۔ اب اسے لگتا وہ کسی جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ بابا کو یہ ڈانس پارٹیاں' گانے بجانے پسند نہ تھے۔ یہ ہلا گلا' دعوتیں' وہ کتنے شوق سے شریک ہوتی تھی۔ روز وی سی آر پر فلم دیکھنا' دوستوں کو فون کرنا' اب کسی چیز میں دل نہ لگتا۔ ایبی' شیما' شہریار بھی اسے بہلاتے۔ ان لوگوں کی تو زندگی کا مقصد ہی یہ تھا۔

خالہ کے ہاں روزی' پنکی بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں اور ان تفریحات سے اسے چڑ ہونے لگی پھر ماموں کی دونوں بڑی بیٹیاں سسرال سے میکے آ گئیں۔ کچھ دن ان کے مسئلے مسائل میں لڑے اور پھر ماموں کے مفاہمت کی تجویزوں کے باوجود ان کو یکے بعد دیگرے طلاق ہو گئی۔ لو میرج اتھتا کو پہنچی۔

اب بے چاری عطورہ گئی' جو سسرال والوں کے نرغے میں تھی۔ بہنوں کا انجام دیکھ کر اس کا سر جھک گیا۔ سسرال میں طعنے بھی ملے لیکن اس کا شوہر اس سے محبت کرتا تھا۔ ہر طرح خیال رکھتا تھا۔ اس نے منع کر دیا تھا کہ عطوا پنی ضرورت کی چیزوں کے لیے ماں باپ کو زیر بار نہ کرے۔ وہ

جس طرح بھی ہو اس کے شوق پورے کرے گا۔

اس دن سے عطو کو بھی شوہر کی قدر ہوگئی اور اس نے شوق پر کنٹرول کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ضروریات محدود کرلیں البتہ ساس کے ساتھ تعلقات ''مجروح'' ہی تھے۔

مامی نے فریال کا دل بہلانے کی خاطر اس سے کہہ دیا تھا کہ جب چاہے خالہ کے ہاں ہو آئے۔ خالہ کے گھر بھی خوشی یا دل بہلنے کے سامان نہ تھے۔ خالہ کی شادی شدہ دونوں بیٹیوں کے ساتھ بھی ابھی تک وہی مسائل تھے۔ جب نہ تب دونوں شکایتوں کے انبار لیے میکے آ دھمکتیں پھر خالہ خالو انہیں اپنے ساتھ لے جا کر دامادوں کو بھی مفاہمت' مل جل کر' محبت سے رہنے کے لیکچر دے کر اور فوائد گنوا کر۔ بیٹیوں کو ان کے سسرال چھوڑ آتے۔ داماد بھی سسر کا لحاظ کر لیتے تھے۔ ساس سے انہیں بھی شکوے تھے کہ وہ ہمیشہ بیٹیوں کی سائیڈ لیتی تھیں۔ دامادوں کی غلطیاں نظر آتی تھیں' بیٹیوں کی نہیں۔ جیسے وہ تو فرشتہ ہیں۔

چھوٹی دونوں روزی اور پنکی ایئر ہوسٹس تھیں۔ ان کی زندگی سب سے زیادہ آزاد' بے پروا اور بلند تھی۔ آنے کا وقت' نہ جانے کا ٹائم۔ ڈیوٹی کے علاوہ بھی جب جہاں چاہتیں چل پڑتیں۔ اپنی آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ جتنا کماتیں' خود پر ہی خرچ کرتیں۔ وعوتیں' پارٹیاں' لباس' جیولری' میک اپ کا سامان' سب اپنی کمائی سے کرتیں۔ ان کے پاس ہر چیز' امپورٹڈ تھی۔ خالہ ان کے غصے سے ڈرتی تھیں۔ ان کے بیٹے بھی عجیب مزاج کے تھے۔ انکسی میں رہتے تھے۔ کسی سے تعلق نہ تھا۔ کبھی کبھار خالہ کے پاس آ جاتے ورنہ لان میں ٹہلا کرتے۔ ملکہ آپا' ذکیہ آپا جب بھی آتیں اور اکثر آتی ہی رہتی تھیں انہیں مشورہ دیتیں۔ گھر بسالو۔ جواب بھی ہر بار ایک ہی ہوتا۔ ''تم نے بسالیا؟'' وہ جز بز ہو کر رہ جاتیں۔

''بھئی ہماری تو سسرال ہی نکمی ہے۔ میاں بدتہذیب' ضروری نہیں کہ تمہاری بھی ایسی ہو۔''

''اور اگر ہوئی؟''

اس دن فریال خالہ کے گھر کافی دن بعد آئی۔ اتفاق سے پنکی بھی گھر پر تھی۔ اس لیے کچھ دیر بیٹھنے کو دل بھی چاہا۔ فریال ٹہلتی ہوئی باہر آئی' برآمدے سے اس نے دیکھا۔ ذکیہ آپا' سجاد بھائی سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ رک گئی۔ دونوں کی پشت تھی برآمدے کی طرف اس لیے وہ فریال کو نہیں دیکھ سکے۔ سجاد بھائی ذکیہ آپا کی بات پر کہہ رہے تھے۔

''آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے لڑکی سامنے ہو۔''

''ہے تو سامنے۔ تم آنکھیں کھولو گے تو نظر آئے گی۔''

''آنکھیں کھولنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ والدہ کے خیالات معلوم کریں۔ جس لڑکی کو منتخب کرتا ہوں' سو عیب نکال کر ریجیکٹ کر دیتی ہیں اور زمانہ خواہ کتنا ایڈوانس ہو جائے' لڑکی کے

والدین کا ایک ہی مطالبہ ہوگا۔ لڑکے کے ماں باپ خود رشتہ لے کر حاضر ہوں ورنہ میں اب تک چار شادیاں کر چکا ہوتا اور اپنے ماں باپ کو راضی کرنا میرے اختیار میں نہیں۔''

''جہاں میں کہہ رہی ہوں' وہاں راضی ہو جائیں گے۔''

''اوہ! کون ہے وہ؟ معلوم ہے۔ ہماری والدہ کو لڑکی میں حسن' اس کے باپ کے پاس دولت کی تمنا ہے۔ ان کے خیال میں تو ایک بہو آنی ہے۔ اس میں متعدد خوبیاں ہونی چاہئیں۔''

''ایسا ہی ہے۔ حسن' پیسہ' تعلیم' خاندان۔''

''ارے' وہ کہاں ہے جو ابھی تک مجھے نظر نہیں آئی۔''

''سامنے۔ آسمان کو تکنا چھوڑ' زمین پر دیکھو۔ اپنی فریال میں ہر خوبی ہے۔ حسن' تعلیم' خاندان' خالو کی دولت' خالہ کا سارا بیش قیمت زیور اور ساز و سامان پھر یہ کہ خاموش سی معصوم بے ضرر لڑکی' یتیم لاوارث۔ چاہو تو گلا دبا دو' آہ تک نہ کرے۔''

''فر.... فریال؟'' سجاد بھائی حیرت کی زیادتی سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دھم سے کرسی پر بیٹھے۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا۔ وہ تو ماموں نے کب سے شہریار کے لیے....''

''پرانی بات ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ شہریار آج کل زارا کے پیروں کی دھول بنا ہوا ہے۔ کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہے۔ خود بھی کروڑ پتی ہے۔ ارے وہی ماڈل گرل زارا۔ ماڈلنگ وہ پیرس اور سوئٹزرلینڈ کی کمپنیوں کے لیے کرتی ہے۔ بہت ہی تیز چیز ہے۔ شہریار کو اپنی شہرت اور دولت کو سہارا دینے کے لیے ایسی ہی کروڑ پتی بیوی کی تلاش تھی۔ وہ اسے مل گئی' سمجھے تم۔ فریال کی تو سمجھو چھٹی۔ مامی بھی زارا پر عاشق ہو چکی ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مامی کے لبوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس سونے کی چڑیا کو کوئی اور لے اڑے' سنجیدہ ہو جاؤ فریال کے لیے۔''

''ہوں! اب تو ہونا پڑے گا۔'' سجاد بھائی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے لگے۔

اور فریال اپنی جگہ جم کر رہ گئی پھر پیر گھسیٹتی ہوئی پنکی کے کمرے میں آئی اور صوفے پر گر گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیسی باتیں ہیں یہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سر چکرانے لگا۔ پنکی باتھ روم سے باہر نکلی۔ اپنی دھن میں آئینے کے سامنے بال بناتے ہوئے کہنے لگی۔

''فریال! میں تمہیں رازدار بنانا چاہتی ہوں۔ تم پر بھروسا کر سکتی ہوں؟''

فریال کی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے' کالے پیلے۔ سر میں دھمک ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پنکی سے اشارے سے پانی مانگا۔ پانی کا گلاس لا کر فریال کو دیتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے' طبیعت ٹھیک ہے؟ تم نے زیادہ ٹینشن لے لی ہے' فری' خود کو سنبھالو۔ بہت کمزور ہو گئی ہو۔'' پھر اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر فریال کے آگے بڑھائی۔ ''کیسا ہے؟''

''اچھا ہے' کون ہے؟'' فریال خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی تھی- تصویر ایک خوبصورت نوجوان کی تھی-

''پائلٹ آفیسر- میں اس سے شادی کی کوشش کر رہی ہوں- بس ایک گڑبڑ ہے- پہلے سے شادی شدہ ہے-''

''تم کوشش کر رہی ہو؟ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے- پنکی! تم اپنے لیے خطرہ مول لے رہی ہو-''

''ہاں' خطرہ ہے-'' پنکی لمبا سانس لے کر کھڑی ہوگئی- ''اور اگر فوراً شادی نہ ہوئی تو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا میرے لیے مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا کر سکتا ہے-'' پنکی کا لہجہ' آواز' جملہ فریال کو سب کچھ عجیب اور پراسرار لگا-

''تو پھر اب کیا کرنا ہے؟'' فریال کی سمجھ میں نہیں آیا' کیا کہے-

''کرنا کیا ہے؟ وہ شام کو یہاں آئے گا' ممی پاپا سے بات کرے گا- کل پرسوں تک ہم ایک....''

''اور رخصت کرا کے کہاں لے جائے گا؟''

''کہیں نہیں- میں کہیں بھی نہیں جاؤں گی اور میں گھر پر رہتی ہی کب ہوں- زیادہ تر تو ہم بیرون ملک ہی رہتے ہیں- رخصتی کی خاص ضرورت بھی نہیں- دنیا دکھاوے کو ہم ہوٹل میں وقت گزار لیں گے- دراصل مجھے تو بس نکاح کرنا ہے- بعد میں وہ چاہے تو طلاق دے سکتا ہے- مگر ابھی کسی طرح نکاح-''

''ہیں؟ ارے طلاق کیوں؟'' فریال اچھل پڑی-

''بھئی اس کی سسرال بڑی بارسوخ ہے- وہ بھلا برداشت کریں گے ایئر ہوسٹس کو-'' فریال پنکی کو دیکھنے لگی- جس کے چہرے پر فکر آمیز اداسی تھی-

''تو تمہیں تو شادی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا-''

''ہوگا میری جان فائدہ کے لیے ہی تو پاپڑ بیل رہی ہوں-'' پنکی نے پھر لمبا سانس بھرا- ''مامی فائدہ تو نہیں لیکن ایک نام' ایک مضبوطی مجھے ضرور چاہیے-'' پنکی پھر باتھ روم میں گھس گئی-

فریال کو ذکیہ آپا کی آواز اور پنکی کا مسئلہ فکرمند کر رہا تھا- پنکی خوب تیار ہو کر نکلی- خوب چمک رہی تھی- زبردست میک اپ اور تیز رنگ کا لباس اس پر نچ رہا تھا- یوں جیسے آج ہی تقریب نکاح ہو-

فریال آنکھیں بند کیے لیٹی رہی- شام ہوگئی' مغرب کا وقت گزر رہا تھا فریال کو اچانک خیال آیا- پھپھو کے گھر میں مغرب کی نماز کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا- وجہ یہ کہ شام کے وقت پھوپھا جان اور سرفراز گھر پر ہوتے تھے- پھوپھا جان مسجد چلے جاتے' پھپھو سرفراز کو یاد دلاتیں-

''سرفراز بیٹا! نماز کی تیاری کرلو اذان کا وقت ہے- وضو کرلو- مسجد نہ سہی' گھر میں سہی-''

''اماں! اذان ہونے دیں' جلدی کیا ہے- کرلوں گا وضو-'' سرفراز اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیتا-

پھپھو ثنا کو یاد دہانی کراتیں- کوئی حدیث سناتیں- جس میں نماز وقت پر ادا کرنے اور وضو کی تعریف ہوتی پھر اذان کے ساتھ ہی گھر میں سناٹا چھا جاتا- سب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے- خود فریال نے حاضری ثناء کے ساتھ کئی بار نماز پڑھی اور یہاں ٹی وی پر کوئی پروگرام چل رہا تھا- ذکیہ آپا بلند آواز میں سسرال والوں کی برائیاں گنوا رہی تھیں- ارے خالہ تک نماز کی عادی نہیں تھیں- وہ بھی ذکیہ آپا کے ساتھ اس غیبت میں شریک تھیں جس کی تحی سے شریعت میں ممانعت ہے-

فریال پنکی کے باتھ روم میں وضو کے لیے گئی تو پنکی بے قراری سے فون ڈائل کر رہی تھی- وضو کر آئی- تب بھی پنکی کو فون سے الجھا پایا- جاء نماز کے لیے پنکی کو شرمسار کرنے کے بجائے اس نے ایک چادر الماری سے نکال لی اور نیت باندھنے سے پہلے' سامنے لگی تصویریں الٹ کر رکھ دیں- آج کس قدر خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہی تھی وہ دل لگا کر- شکر ہے کہ اسے نماز یاد رہی- دعا مانگ کر اٹھی تو پنکی نے تعجب سے کہا-

''ارے تم نماز پڑھتی ہو؟ پہلے کبھی دیکھا نہیں-''

''ہاں اب پڑھنے لگی ہوں بابا کے بعد- پھپھو بہت تاکید کر گئی تھیں-'' دل بھر آیا-

''تم نے دعا کون سی مانگی-''

''بابا کی بخشش کی اور اپنے لیے سکون کی- پھپھو کہتی ہیں' نماز کے بعد کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے-''

''ہیں مگر نماز مجھے نہیں آتی- کیا نماز کے وقت دعا مانگنے سے....قبول ہوگی-''

پنکی کو نماز نہیں آتی' کیوں؟ اور سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں- خود فریال کو بابا نے قاری صاحب کو بلا کر کیا تھا نماز اور کلمے یاد کرانے کے لیے- امی تو منع کرتی تھیں کہ جب بچی کے کھیل کا ٹائم ہوتا ہے تب ہی قاری آتے ہیں مگر بابا اس معاملے میں امی کی بات نہ مانے- قاری صاحب آتے رہے نماز یاد کراتے رہے' قرآن پاک پڑھاتے رہے- گو کہ خود اس نے نماز کبھی نہیں پڑھی' پھپھو کے گھر کے سوا مگر اسے آتی تو تھی-

''پلیز فری! تم میرے لیے دعا کرو-'' پنکی کی آواز میں دکھ تھا یا پچھتاوا-

پائلٹ وعدہ کر کے خدا جانے کہاں گم ہوگیا- پنکی فون پر فون گھما رہی تھی- وہ کہیں نہ تھا- ممکن ہے اس کے دل میں چور ہو-

فریال پنکی کو فون پر مصروف چھوڑ کر ماموں کے گھر آ گئی-

مامی اور شہریار کہیں گئے ہوئے تھے- فریال کے ذہن میں ذکیہ آپا کی آواز گونج رہی تھی مگر وہ کسی سے کیسے پوچھتے- مامی اور شہریار دیر سے رات میں آئے- ایمی، شیما بھی کہیں مدعو تھیں- البتہ بڑی بہنیں (مطلقہ خواتین) ٹی وی پر وہی سی آر سے لطف لے رہی تھیں-

فریال نے نماز پڑھ کر پنکی کے لیے دعا کی اور اس کی فکر میں مبتلا ہوگئی- رات نیند بھی صحیح نہیں آئی- کہیں پائلٹ نے پنکی کو دھوکا نہ دیا ہو اور وہ جذباتی لڑکی مایوسی میں غلط قدم نہ اٹھالے- صبح ہوئی مگر ماموں کے گھر میں صبح گیارہ بجے کے بعد ہوتی تھی بلکہ بارہ بجے- رات دیر تک جاگنے والے صبح دیر تک سوتے بھی تھے- کوئی کام بھی نہیں تھا' جاگ کر کرتے کیا-

فریال پریشانی میں ادھر ادھر پھرتی رہی- خالہ کے گھر فون کرنے کی ہمت نہیں تھی- مجھے پنکی کو سمجھانا چاہیے تھا مگر دیر ہوچکی- وہ خود کو سرزنش کرنے لگی- شام کو فون کی بیل ہوئی- آس پاس کوئی نہ تھا- ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا- ''اوہ' اطمینان کا سانس لیا-

''پنکی! میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں تم کوئی حرکت نہ کر گزرو- سچ میں نے تمہارے لیے دعا کی تھی عشاء کی نماز کے بعد- مجھے نیند بھی نہیں آئی- سوچتی رہی کہ تم....''

''ارے فری! میں خودکشی کرنے والی ہستی نہیں ہوں- ویسے سچی بات ہے- رات ایک بار جی میں آیا کہ روڈ پر جا کر کھڑی ہوجاؤں- کسی ٹرک کے نیچے آ کر جان دے دوں- شاید یہ وہی وقت تھا جب تم نماز کے بعد دعا کر رہی تھیں پھر میں نے سوچا میں اکیلی کیوں مروں' جس نے مجھے اس راستے پر لا کھڑا کیا ہے اسے ساتھ لے کر مروں گی- بس یہ سوچتے ہی آرام سے سوگئی- صبح اٹھ کر اس کے گھر پہنچی- اکیلا تھا- معذرت کرنے لگا- دراصل رات اس کی ساس کا انتقال ہوگیا- شام سے ہاسپٹل میں ڈیوٹی دے رہا تھا بیوی کے ساتھ- کیسے آتا- بہرحال آج پاپا ممی سے ملنے آئے گا اور کل نکاح ہے- میں نے اپنے سامنے پاپا سے اس کی بات کروائی اور تاریخ بھی اسی وقت طے کرلی- تم آؤ گی-''

''میں....میں....''

''اچھا خیر' ماموں' مامی آئیں گے- ممی نے انہیں بلایا ہے- رشتے داروں میں صرف بزرگوں کو بلایا ہے- اتنے کم وقت میں بڑی تقریب تو ہو نہیں سکتی-''

مامی نکاح میں نہیں گئیں' ماموں چلے گئے- وہ ماموں تھے انہیں تو جانا ہی تھا- مامی نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا- ایک تو اچانک خبر سنا کر دھما کا کر دیا پھر ان کی اولاد کو نہیں بلایا- رات کو ماموں آئے تو بہت خوش تھے- دولہا کے حسن جہاں زیب' اس کی معقولیت' شائستگی اور قابلیت کے قصیدے زبان پر تھے- (انہیں علم نہ تھا کہ وہ شادی شدہ بھی ہے)

مامی پوچھتی رہیں- ''اس قدر ایمرجنسی میں نکاح کی کوئی وجہ تو ہوگی-'' ماموں ٹال گئے-

دراصل وہ بال کی کھال نکالنے کے قائل نہ تھے- انہوں نے پوچھا ہی نہیں تو کیا بتاتے- مامی کا غصہ دم بہ دم بڑھ رہا تھا-

''ارے بھئی' ان کی لڑکیوں کی قسمت تو عرش معلیٰ پر لکھی گئی تھی- دیکھ لو' ہر داماد ایک سے بڑھ کر ایک ہے- اعلیٰ کوالٹی ہے- ایک ہم ہیں لاکھوں خرچہ کر رہے ہیں بیٹیوں پر مگر ان میں اتنے گٹس نہیں کہ کسی کو پھنسا سکیں- بدھو' احمق لڑکیاں- ہابا ہو ہو کروا لو اور ان کے جو دور جن بھر دوست آتے ہیں' وہ بھی بس کھانے پینے' آنکھیں سینکنے- ذلیل' مجال ہے کوئی شادی کے لیے آگے بڑھے-''

پنکی تو چند دن بعد ہی اپنے پائلٹ آفیسر دولہا کے ساتھ کینیڈا اڑ گئی- مامی کو ٹینشن کی مریض بنا گئی- غصہ انہیں میاں پر بھی تھا- ایک دن اسی زبان بلا کر بہن سے پوچھ نہ سکے کہ اچانک یہ رشتہ کہاں سے ٹپک پڑا- حالانکہ باقی سب سمجھ چکے تھے' رشتہ جہاز میں استوار ہوا-

☆☆

نہ جانے شہریار کہاں مصروف تھے کہ جانے کے باوجود فریال ان سے بات کرنے کو ترستی- کبھی سامنا ہوا بھی تو فریال کی بات قطع کر کے-

''بہت بزی ہوں' بہت بزی ہوں- سر کھجانے کا ٹائم نہیں-'' کہہ کر ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتے-

ادھر ماموں مامی سے الجھتے- کبھی شہریار پر برستے- ''وہ آفس میں ٹائم نہیں دیتا- وہ ہزاروں لاکھوں کہاں اڑا رہا ہے- کاروبار میں خسارہ ہو رہا ہے' اس کی وجہ شہریار کی بے نیازی اور لاپروائی ہے- جو کام اسے کرنے کو دیا جاتا ہے' خراب ہوجاتا ہے- آخر یہ کر کیا رہا ہے-''

ماموں کے سوالوں کے جواب مامی کے پاس تھے مگر وہ خاموش رہ کر جنگ جیتنا جانتی تھیں- ماموں چڑ چڑے ہوگئے تھے- انہیں اب اپنی مطلقہ بیٹیاں بھی بھاری لگ رہی تھیں-

اس دن مامی فریال سے بہت پیار سے بولیں- (اور یہ لہجہ کافی دن بعد سنا تھا اس نے)

''فری بیٹا! تمہارا اکاؤنٹ کس بینک میں ہے- کچھ معلوم ہے تمہارا بینک بیلنس کتنا ہے؟''

''میرا اکاؤنٹ' نہیں تو- مامی میرا تو کسی بینک میں اکاؤنٹ نہیں ہے-'' وہ حیران ہوگئی تھی-

''اچھا؟'' مامی اور بھی حیران ہوگئیں- ''چلو خیر- تمہارے بابا کا اکاؤنٹ تو ہے نا؟ چیک بک نکالو-'' چیک بک نکالی' بینک میں پتا کیا- معلوم ہوا کہ چند ہزار روپے ہیں- مامی کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا-

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی دوسرے بینک میں ہوگا- تلاش کرو چیک بک-''

مگر کہیں کوئی چیک بک نہ تھی-

مامی تلملا رہی تھیں- ''ارے اتنی اعلیٰ جاب' اونچی پوزیشن' اتنے ٹھاٹھ باٹ- کیا سب دکھاوے کا

تھا۔''

فریال نادم ہوگئی۔ اسے واقعی اندازہ نہ تھا کہ بابا اتنے فقو فقیر ہو سکتے ہیں۔ دراصل وہ درویش صفت انسان تھے۔ کبھی جمع کرنے کا سوچا ہی نہیں۔

امی نے خود کو ٹھوکا بجا کی بنیاد رکھی تھی' میکے کے مقابلے کے لیے۔ بابا خرچ کم کرنے کا کہتے رہے مگر ہوا کچھ نہیں۔ یوں بھی وہ بے حد فراخ دل تھے۔ کتنوں کو قرض دیتے اور بھول جاتے۔ کئی طالب علموں کو باقاعدہ وظیفہ دے رہے تھے۔

''دراصل تمہارے ماموں کو نقصان ہو رہا ہے برابر۔ اچھا تمہارا لاکر تو ہے نا۔ اس میں جیولری تو ہے۔ چابی لاؤ' دیکھیں کیا کچھ ہے اس میں۔ اگر تو تمہارے ماموں کو ضرورت ہو تو..... رقم مل جائے۔ لاکر میں تو ہوگی۔''

''رقم تو نہیں ہے مامی! بس امی کے زیورات ہیں۔'' وہ ہچکچا کر بولی۔

''زیورات بھی کافی زیادہ ہیں۔ رقم مل جائے گی فروخت کر کے۔ تم فکر نہ کرو۔ آخر اس گھر پر' کاروبار پر تمہارا بھی حق ہے۔ تم ہماری بہو ہوگی۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔''

مامی کے الفاظ سوکھے دھانوں پر پانی پڑا' گراں مایہ جیولری' قیمتی نگینے' اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر مامی کو تاؤ چڑھا۔

''کھا نہیں جائیں گے ہم' پائی پائی واپس کر دیں گے۔''

اس نے چپکے سے لاکر کی چابی دے دی۔ مامی اسی وقت اسے لے کر بینک گئیں۔ وہ ایک چھلا تک نہ چھپا سکی۔ ڈبہ مامی کے ہاتھ میں تھا اور چند دن بعد ہی اتفاق سے اس نے ماموں کی چیخ و پکار پر توجہ دی۔ وہ شہریار کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔ شہری منمنا رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ دو قدم آگے بڑھ کر کان لگائے۔

''کیا کہا؟ سارا زیور بیچ ڈالا فریال کا؟ تمہیں کس نے یہ حق دیا تھا؟ بولو۔ میں کسی طرح۔ کہیں سے بھی انتظام کرتا' تم سے کس نے کہا تھا کہ فریال کا زیور لے کر نقصان پورا کرو۔ کیا تمہاری ماں کا' بہنوں کا سارا زیور اور روپیہ ختم ہو گیا تھا؟ مجھ سے پوچھے بغیر تم نے..... تم نے.....''

ماموں وفورِ غضب میں زیادہ بول نہ سکے۔

پھر شہریار کی آواز آئی۔ ''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے اس پر میرا کوئی حق نہ تھا۔ پاپا! وہ میری پھپھو کا تھا۔ میرے دادا کی کمائی سے بنا تھا اور آپ کو پتا ہے ماما کب اپنی چیز دیتی ہیں۔''

''او بے عقل انسان! سارا زیور صرف تمہارے دادا کی کمائی کا نہ تھا' بہت کم تھا بلکہ فریال کے باپ دادا کی کمائی کا تھا۔ ہمارا اس پر حق نہیں۔''

''کیوں حق نہیں۔'' شہریار اطمینان سے بولا۔ ''آپ کی تجویز کے مطابق آخر اس سارے زیور

کو میرے قبضے میں آنا ہی تھا شادی کے بعد۔ میں نے شادی سے پہلے وصول کر لیا۔ ضرورت تھی پاپا' کیا ہو گیا۔''

شام کو ماموں فریال کے پاس آئے۔ اس سے پوچھنے لگے بلکہ ڈانٹنے لگے کہ اس نے شہریار کو اپنے سارے زیور کیوں دے ڈالے۔ مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔

مامی سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

''ماموں! زیورات آپ کے کام آ گئے' اس سے بہتر ان کا کیا مصرف تھا۔ میں تو بہت کم پہنتی تھی۔''

مامی کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔

ماموں مزید ناراض ہوئے۔ ''حماقت کی باتیں مت کرو' میں مرتو نہیں گیا تھا کہ اپنی ضرورت کے لیے تم سے لیتا۔ ارے تمہاری مامی کے پاس سیروں کے حساب سے سونا چاندی ہے' ہیرے جواہرات ہیں۔ مجھے ضرورت ہوتی تو وہ لیتا' جو میری اپنی کمائی کے تھے۔ میری بیٹیوں کے پاس بھی بے حساب زیورات ہیں۔ ارے اس احمق کو دینے سے پہلے مجھ سے پوچھا ہوتا۔ کیا کیا اس نے؟ ارادیا پیسہ اپنے فضول شوق میں۔ اف و۔'' وہ ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے چلے گئے۔ فریال کا دل بھر آیا۔ آنسو بہنے لگے۔ مامی نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بہت زیادہ پریشان ہیں نا' اس لیے غصہ جلدی آنے لگا ہے۔ تم پریشان نہ ہو' تمہارے زیور کی رقم سے ٹیکس ادا کیا ہے شہریار نے۔ میرا زیور تو پہلے..... اچھا تم ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔ انہیں تسلی دے آؤں۔''

اور وہ ماموں کے پیچھے جانے کے بجائے شہریار کے کمرے میں گھس گئیں۔ اس کے چند دن بعد مامی نے خبر دی۔ ''گھر کا سارا سامان ہم نے نیلام کرا دیا ہے تمہارا۔ ارے پرانا تھا۔ اچھے دام کون دیتا۔ اونے پونے بکا۔ فضول میں کمرے کا کرایہ جا رہا تھا ہر ماہ۔''

اونے پونے بکا یا کسی قیمت پر۔ مامی نے اسے تو ایک پیسہ نہ دیا بلکہ فریال کو مزید کھی کر دیا۔ اگر وہ فریال سے ذکر کر دیتیں تو وہ سامان سے اپنی پسند اور ضرورت کی چیزیں تو نکال لاتی۔ کم از کم بچپن کے کھلونے' گڑیا جن سے ابھی تک اس کا کمرہ سجا رہتا تھا۔

خالہ نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ اسے خوب ڈانٹا۔ زیورات' سامان سب گیا۔ وہ فون پر مامی سے لڑیں۔ دونوں نند بھاوج میں ٹھن گئی۔ فریال کو شاید اب بھی عقل نہ آتی لیکن اتفاق سے اس نے مامی اور شہریار کی باتیں سن لیں۔ شہری مامی سے رقم مانگ رہا تھا۔ وہ انکار کر رہی تھیں۔ دونوں بحث کر رہے تھے پھر مامی نے کہا۔

''کہاں سے لاؤں میں' تم فریال سے کیوں نہیں مانگتے۔ چار ہزار تو دے سکتی ہے۔ کہیں نہ کہیں

تو کچھ رقم اس کے پاس ہوگی- تمہیں بھی تو روزانہ ضرورت پڑ جاتی ہے- کہاں سے لاؤں اب کیا کرنا ہے آخر- کچھ کم میں کام چلا لو-''

''کمال کرتی ہیں ماما آپ-'' وہ بگڑا-''زارا کو کیا دو چار سو کا گفٹ دوں- چار ہزار کا واز پسند کیا ہے اس نے- خود پسند کرگئی اپنا گفٹ بتائیں-''

''کیا بتاؤں' ہر روز گفٹ پسند کر کے لے لیتی ہے- یہ بتاؤ واپس بھی ہوگی رقم-''

''ماما! کچھ کھو کر پایا جاتا ہے- صبر کریں' وصولی کے دن قریب ہیں- احمق نہیں ہوں میں-''

''تو ٹھیک ہے مگر میرے پاس چار ہزار نہیں- تم فریال سے مانگو اگر پیسے نہیں ہوں گے تو جو انگوٹھی بالیاں اس نے پہنی ہوئی ہیں' وہ چار ہزار کی تو ہوں گی-''

زارا' یہ نام اس نے ذکیہ آپا کے لبوں سے سنا تھا- تو اس کا وجود ہے' وہ گفٹ وصول کرتی ہے- شہریار اس سے ملتا ہے تو پھر میرا مستقبل کیا ہے؟

دل گھبرایا تو خالہ کے گھر چلی آئی- ابھی چھوٹے موٹے زیور جو اس کے تصرف میں تھے- جو لا کر میں نہیں تھے خالہ کو دے کر اس نے کہا-

''مامی کے گھر روز کوئی نہ کوئی کر آجاتا ہے نیا- آپ اپنے پاس رکھ لیں' محفوظ تو ہوں گے-''

''ٹھیک ہے اگر کچھ رقم ہو تو وہ بھی میرے پاس رکھوا دو- یہ نہ ہو وہ بھی زیورات کی طرح گنوا دو-''

''رقم' خالہ میرے پاس رقم کہاں-'' اس نے سرد آہ بھری- ''ویسے انہیں ضرورت تو ہے-''

''ضرورت کسے نہیں ہوتی- اس کا مطلب یہ تو نہیں بے بس سمجھ کر لوٹ لیا جائے-'' خالہ سخت خفا تھیں-

رات وہ وہیں رہ گئی- ماموں' خالہ کے گھر نزدیک نزدیک تھے- وہ اکیلی بھی چلی جاتی-

صبح وہ ماموں کے گھر آ رہی تھی تو ایک کار اس کے نزدیک آ کر رکی- وہ ڈر گئی لیکن کار میں کسی کے ہنسنے کی آواز آئی تو کچھ دل کو سکون ملا- کار انکل شہباز کی تھی- ان کی بیگم اور بیٹی تھیں-

''کہاں جا رہی ہو- میں تمہیں ڈراپ کر دوں؟'' آنٹی نے کہا-

''شکریہ آنٹی! بس یہ سامنے ہی ماموں کے گھر کی گلی ہے- آپ کہاں جا رہی ہیں-''

''نازی کو اس کی سہیلی کے پاس چھوڑنے جا رہی ہوں- ہاں یاد آیا' تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس-'' وہ پرس ٹٹولتے ہوئے بولیں-

''میری امانت؟ آپ کے پاس؟'' وہ حیرت زدہ ہوگئی-

''ہاں بھئی' عرصے سے میرے پاس ہے- میں تمہیں دینا بھول جاتی تھی اور تمہارے بابا نے منع بھی کیا تھا کہ ابھی تمہیں نہ دوں مگر میرا خیال ہے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ.... لو یہ رہا-''

وہ ایک چیک بک تھی- اس کے اور بابا کے جوائنٹ اکاؤنٹ کی اور یہ.... اب آنٹی شہباز دے

رہی تھیں- اس چیک بک کے لحاظ سے اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ تھا- آنٹی اسے اس وقت اپنے ساتھ بینک لے گئیں- وہاں اس نے دستخط کیے نہ جانے کن کن کاغذوں پر- آنٹی اسے سمجھتی گئیں' وہ کرتی گئی-

''آنٹی! میں کچھ رقم نکال سکتی ہوں؟ ابھی-''

''ہاں بھئی' چلو میں تمہیں چیک لکھنا سکھاتی ہوں-'' ہنستی ہوئی آنٹی کتنی اچھی لگ رہی تھیں- ویسے بھی وہ اسے بہت اچھی لگتی تھیں مگر اس وقت تو فرشتہ لگ رہی تھیں-

اس نے پانچ ہزار روپے نکالے اور چیک بک واپس انہیں دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے- آنٹی نے اسے غور سے دیکھا- کچھ سوچا پھر گردن ہلا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا-

''بیٹا! گھبراؤ نہیں- جب ضرورت ہو مجھے کہیں سے بھی فون کر لینا مگر دیکھو' میں فضول خرچی کے خلاف ہوں- باقاعدہ جرح کروں گی-''

''میں بھی اسی لیے دے رہی ہوں آنٹی-'' اس نے زیر لب کہا- شکر ہے' بھرم رہ گیا-

گھر آ کر بار بار دل چاہا- وہ چار ہزار شہریار کو دے دے- اللہ کے کرم سے اس کو ایسا موقع مل گیا تھا' شہریار کو زیر بار احسان کرنے کا- شاید وہ دے بھی دیتی اگر وہ مل جاتا مگر مامی نے اس سے اس کے بائی' بندوں اور لاکٹ کے بارے میں پوچھا- اس نے کہا کہ خالہ کے ہاں رات کو رہی تھی' اتار کر سنگھی کے نیچے رکھ دیے تھے- لانا بھول گئی- پرس بھی وہیں خالہ کے پاس رکھوایا تھا- اس میں بندے لاکٹ تھے- مامی کے چہرے پر سرخی آ گئی' شاید غصہ مگر کہا تو یہ-

''چلو پھر گیا وہ سب بھی-'' وہ حیران ہو کر مامی کو دیکھنے لگی-

''ارے وہ اب دیں گی؟ میں نے جب سے تمہارا لاکر کھلوایا ہے' وہ تلملا رہی ہیں-''

مامی اچانک اس سے برگشتہ ہوگئیں- اب وہ اسے دیکھ کر مسکراتی نہیں تھیں- ان کے لبوں پر اس کا نام مٹھاس نہیں' تلخی کے ساتھ ادا ہوتا- ایسا کیا جرم کیا ہے میں نے- وہ سوچتی-

☆☆

اور آخر شہریار کو اس سے بات کرنے کی فرصت مل ہی گئی- وہ اسے قریب آتا دیکھ کر خوش ہوگئی- شہریار کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا-

''فری! سوری میں بہت بزی رہا- تم سے تو بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی مگر میرا اس میں زیادہ قصور نہیں ہے- تم گھر پر ہوتی ہی نہیں ہو یا کم از کم میرے سامنے نہیں آتیں- اب میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتا اس لیے یہ معمولی سا تحفہ تمہارے لیے ہے-''

''تحفہ.... وہ کس لیے؟'' گود میں لڈو پھوٹ رہے تھے مگر اوپر سے سختی طاری کر لی تھی-

''بھئی تحفہ دینے کے لیے کیا ضروری ہے کہ کیوں' کس لیے کا سوال کیا جائے-''

''غیر ضروری بھی نہیں ہے۔ خیر فرمائیے کیسے زحمت کی آپ نے مجھ سے بات کرنے کے لیے۔''

''طنز نہ کرو۔ پلیز فریا! میں بہت پریشان ہوں تمہیں معلوم تو ہے پاپا کا.....''

''معلوم ہے مگر میں کیا کرسکتی ہوں۔''

''میں' پاپا سے نہیں لے سکتا' اس لیے تم سے تو میں اپنا دکھ سکھ شیئر کرسکتا ہوں نا فریا۔''

شہریار کا لہجہ شہد میں غرق ہو چکا تھا۔ ''تم تو میری ہر عادت سے واقف ہو۔ میں تم سے ہر بات کرسکتا ہوں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ شہریار نے نظر چرالی۔ آنکھیں الفاظ کا ساتھ نہ دیں تو بندے کا جھوٹ ثابت ہو جاتا ہے۔

''وہ بات یہ ہے۔ ایک دوست کی برتھ ڈے پر گفٹ دینا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے میں معمولی چیز تو کسی کو نہیں دے سکتا اور میں بہت جلد واپس کردوں گا۔ قرض دے دو۔ زیادہ بڑی رقم نہیں بس چار ہزار کا سوال ہے۔''

'چار ہزار.....' وہ سن کر حیران ہوئی۔ ''میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔''

''اوہ! تو کوئی جیولری چھوٹی موٹی۔ دیکھو نا' تم سے ہی لے سکتا ہوں۔''

''جیولری دیں گے؟ کوئی لڑکی ہے؟''

''نہیں' جیولری کے بدلے کوئی گفٹ لے لوں گا۔ تمہارے پاس اتنا تو ہے۔''

''میرے پاس جو کچھ تھا' وہ مامی لے چکی ہیں۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''وہ کچھ چھوٹے چھوٹے بندے۔ آ..... آ گیا کہتے ہیں۔ شاید ڈائمنڈ کے تھے۔''

''اوہ..... اس دن خالہ کے ہاں گئی تو وہیں اتار دیے۔ خالہ نے اٹھا کر رکھ لیے۔ اب اگر میں نے ان سے مانگے تو وہ.....''

شہریار کے چہرے کی مایوسی دیکھی نہیں جارہی تھی۔ ایک بار تو دل میں ہوک سی اٹھی۔ پانچ ہزار لاکر اس کے ہاتھ پر رکھنے کو بے چین ہوگئی۔ ابھی ایسا وقت بھی آئے گا جب شہریار اس سے بھیک مانگے گا' یہ تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ یہ چھوٹی سی رقم' ہاں شہریار کے لیے تو یہ معمولی ہی تھی۔ جو دس دس ہزار دوستوں کے ساتھ ہوٹلنگ میں اڑا دیتا تھا۔

وہ دل کو رضامند کرنے لگی۔ اسے زیر بار کرنے کا موقع پھر نہیں ملے گا پھر خالہ کی تنبیہ یاد آئی۔ انہوں نے اس کے زیورات اور سامان کی فروختگی کا سن کر دانت پیسے تھے اور کہا تھا۔

''یہ تجھے کوڑی کوڑی کا محتاج نہ بنادیں تو نام بدل دینا میرا۔''

شہریار کے جاتے ہی اس نے کمرہ بند کرلیا اور چپکے چپکے رونے لگی۔ تاسف نے گھیر لیا۔ کیا تھا اگر تو اسے پانچ ہزار دے دیتی۔ واپس کرنے کا وعدہ تو کر رہے تھے وہ۔ پھر اسے یاد آیا۔ ابھی پانچ

دن پہلے اس کی برتھ ڈے تھی۔ گھر کے کسی فرد کو تاریخ یاد نہ آئی' شہریار کو بھی نہیں۔ جو ہر سال اس کے لیے کارڈ جھیجتا' گفٹ بھی دیتا۔ ایمی' ثیما بھی مبارکباد دیتیں۔ مامی فون پر ہی دعا دیتیں۔ وہ کیوں کسی کو یاد دلاتی۔

دل ہی دل میں بجھ کر رہ گئی اور جب اس نے ڈبے سے اپنا گفٹ نکالا تو وہ شہریار کی غربت کی قائل ہوگئی۔ لینن کا معمولی سوٹ تھا۔ شاید چار سو کا ہوگا۔ ممکن ہے پانچ سو کا ہو۔ زارا کے لیے چار ہزار کا گفٹ' میرے لیے چار سو کا۔ واہ شہریار! اچھا انصاف ہے۔ اگر شہریار کچھ دیر اور اس کی خوشامد کرتا تو وہ اسے چالیس ہزار بھی دے ڈالتی۔ بالکل فقیر تو نہیں تھی۔ اسے ترس آنے لگا' تاسف کے ساتھ ساتھ۔ وہی شہریار جو کبھی فریال کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ آج زارا کو گفٹ دینے کے لیے پریشان ہے۔ دوسری بات' اسے فریال سے مانگتے ہوئے شرم بھی نہ آئی اور تیسری بات یہ کہ وہ پانچ ہزار دے کر شہریار کے لبوں کی مسکراہٹ دیکھ لیتی۔

مامی جو اس سے الگ تھلگ رہنے لگی تھیں پھر مہربان ہو جاتیں اور شہریار بھی۔ کتنی دیر پچھتاتی رہی۔ سوچا دے ہی دوں گی اگر دوبارہ مامی نے مانگا۔ مامی اس کے کمرے میں آئیں تو غصے سے برا حال' منہ سرخ' آنکھیں ابلی ہوئی۔ آتے ہی پھٹ پڑیں۔

''کیا ہم زبردستی تم سے تمہاری جیولری چھین لیتے؟ جو خالہ کے حوالے کر آئیں۔ میں سمجھی تھی لے آئی ہوگی۔''

''مامی! ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ سہم کر کھڑی ہوگئی۔

''ایسی نہیں تو کیسی بات ہے۔ شہری کو یہ جتانے کی کیا ضرورت تھی کہ تمہاری چیزیں خالہ نے رکھ لی ہیں اور تم مانگو گی تو وہ سمجھ جائیں گی کہ ہم چھین رہے ہیں۔''

''پلیز مامی! میں نے یہ نہیں کہا تھا۔'' وہ صفائی کے لیے کیا کہتی' شہری کو جھوٹا بناتی۔

''نہیں کہا تھا کی بچی۔'' مامی کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ فریال ڈر کر پیچھے ہٹی۔ وہ آگے بڑھیں۔ ''اگر ہم نے تمہارا زیور لیا ہے تو تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔ اتنے دن سے تمہیں رکھا ہوا ہے' کھا پی رہی ہو' عیش کر رہی ہو یہاں۔ چلی جاتیں پھپھی کے ساتھ۔ وہاں بھوکی مرتیں' ننگ مکان میں رہتیں' تب تمہیں ہماری قدر ہوتی۔''

اف مامی کے طعنے۔ کاش وہ پھپھو اور ان کے مکان کا طعنہ نہ دیتیں۔ وہ جو اس پر اپنی بے پایاں محبت کے موتی لٹاتی تھیں۔ چاہت کی دعوے دار لاکھوں کے زیورات اس کی ماں کی نشانی اپنی جھوٹے محبت کے بدلے میں ہضم کرلیے۔ حالانکہ اس نے تو کبھی شکوہ نہ کیا تھا۔ خالہ اگر مامی سے لڑیں تو اس کا کیا قصور۔

☆☆

مامی کی وہ ملمع شدہ مصنوعی محبت' رنگ آلود ہو کر بھیانک شکل اختیار کر چکی تھی- اب وہ ہر وقت اس کے نکتے پن اور عیاشی کا ذکر کرتیں- سب کے سامنے اسے ڈانٹتیں' اسے کام کے لیے پکارا جاتا' یہ کرو' وہ کرو-

''خالی بیٹھی رہتی ہو' ذرا ہل کر کچھ کر لیا کرو- یہ تمہارے باپ کی راج دھانی نہیں ہے' جہاں شہزادی بنی رہتی تھیں-''

بس اسی طرح کی طنز آمیز گفتگو مامی کی نوک زبان پر ہوتی- ایمی' شیما بیٹھی سنتی رہتیں' کسی کو ہمدردی نہ ہوتی- مامی کسی بڑے سرمایہ دار کی بیگم' ایڈوانس گھرانے کی تعلیم یافتہ خاتون کے زینے سے قلابازی کھا کر نیچے آ گریں- وہ نچلے درجے کی جاہل جھلائی ہوئی غربت سے تنگ عورت بن گئیں-

اب فریال کو چائے بھی بنانا پڑتی' برتن بھی دھونے ہوتے کہ مامی کا حکم تھا- کچن کے کتنے ہی کام اب اس کے سپرد کر دیے گئے- بوکھلاہٹ میں کبھی برتن گر جاتے' کبھی گلاس پھسل جاتے- مامی کی پھٹکار دو ہتڑوں تک آ پہنچی- فریال اپنی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگتی مگر مامی کے طعنے عروج پر ہوتے-

پھر اسے اپنے گھر کی کراکری یاد آتی- وہ قیمتی ڈنر سیٹ بیش قیمت ڈونگے' کرسٹل کا ڈنر سیٹ جو بابا نے اس کے جہیز کے لیے منگایا تھا-

پہلا زمانہ ہوتا تو وہ سارے برتن مامی کے سامنے لا رکھتی مگر نہ جانے وہ سب کہاں گئے- گھر میں عام استعمال کے برتن ہی بہت خوبصورت تھے- کسی چیز کا پتا نہ تھا- چاندی کا کٹلری سیٹ' ابھی اس کی پیکنگ کھلی بھی نہ تھی- کیا کیا یاد کرتی- سرد آہ بھر کر رہ جاتی-

پھر سنا کہ ماموں کا سرمایہ ڈوب گیا- خانساماں کے سوا سب نوکر ہٹا دیے گئے- ماموں کا آرڈر تھا کہ گھر میں جوان لڑکیاں ہیں- وہ گھر سنبھالیں- ماموں کے سامنے لڑکیاں متحرک ہوتیں- بعد میں سارا نزلہ فریال پر گرتا- برتن دھونا' کپڑوں کی دھلائی' گھر کی صفائی' جھاڑ پونچھ' خانساماں کے نخرے بڑھتے گئے' فریال کا کام- خالہ آتیں' اسے کام میں مصروف دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتیں- اپنے ساتھ لے جانا چاہتیں تو مامی کے ماتھے پر بل گہرے ہو جاتے- انہوں نے فریال سے کہہ دیا-

''جانا ہے تو جاؤ' پھر واپسی کا نہ سوچنا- ابھی تو تمہارے ماموں تمہیں بہو بنانے پر تیار ہیں- ایک بار چلی گئیں تو اس گھر سے ناتا ختم-''

وہ ڈر گئی- کہیں خالہ اپنے ساتھ لے جا کر اپنے دل پھینک بیٹے کا نصیب نہ بنا لیں- شہریار ابھی اس کے دل میں موجود تھا- اس نے کبھی شہریار کے سوا کسی کا تصور ہی نہیں کیا تھا- جب بھی گھر میں

ہوتا' فریال سے چائے مانگتا- کبھی مسکرا کر کوئی بات بھی کر لیتا اور فریال کے دل میں امید کے پھول کھلنے لگے- بے شک وہ پہلے کی طرح گرم جوشی کا اظہار نہیں کرتا تھا مگر مامی اور ایمی' شیما کی طرح بیزار نہ تھا ورنہ وہ خالہ کے گھر چلی جاتی- خالہ کے گھر برتن بھی دھونے ملتے' ڈانٹ نہ کی جاتی' بوجھ نہ سمجھا جاتا-

☆☆

کچن کے کام سے تھک کر وہ لاؤنج میں آ کر کرسی پر ٹکی تھی کہ ڈرائنگ روم سے مامی کی خوفناک چنگھاڑیں سن کر ٹھہر گئی- نہ جانے آج کس پر زلزلہ گر رہا تھا-

''بے وقت کی راگنی کا بڑا شوق ہے تمہیں- یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میری بیٹیاں تو گھر میں بیٹھی رہیں' تمہاری بھانجی کے سہرے کے پھول کھلیں-''

مامی ماموں سے مخاطب تھیں- پوری آواز میں چلا رہی تھیں- فریال کے سوا اور کیا موضوع تھا ان کے پاس-

''واہ میاں واہ! ایسا باپ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا-''

''وہ میری ذمہ داری ہے اور میں نے مرنے والے سے وعدہ کیا تھا- مرتی ہوئی بہن سے عہد کیا تھا- سمجھا کرو- اپنی بیٹیوں کا تو کوئی رشتہ آئے گا تب کریں گے نا-'' ماموں دبی دبی آواز میں بولے تھے-

''اور اس کا رشتہ آئے بغیر کیا ہوا سے کریں گے-''

''ہمارا بیٹا موجود ہے- رشتہ ہو چکا ہے اس کے ساتھ-''

''اس بھلاوے میں نہ رہنا- شہریار اس فقیرنی سے شادی پر راضی نہیں- کان کھول کر سن لو' اس کی شادی زارا سے ہوگی- بس-''

مامی نے فیصلہ سنا دیا پھر ماموں نے کچھ کہا مگر فریال سن نہ سکی- اس کے حواس قابو میں نہ تھے-

''کہیں بھی ہو' میری بلا سے- وہ میری ذمے داری نہیں ہے- اتنے دن برداشت کر لیا' یہ بھی احسان ہے میرا-''

مامی حلق پھاڑ رہی تھیں اور حرف حرف پگھلا ہوا سیسہ اس کے کان میں پکار رہی تھیں- فریال ان کے چنگھاڑوں سے طوفان کی غراہٹوں سے دور بھاگتی ہوئی چلی گئی- کہاں جائے- اچانک تھکن اس قدر غالب آئی کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھتی چلی گئی- کیا ہو رہا تھا' یہ کیوں ہو رہا تھا- مامی اتنا بدل کیوں گئیں- اس نے تو ان کی بدمزاجی کو پریشانی کی وجہ جان کر کبھی شکوہ نہ کیا- ان کی بدکلامی کو برداشت کرتی رہی- انہیں اونچے مقام پر جگہ دی ہوئی تھی پھر وہ نیچے کیوں آ گریں- اگر وہ بیٹے کو سمجھاتیں- وہ ساری زندگی ان کی خدمت کرتی' کھانے پکا کر کھلاتی' ان کے احسان تلے خود کو

مٹا کر عمر گزار دیتی مگر اب وہ کیا کرے- کیسی ذلت' بے بسی- پاپا آپ مجھے کہاں چھوڑ گئے- دل سے پکارا تھا مگر وہ آ نہ سکتے تھے- ان کی روح تڑپتی ہوگی- اس نے جلدی سے آنسو رگڑ ڈالے- وہ بابا کی روح کو اذیت نہیں دے گی- ہر حال میں شکر ادا کرے گی اور وہ صبر کے سبق کو پڑھنے لگی- بچپن میں بھی پڑھا تھا- صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے-

☆☆

''فریال! شام کو پارٹی ہے گھر میں- تم بھی نہا کر فریش ہو جاؤ- پاپا کے دوست آ رہے ہیں نا- دراصل پاپا نے بزنس ڈیل کے لیے بلایا ہے انہیں- بہت اونچی چیز ہیں- اس لیے ہم سب کو تیار ہونے کا کہا ہے-''

ایمی نے کئی ہفتے بعد اس سے کلام کیا تھا- فریال بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی-

''کیا دیکھ رہی ہو یار! گھر میں ٹینشن ہو تو کوئی بھی پریشانی سے نہیں بچتا- خیر اب امید ہے کہ ساری ٹینشن ختم ہو جائے گی-''

ایمی لہراتی ہوئی چلی گئی- فریال نئی امید' نئی آس لیے کپڑے منتخب کرنے لگی- سب پرانے ہو چکے تھے- دو ڈھائی سال کے درمیان ایک جوڑا بھی نہیں بنا تھا- الماری میں گولا بنا ہوا لینن کا سوٹ شہریار کا تحفہ' وہی نیا تھا- سرد آہ بھر کر وہی اٹھا لیا- شیما گنگناتی ہوئی آئی-

''ایں؟ یہ کیا- یہ سوٹ کون سا ہے- ارے پارٹی ہے بھئی' یہ ماسیوں والا ڈریس اتارو-''

''میں اسی قابل ہوں شیما-'' اس نے بھرے گلے سے کہا- ''شہریار نے دیا تھا مجھے-''

''پاگل ہیں شہری بھائی- لو' یہ پہنو اور فوراً میرے کمرے میں آؤ-'' شیما بڑا خوبصورت ڈریس پلنگ پر ڈال کر چلی گئی-

وہ بھونچکا سی رہ گئی- کیوں ہو رہی ہے مہربانی اس پر- آرڈر کی تعمیل ضروری تھی- وہ ریڈ اور بلیک خوبصورت ڈیزائن والا سوٹ پہن کر شیما کے کمرے میں پہنچی- دونوں بہنیں فل میک اپ میں تیار ملیں- پہلے انہوں نے اس کے نازک سراپے کی تعریف کی پھر حسن کی' اور پھر لباس کی- جو یوں سج رہا تھا جیسے اسی کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہو پھر شیما نے اس کو پکڑ کر میک اپ شروع کر دیا- وہ حیرت سے مجسمہ ہونے لگی تھی- آج اس مہربانی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی- انہوں نے صرف یہ کہا-

''بھئی کافی دن بعد پارٹی ہو رہی ہے اس لیے-''

لان میں پارٹی کا انتظام مکمل تھا- بیرے' بٹلر ادھر سے ادھر لپکتے پھر رہے تھے- میزیں اعلیٰ قسم کی نعمتوں سے بھری ہوئی تھیں- کمال ہے آج ماموں کی کفایت کہاں جا سوئی- جس کا مظاہرہ وہ کئی مہینوں سے کر رہے تھے- شاید مہمان بہت ہی اونچی چیز ہیں- اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا-

☆☆

''بس سمجھ لو' ایسے مہمان ہیں- منصوبہ کامیاب ہو گیا تو شہری بھائی تم کو تھرڈ کلاس تحفہ دینے کے بجائے بیش قیمت ڈائمنڈ کی رنگ دیں گے-''

وہ پھر آس کے جھولے میں جھولنے لگی- مہمان وقت پر آ گئے- باپ اور بیٹی صرف دو مہمان اور کھانے پینے کا سامان پچاس آدمیوں کے قابل- کیا ہو گیا تھا ماموں کو- شیما' ایمی اور شہریار باپ بیٹی کے گرد مثل پروانہ گھوم رہے تھے- مامی کی ہاں میں ہاں ملا کر خوشی دیدنی تھی- وہ نہ صرف ان صاحب سے خوشامدانہ انداز میں مل رہی تھیں- گفتگو کر رہی تھیں بلکہ فریال کو بھی تعریفیں کر کر کے آگے بڑھا رہی تھیں- مامی فریال پر واری صدقے ہو رہی تھیں اور مہمان لڑکی پر سو جان سے نثار ہونے کی تیاری-

''فریال! آگے بڑھو- کیک پیش کرو جہاں گیر صاحب کو- ارے فریال' یہ بسکٹ فریال- جہاں گیر صاحب کو مٹھائی دو- کولڈ ڈرنک دو فریال- صاحب بہت شرمیلی ہے یہ-''

مامی حیرت انگیز طور پر بدل چکی تھیں اور وہ مہمان جو کسی بزنس ڈیل کے لیے آئے تھے' فریال پر مہربان ہو رہے تھے اور ان کا ماموں سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا- ماموں حالانکہ وہیں لان میں بیٹھے تھے مگر مہمان شہریار' مامی اور فریال سے ہی مخاطب رہے- ایک مرتبہ تو ہنستے ہنستے انہوں نے فریال کا ہاتھ ہی تھام لیا- اس پر فریال گھبرا کر پیچھے ہٹی تو مامی اور شہریار قہقہہ لگانے لگے-

''بہت ہی شرمیلی ہے یہ سر-'' شہریار نے کہا-

''پسند ہیں' پسند ہیں مجھے-'' جھومتے ہوئے وہ صاحب فریال کی طرف جھکے اور فریال جھجک کر پیچھے ہو گئی- ان کے منہ سے نہایت گندی بو کے بھبکے ناقابل برداشت تھے- مہمان اور شہریار قہقہہ لگانے لگے پھر شہریار ان کی بیٹی کی طرف بڑھ گیا- جسے ایمی اور شیما گھیرے بیٹھی تھیں اور ادھر سے بھی بلند بانگ قہقہے ابلنے لگے- وہ ماموں کی طرف جانے لگی تو مامی نے کہنی ماری اور آنکھ سے اسے مہمان کی طرف اشارہ کیا- فریال سمجھی نہیں اور جو اس کی سمجھ میں آیا وہ اس نے کیا- یعنی مہمان کو ماموں کی طرف متوجہ کیا- مہمان اوہ کہہ کر فریال کے پیچھے چل پڑے-

ماموں تو اس قدر تھکے ہارے بیٹھے تھے کہ ان میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہ تھی- مہمان نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور فریال کو بھی بیٹھنے کا اشارا کیا- فریال دور پڑی کرسی پر بیٹھ گئی- نہ جانے ماموں دبی زبان سے کیا کہہ رہے تھے- مامی بھی وہیں آ گئیں اور مہمان کے ساتھ خوش دلی سے شریک گفتگو ہو گئیں- وہ اپنی جگہ اکیلی بیٹھی رہی- ایمی' شیما یا شہریار نے اس کا تعارف لڑکی سے نہیں کرایا تھا- لڑکی بلاشبہ بہت حسین تھی مگر اس کا حسن مصنوعی سامان آرائش کے سبب تھا- اعلیٰ کوالٹی کا سامان' اس کی مصنوعی مسکراہٹ' بناوٹی قہقہے' رنگے ہوئے' کٹے ہوئے بالوں کو خاص انداز سے جھٹکنا- ہر چیز بناوٹی-

وہ چپکے سے اٹھ کر اندر آ گئی- کمرے میں جا کر کتنی دیر وہ اس پارٹی کے اغراض و مقاصد پر غور کرتی رہی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ کپڑے بدل کر آرام سے لیٹ گئی- کپڑے اس نے تہ کر کے رکھ دیے- شاید امی یا شمیا کا تھا سوت- شاید اسے نیند آ گئی تھی-

پھر کچھ آوازوں سے چونک کر اٹھی- وہ لوگ اسے سوتا پا کر شاید واپس چلے گئے تھے اور وہ سوچنے لگی- شاید مجھے بتانے آئے تھے کہ ان کا مقصد پہ کامیاب ہو گیا ہے اور پھر شہریار ڈائمنڈ کی رنگ پہنائے گا- اف' کاش میں جاگ رہی ہوتی- اس عرصے میں ان لوگوں کے درمیان اتنی دوری ہو چکی تھی کہ اس کی ہمت نہ پڑی کہ پکار کر ان سے کہے کہ وہ جاگ رہی ہے- مامی ناراض نہ ہو جائیں مگر بھلا انہوں نے اسے جگا کیوں نہ دیا-

صبح حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے کا دن طلوع ہوا تھا- کسی نے اسے جگایا نہیں' ناشتے کے لیے آواز نہیں دی- وہ دوڑتی ہوئی کچن میں گئی تو مامی اسے شانوں سے تھام کر لے آئیں- پیار بھرے انداز میں اسے سب کے ساتھ میز پر لا بٹھایا- اس نے سب کے ساتھ ناشتہ کیا- ماموں کچھ چپ چپ تھے- باقی سب چہک رہے تھے- پرانا ماحول لوٹ آیا تھا- وہ بھی مسکرانے لگی- ناشتے کے بعد سب لاؤنج میں آ گئے- مامی نے اسے صوفے پر بٹھایا پھر ماموں کی طرف دیکھ کر بولیں-

''سسپنس ختم ہونا چاہیے- چلیں آپ فریال کو بتائیں- ہمارا آئندہ پروگرام اور یہ بھی کہ انکار کے بعد اس گھر میں....''

''چپ رہو-'' ماموں گرجے- وہ یکدم بے حد سہم گئی- ماموں کو غصہ کیوں آیا-

مامی نے کڑے تیوروں سے میاں کو دیکھا- ماموں نے فریال کو رحم بھری نظروں سے دیکھا- گلا صاف کیا پھر اپنے سرمائے کے ڈوب جانے' کاروبار کے تباہ ہونے کے نتیجے میں کروڑوں کے مقروض ہونے کی اندوہناک داستان سنائی-

''اب صورت حال یہ ہے-'' ماموں نے سنے سرے سے گلا صاف کیا- ''جب تک ہم ایک بڑی رقم قرض حاصل نہ کر لیں جو کاروبار کو سہارا دے کر کھڑا کر دے اور مارکیٹ میں ہماری ساکھ برقرار رہے ہماری تباہی سے نجات ممکن نہیں-''

فریال کی آنکھیں بھر آئیں- دل دکھ سے بھر گیا- اف ماموں اتنا نقصان کیسے برداشت کر سکے اور اب کیا ہو گا' کہاں سے لیں گے قرضہ؟

''ماموں! پھر آپ قرض لے لیں- یہ جو کل آپ کے دوست آئے تھے- کیا وہ نہیں دے سکتے؟''

''ہاں' یہ بات-'' مامی خوشی سے لہک کر بولیں اور لپک کر کھڑی ہو گئیں- ''کیسی پتے کی بات کی

ہے فری نے-'' انہوں نے جھک کر فریال کو بوسہ دیا- وہ ششدر رہ گئی- ایسے تعلقات عرصہ پہلے سے ختم تھے-

''اب قصہ یہ ہے کہ قرض تو وہ دے دیں گے مگر ان کی ایک شرط ہے اور اس شرط کے لیے تمہاری رضامندی ضروری ہے-''

اس نے حیرت سے دیکھا- مامی جتنی خوش تھیں' ماموں اتنے ہی رنجیدہ- انہوں نے گردن جھکا لی تھی-

''میں بتاتا ہوں- ماما! آپ رکیں-''

شہریار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا- اس نے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں ملائی ہوئی تھیں- آنکھوں میں چمک تھی- چہرے پہ صد بشاش اور خوش باش-

''ہاں ہاں- کہیے' میں ماموں کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں-''

اس نے شہریار کو اتنے نزدیک دیکھ کر دل میں پھوٹتی خوشیوں کی کونپلوں کو بڑھتے دیکھا-

''وہ ایسا ہے فریال-'' شہریار نے گردن نیچی کر کے گلا صاف کیا- ''قرض وہ دے دیں گے لیکن بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی سے پہلے اپنی شادی کرنا چاہتے ہیں- بھئی وہ ارب پتی ہیں- ایک کیا دس شادیاں کر سکتے ہیں مگر انہیں عورت پر زیادہ بھروسا نہیں رہا- پتا نہیں کیا بات تھی- تو خیر اب انہوں نے ایک سودے کی تجویز دی ہے-''

''تجویز نہیں- شہری! بات کو بڑھاؤ نہیں- اسے بتاؤ' ان کی شرط ہے یہ-'' مامی نے کہا-

''ہاں بتا دیں- آپ مجھ سے ڈر رہے ہیں؟ شہری کیا ہو گیا ہے؟'' وہ شہری کو دائیں بائیں دیکھتے ہوئے حیران سی تھی-

''ہاں' آں- بتاتا ہوں نا بھئی' وہ....'' شہریار نے سر کھجایا- ''دراصل انہوں نے تمہیں پسند کر لیا ہے انہیں تمہاری شرم و حیا اور معصومیت پسند آ گئی ہے-''

کن کن کن- سناٹے اس کے وجود میں گونجنے لگے- ''پسند ہیں' پسند ہیں مجھے-''

کوئی عفریت منہ پھاڑے اس کی طرف بڑھ رہا تھا- وہ جھٹکے سے اٹھ کر شہریار کے سامنے کھڑی ہو گئی- اسے احساس تھا کہ جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا ہے- آنکھوں میں بھر گیا ہے' اسی لیے اسے سامنے کی ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی- شہریار کا چہرہ بھی-

''پھر....'' اس کے گلے سے غراہٹ برآمد ہوئی- ماموں نے سر اونچا کر کے بھانجی کو دیکھا تھا-

''انہوں نے تم سے شادی کی خواہش کی ہے-''

شہریار اسی طرح تنا کھڑا تھا اور فریال کے اندر دھماکے ہوئے تھے' دھڑام- ایک آرزو کا محل مسمار ہوا- آہ و بکا- سینے میں مقید ارمانوں کی تھی- چھن چھن چھناک- تمناؤں کا تاج محل زمیں بوس-

ہوا- اس نے اپنے قدموں میں لرزش محسوس کی-

''اور تم کیا کہتے ہو؟'' اس کی آواز صاف' لہجہ تحقیر آمیز تھا-

''میں.... پاپا کی.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا-

''ماموں کی نہیں' اپنی بات کرو- تم کیا کہتے ہو؟'' وہ تحمل سے زمین پر کھڑی تھی-

سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں- وہ کسی کو نہیں صرف شہریار کو دیکھ رہی تھی' پلکیں جھپکے بغیر-

انہوں نے محبت کے راگ تو کبھی نہیں الاپے- کوئی وعدے وعید بھی نہیں کیے- شہریار نے ہمیشہ اس پر حق جتایا' دھونس جمائی' اسے اپنی ملکیت سمجھا- آج وہ کچھ نروس اس کے سامنے کھڑا تھا- گلدی سہلا رہا تھا- یہ روپ اس نے پہلے کبھی شہریار کا نہیں دیکھا تھا- وہ خود تو جانے کیا کچھ کرنا چاہتی تھی- دولت تو دے چکی تھی- شاید وہ جان مانگتا تو دے دیتی کسی طور- اب اس نے اپنی غیرت کے سودے کی بات کی ہے- ایسا تو ہوتا نہیں- عام زندگی میں بھی غیرت کا مطلب غیرت ہوتا ہے- عزت آبرو' انا' آن بان یا.....

''میں.... میں بھی چاہتا ہوں کہ تم اس کو قبول کرلو-''

شہریار کے منہ سے سرسراتے ہوئے الفاظ نکلتے ہی فریال پر جنون طاری ہو چکا تھا- اسے ذرا اندازہ نہ تھا کہ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آئی یا وہ اتنی قوت کہاں سے لائی- اس نے پوری ہمت' جرات اور حوصلے سے وہ کام کیا' جو کوئی بھی جواں مرد' غیرت دار مرد کر سکتا تھا- جس کسی کی غیرت کو للکارا جائے-

پہلے تھپڑ کا تو شہریار کو بھی اندازہ نہ ہوا- دوسرا تھپڑ بھی ایسا زوردار تھا کہ وہ مزاحمت نہ کر سکا بلکہ اس زوردار تھپڑ کے بعد وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا- سائیڈ ٹیبل کے کونے پر سر لگنے سے سر پھٹ گیا اور وہ وہیں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا- خون اس کے کان کے پیچھے سے نکلا اور بہتے ہوئے گردن پر آ گیا- دم بخود سی سیمہ- مامی اور شیما ایک ساتھ کھڑی تھیں-

مامی چیختی ہوئی شہریار کی طرف بڑھیں- ایمی' فریال کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی- شیما بھی خوفزدہ اپنی جگہ کھڑی رہی-

صرف ماموں تھے جن کے چہرے پر رونق تھی- وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے نہیں- مامی اسے گالیاں دے رہی تھیں-

اس کے حلق سے تیز آواز نکلی- ''بے غیرت-'' اور وہ تیز قدموں سے وہاں سے نکلی اور اس نے اپنے جذبات میں اٹھتے طوفان کے شور کے باوجود مامی کی آواز سن لی-

''زارا کو فون کرو- زارا کو بتاؤ- اپنے پاپا سے کہے-''

نہ جانے کیا- زارا تو.... یہ لڑکی وہ تھی جس کے قدموں کی دھول شہریار بنے ہوئے تھے اور اس کا

باپ' فریال کے عوض زارا کا رشتہ دے رہا تھا- وہ گھر سے نکلی تو بھاگتی چلی گئی- جانے کون سی قوت تھی جو اسے کہیں لے جا رہی تھی پھر اس نے اپنے چہرے پر آبشار گرتا محسوس کیا- آنکھیں برس رہی تھیں- دوپٹے سے منہ رگڑ کر اس نے گیٹ کی گھنٹی پر انگلی رکھ دی-

خالہ کے گھر پنکی آئی ہوئی تھی' اپنے گول مٹول بچے کو لے کر- سب اس کی خاطر میں لگے تھے- بچے کو گودوں میں اٹھایا جا رہا تھا- تتلا کر باتیں کی جا رہی تھیں- اس پر غور کرنے کا موقع کسی کے پاس نہ تھا- پائلٹ آفیسر پنکی کے بیٹے کو اپنا نام دے کر فارغ ہو گیا- طلاق کینیڈا میں ہوئی- اب عدت گزار کر پنکی واپس آ گئی تھی اور آرام کا موڈ تھا- دوسری شادی کے لیے وہ کسی دولت مند کو پھانسنے کا پروگرام بنا رہی تھی جو اس کے بیٹے کو آسائش کی زندگی دے' تحفظ بھی- سجاد بھائی کا رشتہ خوشحال گھرانے میں طے ہو گیا تھا-

روزی نے بھی ایک پروفیسر کو بک کر لیا تھا- متوسط طبقے کا یہ نوجوان روزی کو کیوں بھا گیا- کیونکہ وہ ایک محنتی اور سچا انسان تھا اور روزی جو جھوٹ' منافقت سے تنگ آ گئی تھی' زندگی گزارنے کے لیے سنجیدہ ہو گئی- ایک سچے محنتی غریب آدمی کے ساتھ عمر بھر کا بندھن باندھنے کے لیے-

فریال کو محسوس ہو رہا تھا- وہ کافی عرصے کے بعد آئی ہے- سب کس قدر خوش اور مطمئن تھے- اس کے سوا' اسے کیوں حق نہیں خوشیاں حاصل کرنے کا- اس نے کہاں غلطی کی- وہ تو بظاہر خوش باش لاپروا مگر اندر سے سادہ اور سنجیدہ لڑکی تھی پھر اسے کوئی خوشی کیوں نہیں ملی- جسے چاہا' اسے کھو دیا- کس گناہ کی سزا ملی اسے- اس کا دل پھٹنے کے قریب تھا کہ پنکی کے ایک چھوٹے سے سوال نے اسے ہوش کی دنیا میں لا پھینکا- نہ جانے وہ بے ہوش ہو گئی تھی یا ہونے والی تھی-

''تمہارا کیا حال ہے- کمزور لگ رہی ہو-''

پنکی نے پوچھا تھا اور جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر بلکنے لگی- پنکی نے سہارا دیا' کندھا بڑھایا' تسلی دی اور وہ شہریار کے آخری الفاظ تک کی داستان سنا گئی-

اور ہر شخص ہر ذی روح نے اس پر گزری ہوئی قیامت کا حال سنا- اس کے زخم سے بہتے لہو کو محسوس کیا لیکن یہ جیسے ایک عام سی بات تھی' معمولی- ذکیہ آپا نے تسلی دی-

''تو اس قدر جذباتی ہونے کی کیا بات ہے- یاد رکھو دولت مند کبھی بوڑھا نہیں ہوتا- اس کی دولت' اس کی شہرت ہر چیز کی حصے دار ہو گی' عیش کرو گی- پیسہ بڑی چیز ہے' بہت بڑی قوت- سب کو چاہیے دولت-''

''پیسہ' پیسہ ذکیہ آپا! پیسے میں طاقت ہوتی ہے' محبت نہیں- مجھے محبت چاہیے-''

''بی بی! محبت بھی پیسے سے ہوتی ہے- سارے رشتے دولت کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں ورنہ ماموں کم از کم زبانی ہی تمہاری حمایت کر لیتے- اپنا بیٹا نہ سہی' دنیا کے سارے لڑکے ختم تو نہیں

ہو گئے۔ کہیں تو تمہارے جوڑ کامل ہی جاتا۔ اب ایسے بھی گئے گزرے حالات نہیں کہ.... مگر انہیں بھی پیسہ چاہیے۔ خیر اس بوڑھے کو یعنی سیٹھ کو پنکی آزمالے گی۔ کیوں پنکی۔''

''تم نے بھی تو اپنا سارا زیور ان کے حوالے کر کے ہاتھ کاٹ لیے۔ کم از کم۔'' پنکی نے بات ٹالی۔ ''ان ہی کا سہارا ہوتا' اب بھلا....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ گویا اب وہ بے حیثیت کم تر' مفلس لڑکی تھی۔ کون اس کا سہارا بن سکتا تھا۔ ایک وقت تھا جب یہی ذکیہ آپا اپنے بھائی کو پنی پڑھا رہی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اندیشے اور مستقبل کی فکر نے ساری جان سلب کر لی تھی۔ شاید اسے نیند آ گئی تھی۔ اٹھی تو روزی اور پنکی کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔

ذکیہ آپا سسرال جا چکی تھیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی سوچتی رہی۔ خالہ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کے گریز کو جان گئی تھی۔ اس کا ذہن اب جاگ گیا تھا۔ روزی اور پنکی اس کے وہی زیور پہنے ہوئے تھیں جو خالہ کے پاس امانت تھے۔ اب فریال میں اور ایک معمولی ملازمہ میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ خالہ کے لیے بھی وہ غیر اہم تھی۔ خالہ آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جاتے جاتے اسے تاکید کر گئیں۔

''جاتے وقت گیٹ لاک کر دینا بیٹا۔''

اس پر غم کا پہاڑ آ گرا۔ جاتے وقت' کہاں جاتے وقت؟ وہ تو ماموں کا گھر چھوڑ آئی تھی۔ اب کہاں جائے گی۔ وہ سچ مچ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئی تھی اور اتنی ہی حقیر فقیر لیکن جاگتے ذہن نے ایک راستہ دکھا دیا۔

آنٹی شہباز کو فون کرتے ہوئے وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ جس راستے پر جس جگہ آنٹی نے اسے امانت پیش کی تھی' وہیں وہ ان کی منتظر تھی۔ وہ آ گئیں۔ ایک غیر' بالکل غیر' کبھی کبھی ملنے والی۔

''سوری بیٹا! مجھے دیر ہو گئی۔ دراصل میں آج ہی کی سیٹیں لینے کے لیے مجبور تھی۔ بیٹا! مجھے غلط نہ سمجھنا۔ تمہاری مومانی سے مجھے ہر ذلیل ترین اقدام کی امید ہے' اس لیے میں ایک رات بھی تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ ہم آج ہی لاہور جائیں گے اور....''

''ہم؟'' کتنی معصوم تھی یہ بچی۔ آنٹی شہباز کو بہت پیار آیا۔ کاش اس کی قسمت بھی ایسی ہی پیاری ہوتی۔

''ہاں' ہم۔ میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گی۔ کیا اکیلا جانے دوں گی؟ تمہارے نیک' شریف' فرشتہ خصلت والد سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات تھے۔''

آہ' اس نے سر پشت سے ٹکا لیا۔ کتنے عرصے بعد اسے اپنے باپ کے لیے والد کا لفظ سننے کو ملا تھا۔ ان کا ذکر' تعریف' اس کے زخمی دل پر مرہم لگتا گیا۔ آنٹی نہ جانے بابا کے بارے میں کیا کیا

کہہ رہی تھیں۔

گاڑی ان کا ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ ایئرپورٹ کی سمت جا رہی تھی مگر اس کے دل کے جلتے چھالوں پر بابا کے ذکر نے جو ٹھنڈا مرہم رکھا تھا' وہ زخم اب سوکھتے جا رہے تھے۔ سکون' آرام۔ آنٹی اسے جہاز کی سیڑھیوں تک بابا کی باتیں بتاتی رہیں۔ وہ سرشاری کی کیفیت میں ہوں ہاں کرتی رہی۔

☆☆

سرفراز اماں کے پیر دبا رہا تھا۔ صبح سے ہی بادل جمع ہو رہے تھے اور شام کو سب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ ہوا چلنے لگی۔ سرفراز کو علم تھا۔ یہ بارش کا موسم' بھیگی ہوائیں اماں کے پیروں میں درد کر دیتی ہیں۔

''اماں! اب کھانا کھا لیں۔ دیر ہو جائے گی تو آپ کا کھانا ہضم نہیں ہو گا ٹھہریں میں میز آگے رکھ دیتا ہوں پھر پانی لاؤں گا۔ آپ نہیں ہاتھ دھو لیجیے۔''

''ارے بیٹا! مجھے محتاج نہ بناؤ۔ میں اٹھ جاتی ہوں تم کھانا لے آؤ۔''

دستک کی آواز بادلوں کی گھن گرج سے زیادہ تیز تھی پھر دوسری دستک اور سرفراز کے دروازے تک جاتے جاتے تیسری دستک مع موٹی موٹی بوندوں کے۔

''نہ جانے کون نازک مزاج ہے۔ ذرا سی بوندوں کی برداشت نہیں ہے۔'' سرفراز بڑبڑاتا ہوا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں' کون ہے؟'' آواز حلق میں پھنس گئی۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھیگی لٹوں' تھرتھراتے ہونٹوں کے کونوں پر سسکیاں مچل رہی تھیں۔

''فریال' تم۔'' اور فریال جیسے چکرا کر گرنے لگی۔ سرفراز نے اسے تھام لیا۔

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے بیٹا! میرا تعارف فریال کرا دے گی۔ چونکہ ابھی ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ ہے میری۔ ایک امانت آپ کی تھی' وہ دے کر جا رہی ہوں۔ اللہ حافظ و ناصر۔''

وہ مسکراتے چہرے والی بشاش' ڈیسنٹ سی خاتون برستی بوندوں میں سڑک پر کھڑی ٹیکسی میں غراٹے بھرتی ٹیکسی زن۔ حیرت کا مقام' مگر غرق ہونے کا موقع تھا نہ وقت۔ فریال دھتے دھتے اندر جا چکی تھی اور جب وہ دروازہ بند کر رہا تھا' اسے اندر سے اس کے دھاڑیں مارتے بین سنائی دیے' ساتھ ہی اماں کی چیخیں۔ وہ دوڑتا ہوا اندر گیا۔

دونوں خواتین ایک دوسرے میں ضم رونے دھونے کے سارے ریکارڈ توڑے ڈال رہی تھیں۔ سرفراز ان کے آنسوؤں' چیخوں اور فریادوں سے لاپروا کچن میں کھانا گرم کر رہا تھا اور پھر وہ ٹرے اس نے پہلے سے رکھی میز پر اماں کے پلنگ کے پاس رکھی۔

''چلیں اماں! رونا دھونا تو بہت ہو چکا- میرا خیال ہے فریال کو بہت بھوک لگی ہے- کیوں؟''
فریال آنسو پونچھ رہی تھی- بے دھیانی میں سر ہلا کر اقرار کر بیٹھی- سرفراز زور سے ہنسا پھر اس کے چہرے پر چھائی مردنی نے اسے بے چین کر دیا-
''فریال! کیا تم بیمار ہو-''
''نہیں' اب ٹھیک ہوں-'' اس نے آہستہ سے کہا- پھپھو سرفراز کو فریال کے بستر کے بارے میں ہدایات دینے لگیں- وہ ان سے چمٹ گئی-
''نہیں پھپھو! مجھے خود سے الگ نہ کریں- میں یہیں آپ کے پاس سو جاؤں گی-''
اس کی آنکھیں ساون کے نظارے پیش کرنے لگیں- پھپھو نے اسے لپٹا لیا-
''پھپھو! اتنے دن میں ایک بار بھی آپ نے میری خبر نہیں لی- ملنے نہیں آئیں تو بلا ہی لیتیں کبھی-'' کیسی حسرت تھی اس کی آواز میں-
''بیٹا جی! میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں جاتی- بس زندہ ہوں- تمہیں دیکھ کر تو صحت بھی بحال ہو گئی-'' پھپھو بے قراری سے بولیں ''اور ہر تیسرے چوتھے دن فون کرتی تھی- تمہاری مومانی نے نہیں بتایا؟ ان ہی سے بات ہوتی تھی- ہر بار ہی وہ کہتیں- فری تو سیر کے لیے گئی ہے- پکنک پر گئے ہیں بچے یا سوات گئی ہوئی ہے- میرے بچے! میں تو تمہاری آواز کو ترس گئی- سفر کے قابل میں تھی نہیں-''
''آپ' سرفراز بھائی کو بھیج دیتیں-''
''بھیجا تھا- تمہاری مومانی نے باہر کے باہر کہلوا دیا کہ فری کا خان گئی ہوئی ہے- سرفراز کو ایسی ہتک محسوس ہوئی کہ دوبارہ خالہ کا نام نہ لیا اور بیٹا! ہم تو یہی سمجھے کہ تم اپنی خالہ مومانی سے مانوس ہو- خوش ہو گی وہاں-''
فریال نے اچانک سر اٹھا کر پوچھا- ''پھپھو! اگر میں آپ کو بتاؤں- میں..... میں بہت غریب ہو چکی ہوں' میرا سارا زیور چور لے گئے' میرا ابھرا ہوا گھر ڈاکوؤں نے لوٹ لیا پھر آپ کیا کریں گی-''
''اس خدا تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی- جس نے میری بچی کو مجھ سے ملا دیا- بیٹا! زیور' پیسہ جان کا صدقہ سمجھ کر بھول جاؤ- گیا تو اچھا ہوا-''
''آپ کو پھر بھی میری محبت آئے گی-''
''کیوں' کیوں نہ آئے- محبت مجھے تم سے ہے کہ پیسے سے- بیٹا! زیور' پیسہ' مصنوعی نمائشی چیزیں ہیں- بے جان' بے روح- انسان کا وجود اصل حقیقت ہے- کیا کوئی وجود سے زیادہ بے جان چیزوں کو چاہ سکتا ہے؟ نہیں- تم میرے وجود کا حصہ' میرے عزیز بھائی کی نشانی- تم سے زیادہ مجھے

کون پیارا ہو گا؟''
''شاہ-''
''نہیں' تم نے سنا نہیں- ماں مٹی دو ذات' پھپھی بھتیجی ایک ذات- میری چاند' خدا گواہ ہے مجھے شاہ سے زیادہ عزیز ہو تم- میرے اکلوتے بھائی کی اکلوتی نشانی- یہ چہرا' یہ آنکھیں' یہ ماتھا- مجھے اپنے بھائی کی یاد دلاتا ہے-''
پھپھو اسے بے قراری سے چومنے لگیں-
''میری جان! اب تم یہاں سے کہیں نہ جانا' میرے پاس رہنا' ہمیشہ ہمیشہ- میں تمہارے ماموں سے مانگ لوں گی تمہیں- اچھا؟''
''پھپھو! میں خود جو آ گئی ہوں آپ کے پاس ہمیشہ کے لیے- مجھے سونے دیں اب-''
اور وہ ایک لمحے کے اندر سو گئی- سرفراز اور اماں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے-
صبح بڑی سہانی تھی- رات کے بادل' غم کے بادلوں کی طرح کہیں غائب ہو گئے تھے- اب خوشی اس گھر کی دیواروں سے برس رہی تھی- جس گھر میں بس عیب نظر آتے تھے- آج وہاں سکون مل رہا تھا' تحفظ- کتنا ترس گئی تھی ایسے سکون کے لیے-
سرفراز کچن سے ناشتے کی ٹرے اٹھائے آ رہا تھا-
''سنیے محترمہ! آج تو آپ مہمان ہیں' اس لیے میں خدمت کے لیے حاضر ہوں- کل مجھے صبح سویرے آفس جانا ہو گا- امید ہے آپ' اپنی مدد آپ کے تحت چائے پانی کا بوجھ اٹھا لیا کریں گی-''
''سوری' میں کل آپ کے لیے بھی ناشتہ بنا دوں گی- کھانا بھی جیسا تیسا-''
''اوہ' سیکھ لیا؟ ویری گڈ-''
''سکھا دیا زمانے نے' وقت نے-''
''خیر جس نے بھی سکھایا' اس کا شکریہ- چائے ٹھنڈی ہو جائے گی' پی لو فاسٹ-''
''آپ' آفس- واہ بھئی خبر ہے-'' کیسی ہلکی پھلکی ہو رہی تھی وہ- لاپروا' بے نیاز-
فون پھپھو نے اٹھا لیا- ''ہیلو جی وعلیکم السلام- جی ہاں میں بول رہی ہوں ڈی سی سرفراز مجید کی والدہ- آپ کون- اوہ اچھا' جی- پہنچ گئی ہے میرے پاس' رات کو ہی آئی اے سے- سلمان کے دوست کی بیگم پہنچا گئی ہیں- خالی ہاتھ آئی ہے- آپ لوگوں کا بہت شکریہ میری امانت کی حفاظت کی اور بڑے وقت پر پہنچا دیا- جی میرا بیٹا اللہ کے کرم سے ڈی سی ہے- آپ' اوہ بند ہو گیا-''
پھپھو نے ریسیور رکھتے ہوئے لمبا سانس لیا-
''تمہاری مومانی کہتی ہیں- کسی کے ساتھ فرار' توبہ لاحول- رقم کا بھی ذکر کر رہی تھیں- ڈی سی کا

نام سنتے ہی ٹھنڈی پڑ گیں۔

فریال کے حلق میں چائے پھنسنے لگی۔ آنکھیں بھر آئیں۔ سب کچھ ان لوگوں پر نثار کر دیا پھر بھی الزام اور کتنے دکھ لکھے ہیں قسمت میں۔

''پھپھو! سچ بتائیں۔ آپ کو کبھی یہ معلوم ہوا کہ میں نے اپنی حماقت سے اپنا ہی نقصان کر دیا ہے' آپ کا نقصان' سب کا۔ ہم سب کا نقصان تو آپ مجھے دھتکار یں گی تو نہیں' مجھے.....''

اور اس نے خود پر گزرنے والی ایک ایک بات پھپھو کو بتا دی۔ خود بھی روتی رہی' پھپھو کو بھی رلاتی رہی۔

پھپھو نے اس کے لرزتے' سسکتے وجود کو اپنی گرم آغوش میں بھر لیا۔

''میری جان! تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ میرے لیے پیسہ دولت کبھی اہم نہیں رہے۔ دنیا میں برے بھلے سب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیٹا! ہر کسی کا عمل اس کے ساتھ جائے گا۔ تمہیں جو بھی دکھ پہنچے' اپنوں سے اور وہ جو صلاحیتیں تمہیں یہاں پہنچا گئی ہیں وہ تمہاری کون تھیں۔ کوئی نہیں۔ پہلے انہوں نے تمہیں چیک بک دی پھر تمہیں میرے گھر چھوڑ کر گئیں اور تمہیں ہماری امانت کا نام دیا۔ وہ محسن بھی ہیں ہماری۔ میں ان کا شکریہ ادا کروں گی۔''

''آپ نے ماں کا بھی شکریہ ادا کیا۔ کیوں' انہوں نے مجھ سے.....''

''بھول جاؤ گی۔ دیکھ میری جان! پیسہ' دولت میرے لیے تمہارے مقابلے میں اتنا بے حقیقت ہے جیسے تھوک دینے والا اگال۔''

انہوں نے اخ کر کے اگالدان میں تھوک دیا۔ وہ پھپھو کو دیکھتی رہ گئی۔ کیسا فلسفہ بیان کیا تھا۔ پھپھو واقعی شعور بھی ہیں۔

سرفراز کچن میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہا تھا۔

یہ خواتین کتنے آنسو بہا ئیں اور وہ ایک دریا کا روپ دھار لیں مگر میری اس خوشی کا مقابلہ کیا کرے گا وہ دریا' جو میرے اندر سے پھوٹ رہا ہے' سمندر کی طرح اچھل رہا ہے' پھیل رہا ہے' پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ بہر حال ایک بات طے ہے۔ مجھے میری امانت لوٹاتے ہوئے ان محترمہ کے چہرے پر پورا یقین' مسکراہٹ بن کر پھیل گیا تھا کہ وہ حق بہ حقدار رسید کے بموجب کامیاب ہو گئی ہیں۔ کامیاب بھی' کامران بھی۔ شکریہ ماموں جان' آپ نے اماں کو مایوس نہیں کیا۔ یہ آپ کی تمنا تھی کہ میری امانت مجھ تک پہنچے پہنچ گئی۔ قدرت کے بہت عجیب اور پیچیدہ نظام کے تحت' دردناک انجام سے بچانے والی قوت۔ بے شک تو عظیم ہے' مہربان ہے۔

☆☆ ☆☆

وقت گزر نہ جائے

میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی حالات نے ستم ڈھائے۔ تقدیر نے مذاق روا رکھا اور مجھے عجیب و غریب ہستی بنا دیا۔ انوکھی نرالی۔ اب تو مجھے کچھ بھی انوکھا' نرالا نہیں لگتا۔ کتنا کچھ دیکھا اور جھیل چکی ہوں۔ شاید اسی لیے انوکھی ہوں۔ دوسرے بچوں سے مقابلہ کرتی ہوں تو اور بھی حیران ہوتی ہوں۔

پہلا انوکھا واقعہ تو میری پیدائش کا ہے۔ جب میرے والدین مایوس ہو گئے۔ تب میں آدھمکی اور وہ بھی اس طرح کہ ماں بے چاری تو اس واقعے کو حادثہ سمجھ کر موت کو گلے لگا کر دوسرے جہاں سدھاریں۔ آپریشن تھیٹر کے ٹھنڈے ٹھار ٹیبل پر ہی ختم۔

دادی میں جب تک دم رہا۔ مجھے سنبھالا۔ پھر خاص میرے لیے ایک عدد ماں کا بندوبست کیا گیا۔ دادی کی نگرانی میں مہیا کردہ ماں کی گود میں پرورش پانے لگی۔ ماں نے خوب خوب ممتا نچھاور کی دادی کے بعد ان میں اس ماں مامتا کے نمایاں روپ دکھائی دیے۔ مارے محبت کے اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ کیونکہ میری ماں بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ ایف اے انہوں نے مجھے خود پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ پھر میں ابا کی موجودگی میں ہی پڑھائی جاتی۔ ابا کے گھر میں ٹکنے کے اوقات بھی۔ بس کبھی شام' کبھی رات۔

بہر حال ابا کی موجودگی میرے لیے عیش کا سبب ہوتی۔ ماں کی ممتا پر جوش۔ ابا کی عنایتوں کا ہجوم۔ بس کچھ دیر۔ پھر یا تو ابا کہیں چلے جاتے۔ یا رات ہو جاتی۔ پل ہی گئی کسی طور۔ ذرا بڑی ہوئی تو اسکول جانے والے بچوں کو حسرت سے دیکھا کرتی۔ میرا اسکول جانے کا ذکر ماں کو پسند نہ تھا۔

یہ اس کے بعد مجھے احساس ہوا- جب میں نے ابا سے منت کی اور ابا نے اماں کو ہدایات دیں- ابا کے جانے کے بعد مجھے ماں کی بے انداز چاہت اور محبت کے نمونے ملے-

چونکہ وہ میری ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کرتی تھیں- اس لیے محبت کے اظہار کے ان کے پاس بہت سے نمونے موجود تھے- کبھی چپری- کبھی جلتا ہوا چمچہ کبھی دو منٹر یا سر پکڑ کر دیوار سے ٹکرانا- زخم لگاتے ہوئے یہ دھیان رکھنا کہ نظر نہ آئے- کمال کی محبت تھی- اسکول جانے کی ضد خاصی مہنگی پڑی- میرے ہاتھ کرسی کے پیر تلے دبا کر وہ کرسی پر چڑھ کر بیٹھ گئیں- پھر یہ حکم کہ آواز نہ نکلے- عرصہ ہوا- اب یاد نہیں- کتنا تڑپی- پھڑکی اور چیخیں روکنے میں پورا چہرہ نیلا ہو گیا- معافی تو بعد اور کیا معلوم کس مہربان کی دستک نے اس عذاب سے چھٹکارا دلایا-

جب بھی کوئی آتا- مجھے سنگرانے کی تاکید تھی- لوگ کہتے- ''بچی بہت خوش رہتی ہے- کیوں نہ ہو- ایسی ماں جس کی ہو- کیا دکھ'' ماں کی محبتوں کے چرچے دور دور پھیلے- ان کے پرانے کپڑے چھوٹے کر کے مجھے پہنائے جاتے- خواہ کتنی گرمی- یا سردی ہوتی- میں ریشمی کپڑوں میں ملبوس- جلتی رہتی یا ٹھنڈی ہوتی- لوگوں پر اس کا بھی بہت اثر ہوتا کہ میں ہمیشہ ریشمی کپڑے ہی پہنتی ہوں- اس کا اعزاز ماں کو ملتا- مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ چنبے جھیلنے کی بے پناہ قوت حاصل کر لی- رونے چیخنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ ماں کو میری فریاد ڈسٹرب کر دیتی- تو اس لیے ان کی خوشی کی خاطر- تکلیف سہہ سہہ کر پتھر بن گئی-

اکیلے میں البتہ آنسو نکل آتے- مگر میں انہیں بھی روک لیتی- دراصل ماں کو مجھ سے بہت نفرت تھی اور انہوں نے کبھی یہ بات مجھ سے نہیں چھپائی- ہاں زمانے میں ان کی محبتوں کے ڈنکے پٹ رہے تھے کہ نمائش کا اظہار محبت ان کو خوب آتا-

اول بات یہ کہ میں ہو بہو اپنی ماں کا نمونہ تھی- میری مرحومہ ماں بے حد حسین تھیں- ابا بار بار ذکر کرتے- جب وہ مجھے گلے لگا کر پیار کرتے- موجودہ ماں کے پتنگے لگتے- بعد میں اس کا نمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا- ان کا بس چلتا تو میرا چہرہ چولہے میں جھلس کر تسکین پاتیں- مگر وہ صرف میرا ہاتھ ہتھیلی جلا کر ہی دل ٹھنڈا کر لیتیں- کتنی اعلیٰ محبت تھی ان کی-

میری ایک پھوپھی تھیں- ایک رشتے کی خالہ- جب یہ آتیں ماں کا منہ بن جاتا- مگر وہ ان کے آگے بچھ بچھ جاتیں- خاطر تواضع میں کمی نہ کرتیں- وہ لوگ مجھے بلا کر پیار کرتیں- گلے لگاتیں- ایسے میں کوئی زخم- کوئی چرکہ میں دے اٹھتا تو ہلکی سی سسکی نکل جاتی- پھر ماں نے ان سے میرا پردہ کرا دیا- وہ آتیں مجھے کمرے میں بند کر دیا جاتا-

''کہیں کھیلنے گئی ہے-''

''کسی سہیلی سے ملنے گئی ہے-''

یہ بہانے موجود تھے-

کبھی پھپھو کہتیں- ''سیانی ہو رہی ہے- اب ذرا روک ٹوک کرو-''

''لو- میری کب سنتی ہے- پھر ابا نے کوئی پابندی نہیں لگائی- تو میں کیوں بری ہوں-''

''کوئی بات ایسی ویسی ہو گئی- تو نام تو تمہارا ہو گا-'' پھپھو ان کی ہمدرد بن جاتیں-

مجھے ہنسی آ جاتی- گھر سے جھانکنے کی تو اجازت نہ تھی- دراصل خالہ اور پھپھو میرے حسن کے قصیدے پڑھتیں- میری مرحومہ ماں کا ذکر ہوتا- اور میں بیچارگی ظلم کا شکار بنتی- بازو دانغنا- کمر کو نشانہ بنانا- ٹانگوں پر بید برسانا- کس جہنم میں زندہ تھی میں بے آواز-

شاید کوئی نقاش فطرت میری اذیتوں میرے چہرے کے تاثرات کو رقم نہ کر سکے- میرا سارا جسم انگارے کی طرح دہکا کرتا- بازو دکھتے رہتے' چلتے میں لنگڑاتی تو محبت کی ماری ماں زخموں پر دھمو کے رسید کرتی- زہر برساتی زبان سے کیا کیا القاب ایجاد ہوتے- میرے خدا- پھر یہ دھمکی-

''باپ سے لگایا- تو تیزاب سے جھلس دوں گی میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا-''

یہ سچ تھا- کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا- ابا تو ان کے احسانوں تلے دبے ہوئے تھے- بالکل ریشہ خطمی- مجھ سے محبت کا احسان- میری اعلیٰ پرورش کا احسان- مجھے کبھی جرات نہ ہوئی کہ ابا کو احسان کے بوجھ سے نکالوں- میری ہمت حوصلہ اس قدر پست ہو چکا تھا کہ ظلم سہنے میں ہی عافیت نظر آتی-

☆☆

ابا کے ایک دوست ڈنمارک میں کاروبار کر رہے تھے- انہوں نے ابا کو بلایا تھا- بہت اطمینان دلایا- ابا محنتی آدمی تھے مگر یہاں ان کی محنت کا صلہ مل نہیں رہا تھا- ماں تو فوراً ہی رضامند- اباسوچ میں پڑ گئے- ہم تین تھے اور وہاں سے دو ٹکٹ کی آفر تھی- ابا کے پاس بھی اتنا نہ تھا اور دوست کا اصرار- ماں کے ذہن کی داد دینی چاہیے' بولیں-

''ہم روشی کی شادی کر دیتے ہیں- ویسے بھی جوان لڑکی کو غیر ممالک میں کہاں لیے پھریں گے-''

ابا ہکا بکا ہو گئے- ''پاگل ہوئی ہو- اتنی سی بچی کی شادی-''

ابا کو میری جدائی بھلا کب گوارا تھی- مگر وہ مسلسل دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں- آخر انہوں نے مجھے آزمایا- کیا اور کیسے- یہ ایک تکلیف دہ اور لمبی داستان ہے- نتیجہ ماں کی فتح' میں خود نہ چاہتے ہوئے ابا سے کہہ رہی تھی-

''ابا! آپ میری فکر نہ کریں- میں کہیں بھی رہ لوں گی-''

میری آنکھوں کے خشک آنسو- گلے کی خاموش چیخیں انہوں نے سنی نہیں- آنسو بھلا کہاں نظر آتے کہ میری محبت کرنے والی ماں نے خوفناک نتیجے کی بھیانک تنبیہ سے انہیں جلا کر سرمہ کر دیا تھا- یہاں میرا کون تھا جس کے پاس رہتی- ایک ماموں البتہ تھے مگر ان سے عرصہ ہوا ماں نے

ہی ادھر ادھر کی سنا کر ابا کو بدظن کر دیا تھا۔ پھر مجھے ان سے ملنا ہی نصیب نہ ہوا۔ کاش ابا کو ان کا خیال آ جاتا۔ تو میں ماموں کے پاس بخوشی رہ لیتی۔

ایک دن صبح ابا کے گھر سے نکلتے ہی ماں نے مجھے ساتھ لیا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گجرات جانے والی بس میں ہم بیٹھ گئے۔ گجرات میں ماں کی خالہ زاد بہن رہتی تھیں۔ مجھے اس لیے ساتھ لیا ہوگا کہ کہیں ابا کو ورغلا نہ لوں۔ مگر نہیں۔ معاملہ دوسرا تھا۔ وہ میری نقاب کشائی کے لیے ساتھ لائی تھیں۔ خالہ صغریٰ نے ماں کی دردناک داستان سنی کہ میں کس طرح ان کی خوشیوں کے درمیان رکاوٹ بن رہی ہوں۔ یوں بھی وہ مجھے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہوگئی تھیں۔

انہوں نے ماں کی تجویز بخوشی منظور کر لی اور شام اسی وقت وہاں سے روانہ ہو کر لاہور پہنچے۔ کیونکہ اماں نے ابا سے شاپنگ کے لیے جانے کا کہہ کر مجھے ساتھ لے جانے کی اجازت لی تھی۔

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ ابا گھر میں پریشان ملے۔ ماں نے ہائے ہائے کہہ کر داستان سنائی کہ دوپہر کو گھر سے نکلے۔ کیا پتا شادمان میں سیاسی جلسہ ہوگا۔ وہاں تو پولیس لاٹھی چارج کر رہی تھی آنسو گیس کے گولے برس رہے تھے۔ بمشکل ایک دکان میں چھپے رہے۔ توبہ توبہ۔''

''تو فون ہی کر دیتیں۔'' ابا جھلائے ہوئے تھے۔

دکان چھوٹی تھی۔ سینکڑوں لوگ جان بچانے کے لیے گھسے ہوئے تھے میں کہاں جوان لڑکی کو گھسیٹتی۔ یقین نہ آئے تو کل اخبار میں دیکھ لینا۔ ہائے ہائے میں تو مارے ڈر کے ایک چیز نہ خرید سکی۔''

دراصل شادمان کے جلوس کی خبر تو اسٹیشن پر ہی کسی نے دی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو بھی کوئی بہانہ گھڑ لیتیں۔ کیونکہ میری ماں کے ذہن میں بدی کی قوتوں کا خزانہ جمع رہتا تھا۔

☆☆

اگلے دن ہی خالہ صغریٰ آ گئیں۔ انہوں نے میرا رشتہ طلب کیا۔ جواباً نے کچھ چیر پھاڑ کے بعد قبول کر لیا۔ ابا بہت خوش تھے کہ اس پریشانی کے وقت ان کی مشکل حل ہوگئی۔

لڑکا پڑھا لکھا۔ اچھی پوسٹ پر تھا۔ خالہ صغریٰ نے ہر طرح کا اطمینان دلایا۔ ابا روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ ماں میری رخصتی کی۔

میں پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ زبان حلق میں اینٹھی ہوئی رہتی۔ آنکھوں تلے اندھیرا رہتا۔ ابا سے جدائی نامعلوم مدت تک' ایک وہی تھے پورے جہان میں جن کو میں بلا شرکت غیرے اپنا کہہ سکتی تھی۔

یوں رشتے دار تو اور بھی تھے مگر ماموں کے سوا کوئی سگا نہ تھا۔ خالہ پھپھو رشتے کی تھیں۔ میرے چہرے کی تحریر۔ آنکھوں کی بے بسی کسی کو نظر نہ آئی۔ ابا کو بھی نہیں۔ وہ تو میری اداسی کو جدائی کا سبب سمجھ کر مجھے سمجھاتے نصیحتیں کرتے۔

شادی گڈے گڑیا کی نہ تھی۔ مگر ہوئی ایسے ہی۔ گڈا آیا۔ گڑیا کو لے کر چلا گیا۔ ابا کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ ماں کی پریشانی دور ہوئی۔

سفر اتنا لمبا نہ تھا۔ مگر مجھے لگا۔ جیسے میں مسلسل سفر میں ہوں۔ نہ منزل' نہ سرائے۔ تھکن' تھکن اور اداسی۔ جورگ و پے میں درد بن کر پگھلتی جا رہی تھی۔ میرے دائیں بائیں ساس نند تھیں۔ نند وئی کار چلا رہے تھے۔ ساتھ میں دولہا بیٹھا تھا۔ سب خوش گپیوں میں مصروف۔ صرف ان لبوں پر تالے لگے تھے۔ جو اس سفر کا باعث تھا۔ میں اور وہ' یوں تو وہ خاصا قبول صورت تھا مگر ناراضگی سے چہرہ پھولا ہوا تھا۔ پتا نہیں مجھے ہی لگا یا وہ تھا ہی پھولا ہوا۔ ہاں گھر جا کر چند مکالمے ساعت سے ٹکرائے۔

''شادی ایسی ہوتی ہے؟ گڑیا کی شادی میں بھی کچھ اہتمام ہوتا ہے۔ یہاں تو لگتا ہے' کسی ناپسندیدہ شے سے چھٹکارے کی جلدی تھی۔ دھکا دینا تھا۔ سو دے دیا۔''

یہ دولہا میاں کے ارشادات تھے۔ جن سے میں متنفس تھی۔

''نہ بیٹا! نہ ایسے مت کہو۔ ان کی مجبوری تھی۔''

''ان کی مجبوری تھی۔ ہماری تو نہ تھی۔ اگر میں قاضی کے سامنے انکار کر دیتا۔ تب آپ کیا کرتیں؟''

''کیا کرتیں؟'' خالہ صغریٰ کھوئے کھوئے لہجے میں بڑبڑائیں۔ ''وہیں جان دے دیتی۔''

''یہ صرف ڈائیلاگ ہیں۔ اماں! اگر بیٹے پر اتنا ہی اعتماد تھا۔ تو پھر اس کی قیمت صحیح لگاتیں۔ بے مول بخش دیا آپ نے مجھے۔''

''میں بھی ایک انمول شے لائی ہوں بدلے میں۔ ہر چیز کو نفع نقصان سے مت دیکھو۔''

''انمول شے۔ ہر لڑکی انمول ہوتی ہے ماں باپ کے لیے۔ کوئی اس طرح بیٹی کو کنویں میں نہیں دھکیلتا۔ کم از کم وہ میرے چال چلن کے بارے میں ہی تحقیق کراتے۔'' خصیصاً لہجہ تھا۔ مگر درست۔

''بیٹا! بات ساری اعتماد کی ہے۔ انہیں میری زبان پر اعتبار آ گیا۔ انہوں نے بازی لگائی تو میں نے بھی داؤ کھیلا ہے۔ اب یہ ہمارے ظرف کی آزمائش ہے اور میں تمہارے ظرف کی وسعت دیکھنا چاہوں گی۔''

یہ میری ساس اور اس کے بیٹے کے درمیان گفتگو تھی۔ جو من و عن مجھ تک پہنچی۔

میں اپنی کم قیمت زندگی پر بے تحاشا رونے کے الزام سے کیونکر بچ سکتی تھی۔ بچ تھا اور میں اتنی ہٹ دھرم بھی نہیں۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ مجھے آرام کا مشورہ دے کر جس کمرے میں لایا گیا تھا۔ اس سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں ماں بیٹا تنہائی پا کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔ دروازہ ان کے کمرے کا بھی بند ہوگا۔ مگر ان دونوں کمروں کے درمیان کھلا روشن دان ہر آواز مجھ تک پہنچا رہا تھا۔ میں اب تھکن بھلا کر مستقبل کے خوف میں مبتلا ہوگئی۔

آخر تھکن غالب آئی اور نیند کی مہربان لوریاں مجھے بے خبر کر گئیں' پھر کسی کے بولنے کی آوازوں نے مجھے بیدار کیا تھا۔

''ارے۔ جمیلہ آپا! اس بے چاری کا میک اپ تو بہت ہی خراب ہے۔ کس سے کروایا تھا۔''

''ارے کس سے کروانا تھا۔ کوئی محلے کی لڑکی پکڑ لائی تھیں خالہ امینہ۔ اس نے الٹی سیدھی لیپا پوتی کر دی۔'' جمیلہ آپا کچھ بیزار تھیں۔ ''اور وہاں تو سارے کام اوندھے سیدھے ہوئے تھے۔''

اب انہوں نے آواز بہت دھیمی کر لی۔ مگر میری سماعت کچھ زیادہ ہی حساس تھی۔ ''ارے گوشی! ایمان سے لگ رہا تھا کہ خالہ امینہ کو بس لڑکی کی رخصتی کی جلدی ہے۔ بھئی ان کی تو وہی مثال تھی کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اتنا اچھا رشتہ مفت میں مل گیا۔ کسی طرح لڑکی بھگتا کر اب چل دیں گی میاں کے ساتھ عیش کرنے۔''

''آپا! دلہن ہے تو بہت پیاری۔ ماشاءاللہ۔ ساری عمر رضوان بھائی دعا دیں گے آپ کو۔''

''مجھے کیوں۔ خالہ امینہ کو کہو۔'' قہقہہ کے ساتھ کہا گیا۔ ''اچھا میں بے چاری کے لیے کھانا لے آؤں۔ جانے کب سے بھوکی ہے۔''

''خوشی کے مارے بھوک اور نیند سب غائب ہو جاتی ہے۔ سنا ہے۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔''

''ارے نہیں۔ اس بے چاری کے ابا کل جا رہے ہیں۔ یہ تو اداس ہے۔ ویسے خالہ امینہ کافی پیار کرتی ہیں۔ ان کی تو اولاد نہیں ہے مگر اپنی بچی کی طرح پیار کرتی ہیں۔''

''اچھا آ؟ واہ۔'' تعجب اور تمسخرانہ انداز تھا۔ ''ابھی کہہ رہی تھیں اوندھے سیدھے کام ہوئے اور انہیں بیٹی کی رخصتی کی بڑی جلدی تھی۔''

''او بھئی۔ وہ الگ بات ہے۔''

وہ کھانا لینے چلی گئیں اور میں ابا کی جدائی کی کسک کو شدت سے محسوس کرنے لگی۔ گویا اب ہماری جدائی۔ نامعلوم مدت کے لیے ہے۔ کمزوری نے ہاتھ پیر سن کر دیئے۔ اب جدائی کا دکھ۔ پتا نہیں میں ابا کو دیکھ سکوں گی کہ نہیں۔ مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ غم کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ پھر ایک جوشیلی اور پھرتیلی اور باتونی لڑکی نے میرا میک اپ کر دیا۔

''ہائے اللہ۔ کیا چاند سا مکھڑا ہے۔ میک اپ نے اور بھی نکھار دیا۔ لگتا ہے آج رضوان کی خیر نہیں۔ جمیلہ آپا تخلیہ میکا کر رکھ لیں۔''

پھر کافی خواتین اور بچے گھس آئے۔ رونمائی شروع ہوئی۔ کچھ تبصرے مذاق۔

''لگتا ہے نیند کی کچی ہے۔ دیکھو کیسے نیند میں جھوم رہی ہے۔''

''بس وہ تھکن۔ سفر جو لمبا تھا۔ پھر بے چاری کے ماں باپ بھی باہر جا رہے ہیں۔ رو رو کر برا

حال کر لیا تھا۔''

حالانکہ میں روتی کیونکر۔ اجازت ہی نہ تھی مجھے کہ کہیں مجھے روتے دیکھ کر ابا جذباتی ہو کر اپنا فیصلہ نہ بدل دیں۔

''بھئی۔ ہماری بھی شادی ہوئی تھی۔ شادی کی خوشی۔ ساتھ میں خوف پھر اور بھی تخیلات نیندیں اڑائے ہوئے تھے۔ اس بے چاری کا بھی یہی حال ہے۔'' تیز طرار خاتون تھیں۔

''رہنے دیں خالہ جی! میری بھی تو شادی ہوئی تھی۔ نہ نیند اڑی نہ تخیلات نے جگایا۔ پتا نہیں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو کچی عمر کی ہے۔ گڑیوں سے کھیلنے کے دن ہے۔ ہوئی شادی۔''

جمیلہ آپا پھر میری سائیڈ لے رہی تھیں۔

''اور اسے یہ بھی بتایا کہ جس سے بیاہی گئی ہے' وہ پورا جن ہے۔ غصیلا۔ ضدی۔'' پھر ایک غنیمے کے ساتھ کہا گیا۔ جمیلہ آپا پر امان گئیں۔

''خیر۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مردوں کو غصہ آ ہی جاتا ہے غلط باتوں پر۔ یہ تو ہم عورتیں ہی برداشت کرتی ہیں۔ غصے کو ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔''

جمیلہ آپا خاصی جھلائی ہوئی تھیں اور میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ ابھی تک تو ماں کی ممتا ہی لرز و بر اندام کیے رہتی تھی۔ اب شوہر کے جناتی غصے کا سامنا کیسے کروں گی۔ مارے خوف کے آنکھیں پھٹ گئیں۔ دوپٹے کی اوٹ سے خاتون کو دیکھا۔ خاصی کچی عمر کی تھیں مگر زندہ دل اور ہنس مکھ لگیں۔

''اری جمیلہ! سچ کہا تو نے۔ دلہن تو کچی عمر کی منہ بند کلی جیسی ہے۔ اسے تو لگتا ہے زمانے کی تتی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ امینہ کو کیا سوجھی۔ بڑی خود غرض عورت ہے۔ اپنے عیش کی خاطر بچی کو باپ سے جدا کر دیا۔ آخر تو سوتیلی ہے۔ اسے کیا درد اس بچی کا۔''

''نہیں خالہ! امینہ خالہ تو بہت پیار کرتی ہیں۔'' آپا جمیلہ کھسیا گئیں۔ ''لڑکی تو آپ کو پتا ہے کلکڑی کی بیل کی طرح ہوتی ہے۔ بڑھنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔''

''سچ کہا' رات بھر میں ہی بچی سے عورت ہو جائے گی۔ مگر ظلم ہے اس پر۔ دو سال بعد بھی شادی ہو سکتی تھی۔ دیکھ کر ترس آ رہا ہے مجھے۔'' وہ جانے کے لیے اٹھیں۔

''بس خالہ! نصیب نصیب کی بات ہے۔'' جمیلہ آپا نے شکر ادا کیا کہ ان کے جملوں سے جان چھوٹی اور جب سب عورتیں چلی گئیں۔ کمرے میں سناٹے کا راج ہو گیا۔ میری کمر اکڑ گئی تھی۔ لیٹی تو آرام ملا۔ اب جنات کا خوف۔ سسرال کے رویوں کی فکر۔ نہ جانے میرا کیا حشر ہونا ہے۔ آپا جمیلہ تو ہمدرد تھیں (ابھی تک تو) خالہ صغریٰ پتا نہیں کیسی ہوں گی۔ غصیلے جن کی تعریف سن لی تھی۔ انجام صاف نظر آ رہا تھا۔

ابھی تک تو کمر کے زخم ہی دکھ رہے تھے۔ ماں کی ممتا کی نشانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔

بازوؤں میں کسک تھی اور مجھے لیٹنے کی بھی عادت نہ تھی- صبح سے رات تک ماں کے حکم پر- الف کھڑی رہتی کہ کب کوئی کام اور نکل آئے- رات گئے نیند سے نڈھال ہو کر پڑتی تو نہ کھرے پلنگ کا ہوش ہوتا نہ جگہ کا- اف اور یہاں جو نرم بستر ملا- زخموں کو یہ کچھ سکون-

ابا کو یاد کرتے کرتے نیند کی وادی میں گم ہو گئی- ابھی شام ڈھلی تھی- اور میں .... پھر آپا جمیلہ چائے لے آئیں-

''کھانے میں تو دیر ہے- چائے پی لو تھکن اتر جائے گی-''

ان کے ہمدردانہ الفاظ نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے- وہ مجھے دلاسے دینے لگیں- اپنی اماں کی نرمی- محبت-

''تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوگا- خالہ کی باتوں کی فکر نہ کرو- ابھی ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے- رضوان پنڈی ہوتا ہے- ابھی نہیں لے کر جائے گا- کوئی ایسی ویسی بات کرے تو مجھے بتانا- دماغ درست کر دوں گی اچھا-''

''ابا چلے جائیں گے آپا- پتا نہیں پھر کب-'' میں رو رہی تھی- آپا پریشان ہو گئیں-

''ہاں یہ تو پتا نہیں- تین سال سے پہلے تو وہ آ نہیں سکتے- خالہ اپنے آ سکتی ہیں- وہ تمہیں چاہتی بھی بہت ہیں- رو رو کر حالت خراب کر لی تھی- کہنے لگیں- جمیلہ! میری بچی کو بہت پیار دینا- پہلی دفعہ جدا ہو رہی ہوں میری کی محسوس نہ ہونے دینا اسے- میں نے کبھی پھولوں کی چھڑی بھی نہیں چھوائی اسے-''

میرے آنسو یک لخت منجمد ہو گئے- پھولوں کی چھڑی- کمر اور بازو لکڑی کی طرح اکڑ گئے- ہر طرف ٹیسیں اٹھنے لگیں- اسی وقت گوشی بولتی ہوئی آ گئی-

''آپا! ایسا کرو- کوئی دوسرا جوڑا لے آؤ- یہ کپڑے تو بہت مسل گئے ہیں- میں پھر سے میک اپ کروں گی- ایسا کہ رضوان دیکھتے ہی پٹ سے گرنے گا عاشق ہو کر' یوں-''

کہتے کہتے وہ میری گود میں آ پڑی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی- دیکھتے دیکھتے جیسے جلوہ حسن کی تاب نہ لا کر جھینگی ہو گئی- مجھے ہنسی آ گئی-

''بلے بھئی بلے-'' وہ یکدم اٹھ بیٹھی- ''بڑی خوش نظر آ رہی ہے دلہن- آپا! کیا اس نے دولہا میاں کا دیدار نہیں کیا؟''

جمیلہ آپا ہنسی میں اڑا گئیں- ''بھئی تم چھوڑو- دولہا اسی لباس میں دیکھ لے گا- رات کے لیے کوئی ہلکا سا جوڑا لا کر رکھ دوں گی-''

صاف ظاہر تھا' وہ اپنے بھائی کے جتاتی اوصاف کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں- وہ چلی گئیں- تو گوشی نے کہا میں منہ ہاتھ دھولوں تاکہ میک اپ کی تازگی زیادہ دیر قائم رہے- میں ملحقہ باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھو آئی- اس کا بہت اچھا اثر ہوا- سستی غائب ہو گئی اور کچھ سکون محسوس ہوا-

گوشی میک اپ کا سامان پھیلائے بیٹھی تھی- اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر بولی-

''ہاں ویسے تمہیں ان نمائشی چیزوں کی ضرورت تو نہیں- یوں بھی سادگی میں اچھی لگ رہی ہو- مگر کیا کریں- دلہن پھیکی پتی نہ ہو تو مزا نہیں آتا- آؤ بیٹھو-''

میں اس کی ہدایت کے بق آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی- کچھ دیر وہ مجھے اپنے کمال کے جوہر دکھاتی رہی (چہرے پر) پھر بولی-

''اچھا اب ایک بازو تو نکال لو میں گردن کے نیچے تک کریم لگاؤں گی- قمیص ذرا تنگ ہے تو ہاتھ نہیں جاتا- شاباش آستین اتار دو بس-'' میں سٹپٹا کر بازو پہلو سے چپکا کر بیٹھ گئی-

''اوہو-'' وہ میرا بازو بنا کر کہنے لگی- ''بھئی- میں تمہیں کوئی ایسا ویسا بندہ نظر آ رہی ہوں- یعنی کہ بدمعاش- چلو شاباش- آستین نکالو- گردن سے ذرا نیچے تک چہرے کے مطابق' اوہو بہت شرمیلی ہو تم تو' چلو میں آنکھ بند کر لیتی ہوں-''

مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ زبردستی پر اتر آئی- ایک تو میں خود بلی پتلی تھی- کمزور بھی- وہ یوں بھی خاصی پہلوان نظر آ رہی تھی- پھر اس کے ہاتھوں نے میرے بازو کے زخم بھی چھیل دیے- وہ آستین اتارنے میں کامیاب ہو گئی اور پھر اس کی حیرت سے پھٹی آنکھوں کا تاثر-

''یہ' یہ کیا ہے؟'' زخم تو بازو کے علاوہ گردن کے نیچے بھی تھے- جنہیں میں چھپانا چاہ رہی تھی اور جو ممکن نہ ہوا- وہ اب باقاعدہ مجھے گھور رہی تھی اور اس کی تیز نظروں نے کمر پیٹھ اور پیٹ تک رسائی حاصل کر لی تھی- اب وہ خوفزدہ بھی تھی- اس کے سوالات سے تنگ آ کر میں آنسو بہانے لگی- مگر اسے مطمئن کیسے کرتی- آخر بتانا پڑا-

''یہ میری ماں کی محبت کی نشانیاں ہیں-'' میں نے تلخ ہو کر کہا-

''کیا؟ خالہ اینہ؟ وہ جو بہت محبت کے چرچے-'' وہ بھونچکا سی تھی- میں نے اقرار میں سر ہلا دیا-

وہ سمجھ بھی گئی پھر بھی سوال پر سوال اور ترس پہ ترس کھاتی رہی- میں شرم و ندامت کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی- اپنی ذلت کا تماشا دیکھا نہیں گیا- گوشی سر تھامے کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی پھر بڑبڑائی-

''کون یقین کرے گا؟ اور وہ رضوان کبھی نہیں وہ تو پورا جن ہے-''

''میں چھپالوں گی-'' میں نے کہا-

''کب تک چھپاؤ گی؟'' پھر اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں شاید طاقت نہ رہی- وہ جلدی سے کام مکمل کر کے مجھے قمیص پہنانے لگی- پھر جیسے تھک کر وہیں گر سی گئی-

تب ہی ساتھ کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں- جمیلہ آپا اور صغریٰ خالہ بولتی ہوئی داخل ہوئیں- پھر دروازہ بند کرنے کی آواز آئی-

''توبہ ہے جمیلہ! تم بھی کمال کرتی ہو- ذرا دم لو-''

''اماں! ایسا کون سا مشکل سوال کر دیا میں نے- ایک سادہ جوڑا مانگ رہی ہ[illegible] کے لیے-
آپ نے سب کے سامنے جھڑک دیا- واہ-'' آپا جمیلہ کچھ رنجیدہ سی تھیں-

''بیٹا! کہہ تو رہی تھی کہ اچھا- دیتی ہوں- دیتی ہوں- تم نے تو بیٹھنا دو بھر کر دیا- [illegible] معلوم تو ہے کہ بری میں کوئی سادہ جوڑا ہے ہی نہیں- رات کے لیے ہم نے بنایا بھی نہیں-''

''تو اماں! جہیز کے جوڑوں میں سے نکال دیں- لائیں چابی- کہاں ہے سوٹ کیس-''

''وہ تو لاہور میں رہ گیا-'' خالہ صغریٰ ٹھنڈے لہجے میں بولیں-

''ہیں؟'' جمیلہ آپا شاید حیرت سے اچھل پڑیں- ''کمال کرتی ہیں اماں- میں نے خود دیکھا تھا- خالہ امینہ نے آپ کے ہاتھ میں دیا تھا سوٹ کیس- آپ وہیں چھوڑ آئیں؟''

''جمیلہ! ذرا تحمل سے کام لو- بیٹی امینہ نے سوٹ کیس مجھے دیا ضرور تھا- پھر تم لوگ شاید رخصتی کے لیے باہر چلے گئے- سوٹ کیس میں نے اٹھایا- تو وہ کھل گیا- پرانا تھا- اس کا لاک بھی نہیں تھا- سارے کپڑے ادھر ادھر بکھر گئے- کسی نے مجھے آواز دی میں چلی گئی-''

''کمال ہے- ادھر ادھر بکھر گئے- کیا مطلب- انہیں سمیٹا جا سکتا تھا- آپ مجھے بلا لیتیں-''

''افوہ- بال کی کھال نکالنے کی عادت-'' خالہ صغریٰ جھلا گئیں- ''جمیلہ! وہ کپڑے اس قابل نہ تھے- سارے پرانے- بدرنگ- میں نے وہیں پھینک- امینہ صفائیاں دینے لگی کہ اتنا نائم نہ ملا' وہ' میں نے کہا چھوڑو امینہ- ہم نے بیٹی لی ہے- وہی سب کچھ ہے یہ کپڑے تم میری بہو کے صدقے میں کسی فقیر کو دے دینا-''

''اماں! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' جمیلہ آپا تو بیہوش ہونے لگی تھیں- پھر جھلا گئیں- ''خالہ نے اپنی بے پایاں محبت کا یہ ثبوت دیا ہے؟ زیور کے نام پر ایک چھلا تک نہیں- کپڑے دیے تو پرانے- خود تو جھلمل کرتا نیا جوڑا پہنے مٹکتی پھر رہی تھیں- ہاتھ میں بھرکلائی سونے کی چوڑیاں- گلے میں جڑاؤ گلوبند' کانوں میں جھمکے- واہ بیٹی کو ایک چوڑی دے دیتیں- اتنی کم ظرف نکلیں- مجھے یقین ہے کہ خالو نے رقم دی ہوگی- وہ خود ہضم کر گئیں-''

''بس جمیلہ! اب آگے ایک لفظ نہ منہ سے نکلے ہم نے کسی لالچ میں شادی نہیں کی- اس کے نصیب میں ہوگا تو بہت کچھ بنا لے گی- امینہ کو موقع نہیں ملا اتنی جلدی میں-''

''رہنے دیں اماں-'' آپا جمیلہ بگڑ گئیں- ''ہم نے بھی تو اس کم عرصے میں دس کام دار جوڑے بنوائے- سیٹ بنوایا- وہ چار جوڑے ہی بنا لیتیں-''

''اچھا بس- چپ رہو- کوئی پوچھے تو کہہ دینا سامان لاہور ہی رہ گیا-''

''خیر- اتنی عقل تو ہے- کچھ تو کہوں گی ہی- مگر آپ کب تک پردہ ڈالیں گی-''

جمیلہ آپا بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں- ہر آواز- یوں اس کمرے تک پہنچ رہی تھی جیسے میرے سامنے ہی دو آدمی بیٹھے گفتگو ہوں اور میں شرم سے عرق عرق-

گوشی بھی بہری نہ تھی- وہ حیرت سے سن رہی تھی- لیٹی تھی- اٹھ کر بیٹھ گئی- نہ جانے اس کے تاثرات کیا ہوں گے میری ہمت نہ تھی کہ نظر اٹھا کر اسے دیکھوں کہ وہ مجھ بدنصیب کے لیے کیا سوچ رہی ہے- ترس کھا رہی ہے- یا میری تذلیل پر رنجیدہ ہے یا پھر ماں کی بے مثال محبت کے انمول مظاہروں نے اسے دم بخود کر دیا تھا-

''سنو- میں تمہاری ہمدرد ہوں- پھر بھی سوچ رہی ہوں کہ اتنی کم عمری میں تم نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو کہ امینہ خالہ سزا کے طور پر تم سے چھٹکارا پانے کے لیے مجبور ہوئی ہوں-''

کچھ دیر کے بعد گوشی نے یہ جملہ کہا تھا- میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی-

''دیکھو- میں شک نہیں کر رہی- مگر لوگ کر سکتے ہیں-'' وہ سچ کہہ رہی تھی-

گویا اب میرا اشتہار بنے گا- لوگ سوچیں گے- میرے ماں باپ نے اتنی کم سنی کے باوجود میرا بوجھ اتار پھینکا- تو اس میں میرا قصور بھی ہوگا یہ نئے خدشے تھے اور کافی دہشت ناک- گوشی کے جانے کے بعد میں بلک بلک کر رو دی- اس کی میک اپ کی محنت کی پروا کیے بغیر-

جمیلہ آپا کھانا لائیں- تو مجھ سے کھایا نہیں گیا- انہوں نے دودھ لا کر دیا- پھر میں سو گئی- بے خبر- صبح میرے لیے ایک نئی صبح تھی- نہ آج کل رات سے اب تک گالیاں سنیں- نہ ہی جسم پر زخم کھائے- کوئی نیا چرکہ بھی نہیں- پھر میں خوش نہیں- یہ ناشکری ہی تو تھی میری-

ناشتے پر دولہا میاں کی تلاش شروع ہوئی- تب کسی نے بتایا- وہ رات کو ہی اپنا بیگ اٹھا کر پنڈی چلا گیا تھا- اب باتوں اور سوالوں کا طوفان تھا اور ہدف میں تھی- مہمان اب کم رہ گئے تھے- پھر بھی بے شمار کھوجتی- کچھ تلاش کرتی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں شدید طوفان کی زد میں ہوں- ابا جلے گئے ہوں گے- اب میں کیا کروں گی- کیا میری زندگی ساس کے ساتھ گزرے گی- دولہا تو اپنی خفگی ظاہر کر کے جا چکا تھا- لیکن میں مطمئن تھی-

جو لوگ مجھے پریشان' خوفزدہ یا آنسو بہاتا دیکھنا چاہتے تھے انہیں یقیناً مایوسی ہوئی- جتنے آنسو میرے پاس تھے میں رات میں بہا چکی تھی- جسمانی آرام نے اب مجھے ایک سکون پہنچا دیا تھا اور ماں کے ستم سے نجات کی خوشی نے چہرہ بھی بشاش رکھا- اس وقت میں زیادہ دور تک دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی-

خالہ صغریٰ کچھ کھچی کھچی- رکی رکی سی آئیں- میرے سلام کے جواب میں جینے کی نازیبا حرکت پر معذرت کرنے لگیں- ساتھ ہی بات بھی بنا دی کہ ''اسے ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے- ورنہ-''

خالہ صغریٰ کچھ چپ ہو کر مجھے دیکھنے لگیں- میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا اور پچھلے

جملے کے ساتھ ملا کر کہا۔

''ورنہ بھلا ایسا چاند چھوڑ کر کوئی دور جائے گا؟''

اگر پچھلے دن ماں بیٹے کے مکالمے نہ سنے ہوتے تو اس بہانے پر یقین کر لیتی۔ کر بھی کیا سکتی تھی اور میکے میں جسے خون آشام واقعات پیش آتے رہے ہوں۔ اسے سسرال سے بھی ایسی توقع رکھنی چاہیے۔ مگر خالہ صغریٰ میں شفقت' محبت۔ اعلیٰ ظرفی اور انسانیت موجود تھی۔ کم از کم ان سے میں کسی بے رحمی کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

آپا جمیلہ بھی آئیں تسلی دیتی رہیں۔

''گھبرا نا مت۔ رضوان کل آ جائے گا۔ کل ولیمہ ہے نا۔ بغیر دولہا کے ولیمہ ہو سکتا ہے بھلا؟''

وہ ہنسنے لگیں۔ مگر یہ ہنسی بڑی بے جان تھی۔ ان کے چہرے پر فکر کا تاثر تھا۔ میں واقعی ابھی خاصی کم عمر تھی۔ شادی جیسی ذمہ داری کی اہل نہ تھی۔ لیکن اس کم سنی میں ہی میں بڑے بڑے تجربوں اور مشاہدوں سے گزری تھی۔ میری عمر کی لڑکیاں الھڑ کہلاتی ہیں۔ بے فکری بے نیازی کی عمر۔ وہ اس عمر میں گڑیاں کھیلتی ہیں اور میں میں نے اس عمر میں بڑی منزلیں طے کر لی تھیں۔ میں خاصی ہوش مند تھی۔

بناوٹ' دکھاوا۔ منافقت۔ جھوٹ کی سیاست' نفرت کا عمل۔ میں کیا کچھ نہ دیکھ چکی تھی۔ بلکہ عملی زندگی میں میں ہی ان تمام فعلوں کا ہدف بنی۔ میرا زخمی جسم گواہ تھا کہ میں نے بے انداز ستم سہے۔ بے آواز۔ ظلم کا مقابلہ کیا۔ میں اب بے حس ہو چکی تھی۔ یا بے حد نڈر۔ اس لیے کہ میں ہر حال میں گزارا کر سکتی تھی۔ اس کم عمری میں ہی مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں کی روح کو سمجھ چکی تھی۔

گوشی ایک مرہم لائی۔ کمر و بند کر کے اس نے ہر زخم پر کھرنڈ پر مرہم لگایا۔ وہ ایک سادہ سوٹ بھی لائی۔ جو اس نے تحفے کے طور پر مجھے دیا۔

جمیلہ آپا بھی دو سوٹ لے آئیں۔ شاید میری زندگی اسی طرح گزرے ہمدردیوں اور ترس کے ساتھ۔

☆☆

اگلے دن رضوان آ گئے۔ جمیلہ آپا کے شوہر لے کر آئے تھے۔ میں ڈر کے مارے نظر اٹھا کر دیکھ نہ سکی۔ مگر لگتا تھا کہ سخت بیزار اور مشتعل ہیں۔ جمیلہ آپا کی سرگوشیاں راز فاش کر رہی تھیں۔

شام کو گوشی پھر آ گئی۔ دوا لگائی۔ پھر میک اپ کی تیاری۔ معلوم نہیں اس دھکو سلے کی ضرورت کیا تھی۔ گو کہ کوئی نیا زخم جسم پر نہ تھا۔ مگر پرانے زخم پر کپڑا چپک جاتا۔ کھرنڈا کھڑتا۔ پہلے تو میں ہر دن نئے زخموں کی فہرست شمار کرتی۔ پرانا زخم ٹھیک نہ ہوتا کہ نیا ستم ٹوٹ پڑتا۔ لیکن ہائے۔ یا اف کرنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر اب۔ مرہم نصیب ہوا۔ تو اگلے پچھلے زخموں پر ٹیسوں نے دھاوا بول دیا۔ اور میں ہائے اف کرنے پر مجبور بھی ہو گئی۔ چار دن میں ہی اتنی نازک مزاج ہو گئی؟ حیرت کی

بات۔

''خدا کرے آج تم رضوان کو جیت لو۔'' گوشی میک اپ سے فارغ ہو گئی تھی۔

''ویسے بھی اسے آج پکڑ کر لایا گیا ہے۔ بے چارا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ امینہ خالہ نے اس قدر جلد بازی سے کام لیا کہ توبہ۔ تھوڑا انتظار کر لیتیں وہ تو وہ اتنی توہین محسوس نہ کرتا۔''

''توہین؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں تو اور کیا۔ بھئی وہ اکلوتا' خوب صورت' تعلیم یافتہ پھر لاڈلا۔ اسے تو کسی اونچے گھرانے میں شادی کی خواہش تھی۔ امیر کبیر ایڈوانس سسرال۔ لمبی سلامیاں کار کوٹھی سے کم تو بات نہ کرتا تھا وہ۔ خالہ جی کے آگے چپ ہو گیا۔ اوپر سے۔''

گوشی چپ ہو گئی۔ یعنی کہ اوپر سے کچھ ملا بھی نہیں۔ سو روپے کی سلامی ملی ہو تو ملی ہو۔ ابا نے تو سب کچھ ماں کے سپرد کر دیا تھا۔ کہ جو چاہو دو۔ بناؤ یا نقد پکڑا دو۔ آخر یہ ابا لوگ بیویوں کے آگے اتنے نرم کیوں ہو جاتے ہیں۔ اپنی عقل استعمال کر لیا کریں۔ تو بہتر نہ ہو اور بھلا اس میں میرا کیا قصور۔

گوشی مجھے سینڈل پہناتے ہوئے کہنے لگی۔

''ویسے تمہارا قصور ہی کیا ہے۔ لڑتا رہے اپنی ماں سے۔ تم سے کیوں جھگڑے۔ ویسے بھی۔ تم ایسی چیز نہیں ہو جسے کوئی مرد ٹھکرا دے۔ ضد کی بات الگ ہے۔''

''میری قسمت کا قصور ہے۔'' میرا گلا بھر آیا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''ارے رونا نہیں پلیز۔ نہ ہی قسمت کو الزام دینا۔ خود کو قدرت کے سپرد کر دو۔ وہ تمہیں ضرور صبر کا بڑا انعام دے گی۔ بس یاد رکھو کہ میکے کے جہنم سے نجات ملی ہے۔ خالہ صغریٰ کا گھر جنت ہے۔ یہ غم صلہ تو تمہیں تمہارے صبر کا' بس اسی طرح آرام سے ملے گا۔''

گوشی کا دم غنیمت تھا۔ اس کی تسلیاں۔ دل جوئی اور عملی ہمدردی۔ دل ٹھہر سا گیا۔

☆☆

ولیمہ کسی سبزہ زار میں تھا۔ اسٹیج پر کافی لوگوں کی گنجائش تھی۔ میں تو ایک سنگی بت کی طرح اکڑی بیٹھی رہی۔ سوہی بن رہی تھی۔ جمیلہ آپا مسلسل رشتے داروں کا مجھ سے تعارف کرا رہی تھیں۔

''یہ رضوان کی دلہن ہے اور یہ ہماری چچی ہیں۔ یہ چچا ہیں۔ یہ ان کی بیٹی۔ آئیں خالہ! رضوان کی دلہن سے ملیں آپ۔ آیئے۔ میں ملواتی ہوں۔''

مجھے ان کی کمنٹری سے کوفت ہو رہی تھی۔ جتنے لوگ تقریب میں آئے تھے سب ہی جانتے تھے میں کون ہوں۔ پھر بار بار جمیلہ آپا کا سب کو یقین دلانا۔ پھر کسی نے کہا۔

''ارے جمیلہ! سب کو پتا ہے رضوان کی دلہن ہے۔ مگر تم رضوان کو تو بلواؤ۔ بھئی تصویریں تو

بنوالے۔''

شاید رضوان کو زبردستی لایا گیا تھا۔ تب ہی طرح طرح کے تبصرے سننے میں آ رہے تھے۔ مذاق اڑایا جا رہا تھا۔

''رضوان! بھابھی کی طرف دیکھ کر مسکراؤ نا یار۔ پتا لگے کہ دولہا دلہن پر نثار ہو رہا ہے۔ یہ تم کیمرے کو مسکراہٹ دکھا رہے ہو۔''

''کیمرے کو بھی ایسی روکھی پھیکی مسکراہٹ نہیں چاہیے۔ ہنسو ہنسو۔ دلہن کو دیکھ کر۔''

''دلہن سے بھی کہو۔ وہ رضوان پر نظر رکھے۔ اس کے طور طریقے مشکوک ہیں۔ کبھی دائیں گردن گھماتا ہے کبھی سامنے۔ ارے بائیں دیکھ فضول لڑکے۔ بائیں ہوش اڑ جائیں گے۔ ٹیس ہو جائے گا۔''

''اسی لیے تو بائیں نہیں دیکھ رہا۔'' قہقہے۔

یہ سب قریبی رشتے دار اور رضوان کے دوست تھے۔ گوشی میرے کان سے چپکی سب کے نام بتا رہی تھی۔ مگر اتنا شور ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جونہی خالہ صغریٰ اسٹیج سے اتریں۔ وہ بھی کود کر فرار۔ لڑکے دوڑے۔

''بھاگ گیا۔ بھاگ گیا۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے۔'' مگر کوئی بھی پھر واپس نہ آیا۔

رات میں واپسی پر وہ مسلسل غیظ و غضب کا اظہار کرتے رہے۔ سخت الفاظ۔ روکھا لہجہ۔ خوف سے کانپنے لگی میں۔ کیسے بسر ہوگی یہ زندگی۔ یوں۔

کمرے میں آتے ہی میں نے لباس تبدیل کیا۔ گوشی کا لایا جوڑا پہن لیا۔ میک اپ دھو لیا۔ زیور اٹھا کر رکھ دیا۔ جب جمیلہ آپا اور گوشی بولتی ہوئی اندر آئیں۔ مجھے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹک گئیں۔ پھر جمیلہ آپا نے آگے بڑھ کر مجھ سے جواب طلب کیا۔

''یہ کیا؟ اتنی جلدی سب اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔''

پھر گوشی سے مخاطب ہوئیں۔ ''دیکھو ذرا۔ ہم تو چاہ رہے ہیں کہ رضوان ان کے حسن کا دیوانہ ہو کر سب کچھ بھلا دے اور ان کو دیکھو۔ یہ جلد بازی کہیں ہمارے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دے۔ وہ قورسیاں تڑا رہا ہے۔ اتنی احمق لڑکی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔''

خاصی خفا تھیں وہ۔ گوشی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

''پلیز آپا! اس بے چاری کو کیا پتا کہ وہ رسیاں تڑا رہا ہے یا زنجیریں۔ وہ اتنی جہاں دیدہ بھی نہیں اور آپ نے اسٹیج پر اس کی حرکتیں دیکھی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا۔ کس کے تھپڑ رسید کروں۔ بڑا ہے تو کیا ہوا۔ انسانیت تو ہونی چاہیے۔ دلہن نے کیا جرم کیا تھا جو وہ اس قدر بیزاری ظاہر کر رہا تھا۔ ارے سب دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ مذاق اڑا رہے تھے۔ اسے تو مووی والے کا بھی خیال نہ تھا۔ جسے محض کرائے پر بلایا گیا تھا۔ دنیا دکھاوے کو ایک دفعہ ہی موڈ ٹھیک کر لیتا۔ اتنے لوگوں میں اپنا

تماشا بنایا۔ خود ہی ذلیل ہوا۔ دیکھیے گا۔ کیسا چرچا ہوتا ہے خاندان میں۔''

جمیلہ آپا بھونچکا سی کھڑی گوشی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو جوش میں تھی یا بے حد مشتعل۔ اس نے میری آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ لیے تھے۔ یا چہرے پر پھیلی مایوسی کی تاریکی۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ گھر میں شاید مہمان کم رہ گئے تھے۔ آوازیں ہی نہیں تھیں۔ میں بھی سونے کی تیاری کرنے لگی۔ اب مجھے کسی کا انتظار نہ تھا۔ میں تو تنہا ہی تھی۔ ایک اپنا تھے جو دولت کمانے ڈنمارک جا چکے تھے۔ انہیں بھی مجھ سے زیادہ بیوی عزیز تھی۔ جوان کے ہمراہ تھی۔ انہیں بیٹی کی نہیں بیوی کی ضرورت تھی۔ بیٹی کو وہ انجان لوگوں کے سپرد کر گئے۔ یہ جانے بغیر کہ وہ کیسے ستم گر ہیں۔ بند آنکھیں آبشار بہانے لگیں۔ پتا نہیں اب آنسو کیوں بے قابو ہو گئے تھے۔ میں پہلے آنسو کب بہاتی تھی۔ شاید بہادر تھی۔ اب کمزور۔ یا بزدل ہو گئی تھی۔ ابا کی دوری نے یہ دن دکھائے تھے۔

گوشی کہیں قریب ہی رہتی تھی۔ صبح شام چکر لگاتی۔ اس کی امی بھی کئی بار آئیں۔ وہ بھی مہربان خاتون تھیں۔ خالہ صغریٰ جیسی۔ دونوں میں بہنا پے کے علاوہ دوستی بھی تھی۔ پرانی دوستی۔ جمیلہ آپا کئی دن رہیں۔ پھر گوشی کو ہدایات دے کر سسرال چلی گئیں۔

☆☆

رضوان ولیمے کے اگلے روز پنڈی چلے گئے۔ انہوں نے مجھ سے ملنا گوارا نہ کیا۔ صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے تو ملنا کیسا۔

جس دن وہ جا رہے تھے۔ گوشی نے انہیں پکڑ لیا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں انہیں لے آئی۔ پہلے تمہید باندھی۔ پھر میری تعریف کی۔

''سنو گوشی! کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ زندگی گزارنے کے لیے حسین چہرہ کافی ہے؟ کیا یہ کامیاب زندگی کی ضمانت ہو سکتی ہے؟''

''میں یہ تو نہیں کہتی رضوان بھائی! کہ یہ کامیاب زندگی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گی۔ وہ معصوم ہے۔ کم سن ہے۔ مگر سمجھ دار ہے۔ کیئر و مائز کر سکتی ہے۔''

''وہ؟ وہ بچی۔ جو مجھ سے عمر میں پندرہ برس چھوٹی ہے۔'' نہایت استہزائیہ انداز میں بولے۔ تلخ ہنسی کے ساتھ۔ ''وہ میرے جذبات کو کیا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تو کیئر و مائز کیا کرے گی اور تم بتاؤ۔ اس زبردستی کی شادی میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے میری مرضی کا رشتہ نہ ملنا کیا؟ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ.... ایسے ہوگا۔ امینہ خالہ نے اماں کو پھانس لیا۔ اماں نے مجھے قربانی کا بکرا بنا دیا۔ میں امینہ خالہ کو معاف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنے مفاد کے لیے میرے خلاف سازش کی۔''

''مانتے ہو کہ اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہیں۔''

''مانتا ہوں۔ مگر میری طبیعت اس کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ جس طرح میرے ارمان بائی چیک

ہوئے- اس کا کچھ تو ردعمل ظاہر کرنا ہے مجھے- تم یقین کرو- میں ایک ایسی آگ میں گھر چکا ہوں جس کے شعلے بلند ہو رہے ہیں خاص طور پر جب کوئی اس پر چھینٹے ڈالنے کی کوشش کرے- اس لڑکی کے حوالے سے میں مزید مل اٹھتا ہوں-''

''تو تم انکار کر دیتے صاف- کیا مجبوری تھی- جلتے رہنے سے بہتر تھا- اسے تو کوئی اور رشتہ مل ہی جاتا- بلکہ امینہ خالہ کسی اور کو پھانس لیتیں-''

''بس- اماں نے مجبور کر دیا اور اب پچھتاتا ہوں-''

''ماں کی رضا کے لیے کیا تھا نا اقرار- تو اسے نبھاؤ بھی- شادی کو انتقام نہ بناؤ- ماں کی خاطر ہی سہی- صبر سے کام لو یہی تمہاری قسمت میں تھا-''

''ہاں انتقام ہی لے رہا ہوں- خود سے- میں قسمت کا منکر نہیں- مگر صبر کیوں کروں- کیا مجبوری ہے مجھے؟ اماں کی خاطر یہ جوا گردن میں ڈالا ہے- کبھی بھی اتار پھینکوں گا-''

لہجہ مشتعل- آواز سرد- گوشی جانتی تھی' اس کمرے کی ہر آواز میرے کمرے تک بخوبی سنائی دیتی ہے- شاید وہ جان بوجھ کر رضوان کو وہاں گھیر لائی تھی تاکہ میں ان کے خیالات خود سن لوں- یا اس لیے کہ اس کمرے کے سوا کہیں تنہائی نہ ملتی- رضوان بھی نہ ملتے- نہ وہ کھل کر اظہار خیال کرتے-

صغریٰ خالہ کو میں اماں کہنے لگی- ان کی خواہش پر- گوشی کو گوشی آپا- کہ وہ مجھ سے کئی سال بڑی تھیں- ان کی امی کو میں خالہ جان کہتی- جمیلہ آپا کی طرح-

اس گھر نے مجھے بڑا سکھ دیا- اماں کی محبت- جمیلہ آپا کی چاہت- گوشی آپا کا تعاون نہ ڈانٹ نہ مار- عیش ہی عیش- میں خوش کیوں نہ ہوتی- جسے ماں نے مامتا کے نام پر اذیتیں دیں اور باپ نے بے خبری کے ریکارڈ قائم کیے-

☆☆

ابا کا خط آیا تھا- انہوں نے صغریٰ خالہ اور رضوان کی بہت تعریف لکھی تھی اور مجھے ہدایت کہ میں ان کی خدمت میں دن کو دن سمجھوں- نہ رات کو رات' ہر پل ان کی خوشنودی کے لیے کمربستہ رہوں- دوسرا کوئی راستہ تو میرے سامنے ہے بھی نہیں ابا- میرے تو سارے راستے آپ بند کر گئے- ابا نے لکھا تھا کہ خدمت میں عظمت ہوتی ہے- ان لوگوں کی خدمت کا صلہ تمہیں خوشی کی صورت میں ملے گا-

واقعی میں خوش ہوں-

کوئی دو ماہ گزرنے کے بعد رضوان اماں کے تقاضوں پر آئے- اماں بہت خوش تھیں- انہیں اپنے بیٹے کی سعادت مندی پر بڑا ناز تھا- مجھے خاص ہدایت کی کہ میں اچھے کپڑے پہن کر تک سک سے درست رہوں- رضوان ماں بہن کو بھی بزے حلیے میں پسند نہیں کرتے- ان کی خواہش

کے مطابق بری کا سب سے ہلکا سوٹ پہن لیا- جس کے گلے آستین پر کام بنا ہوا تھا- گو کہ مجھے اس سوٹ میں گرمی لگ رہی تھی- مگر اماں کو میں بڑی پیاری لگ رہی تھی- ان کا خیال تھا کہ رضوان کے بھی یہی جذبات ہوں گے-

رضوان کے دوست آئے ہوئے تھے- میں چائے بنانے لگی- اماں بیٹے کی پسند کا کھانا تیار کر رہی تھیں- رضوان چائے لینے آئے- چائے کے ساتھ نمکو وغیرہ تھا- چمچیں میں نے بنا دیے تھے- کباب تل کر رکھ رہی تھی- ایک نظر ڈال کر بولے-

''اماں! کوئی میٹھا نہیں ہے؟''

''ہاں ہے تو' تمہارے لیے بنا کر رکھا ہے- لا دیتی ہوں تھوڑا سا-'' اماں باہر چلی گئیں کمرے سے حلوہ لانے کے لیے-

میں نے ٹرے میں کباب رکھ دیے- رضوان ٹرے اٹھاتے ہوئے گردن ذرا سی میری جانب موڑ کر دھیمی آواز میں بولے-

''دلہن بننے کا بہت شوق ہے- دیکھ لیا میں نے- اب اس سنگھار کو بند کر دو- اگلی شادی پر کام آئے گا-''

میں نہ سمجھتے ہوئے بھی- اس مفہوم کو بیزاری اور نفرت کے اظہار کو خوب سمجھ گئی تھی- پھر بھی نہ جانے دل کیوں اس قدر زور سے اچھلا کہ ایک قدم پیچھے ہٹی- رضوان نہ جانے کس طرح مڑے کہ میں ٹکرائی- دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں- ان کے قدم دروازے سے باہر اور میں لڑکھڑا کر سنک سے ٹکراتی ہوئی دھڑام سے زمین پر' دیوار سر میں لگی تھی- یا کیا ہوا کہ ایک لمحے کو آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا- دروازے ہی سے ان کی آواز آئی-

''ڈرامے خوب کر لیتی ہو- امینہ خالہ کی ٹریننگ ہوگی-''

میں چکراتے سر کو تھام کر اٹھی- پھر آنکھوں تلے تارے چمکے- اندھیرا آیا اور بمشکل اٹھ کر دیوار کا سہارا لیا- کمرے میں جا کر اتارے ہوئے کپڑے پہنے- ریشمی جوڑا- پہلے ہی بدن پر چبھ رہا تھا- اب تو اس میں کانٹے اگ آئے تھے- بلکہ سانپ بھی سرسرانے لگے تھے- اسے اتار کر بکس میں رکھ دیا- پھر کبھی نہ پہننے کے عزم کے ساتھ اور سر تھام کر بیٹھ گئی-

صحن سے اماں کی آواز آئی تو اٹھ کر کچن میں آ گئی- برتن دھوئے- سالن اماں نے تیار کر دیا تھا- میں پھلکے ڈالنے لگی- میں کھانا پکانا نہیں جانتی تھی- اماں سکھا رہی تھیں- مگر بیٹے کے لیے خود آ گئی تھیں کچن میں- اماں اور رضوان ساتھ ہی آئے- مجھے دیکھ کر اماں نے قدرے ناگواری سے کہا-

''اچھے بھلے کپڑے اتار کر پھر پرانے پہن آئیں- اچھے لگ رہے تھے یہ کپڑے بکس میں بند

رکھنے کے لیے نہیں ہیں- بیٹا! بڑوں کی بات مان لینا چاہیے- تم نے میرے کہنے پر پہنے تھے- مجھے خوشی ہوئی تھی- کیا بس دکھانے کے لیے پہنے تھے-''

''نہیں اماں! وہ برتن دھونے میں خراب ہو رہے تھے اس لیے-''

میری آواز تکلیف کے باعث رندھ گئی- رضوان نرے رکھ کر جانے لگے تو اماں ان سے مخاطب ہو گئیں-

''ارے چل نہ دینا دوستوں کے ساتھ- کھانا تیار ہے کھالو-''

''کہاں جا سکتا ہوں اب-'' رضوان چڑ کر بولے-

''ہاں تو اتنے دن بعد آئے ہو- میرا دل چاہتا ہے میری نظر کے سامنے رہو- گھر میں دلہن ہے- اس کے ساتھ ہنسو بولو- اتنے دن خاموشی میں گزارے ہیں میں نے- اب رونق چاہتی ہوں-''

''دیکھتی رہتی ہوں گی روز ڈرامے-'' تلخ اور طنز میرا حلق کڑوا ہو گیا-

''میں نہیں دیکھتی ڈرامے- نہ اس بے زبان کو ایسا شوق ہے- یہ تو کام سے لگی رہتی ہے- کہیں جاتی بھی نہیں- آج تم اسے چچا سے ملوالاؤ- قید ہو کر رہ گئی ہے- میری تو ہمت نہیں ہوتی کہیں جانے کی- بیٹا اب اسے خوش رکھنا تمہارا فرض ہے- اس کے ماں باپ بھی پاس نہیں کہ میکے ہی چلی جائے- کبھی ادھر ادھر گھمالایا کرو-''

رضوان نے کہا- ''اچھا-'' اور چلے گئے-

اماں ان کے پیچھے چلی گئیں- شاید مزید نصیحتیں کرنے- میں اماں کے کمرے میں آ کر ان کے کرتے کی تراپائی کرنے لگی- سر میں اب تک درد تھا- میں ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی- دل نہ چاہتے ہوئے خود کو مصروف کرنا- مگر کیا کرتی-

اماں کچھ ہوتی ہوئی اندر آئیں- پھر گھبرا کر چیخیں-

''ارے بچی! یہ کیا ہے؟'' اور میری طرف لپکیں میں گھبرا کر مڑی-

''کیا ہے اماں؟''

اماں نے میری گردن تھام لی- ''یہ..... یہ خون کہاں سے آیا؟'' ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی- میں نے گردن پر ہاتھ پھیرا- تو انگلیاں خون سے بھر گئیں- دوسرے ہاتھ سے سلائی دور کی-

اماں خون کا منبع تلاش کرتے ہوئے رضوان کو بلا رہی تھیں- وہ اماں کی چیخ سن کر آئے- پھر دونوں ماں بیٹے زخم تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے- جوسر کے پچھلے حصے میں تھا- اماں اصل ریشم کا ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ لائیں رضوان میرے لمبے گھنے بالوں کو برا بھلا کہتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے- بال کاٹ کر زخم میں ریشم کی راکھ بھری- اس پر پھٹکری پیس کر چھڑکی- پھٹکری زخم پر لگی تو چکر آ گیا-

''ارے- یہ زخم کہاں سے لگا- لڑکی! کچھ بتاتو سہی-''

''میں گر گئی تھی- وہاں- شاید تب ہی مجھے پتا ہی نہیں چلا اماں-''

''ہونہہ! ڈرامہ باز-'' زیر لب کہہ کر رضوان کمرے سے نکلے اماں میرے پیچھے پڑ گئیں- ہدایتیں مسلسل ہدایتیں- انہوں نے پٹی باندھ کر مجھے بستر پر لٹا دیا-

''آرام کرو- ہلنا نہیں اب- غضب خدا کا- سر کھل گیا- خون کے دریا بہہ گئے اور اتنی بے خبری-''

میری ہمدرد ماں جی- کیا بتاؤں- کیسے کیسے زخم کھا چکی ہوں- دل جلا ہے- جذبات راکھ ہوئے- میری تو ساری حسیں میری ماں کے سلوک نے سلب کر لی ہیں- روح پر چرکے لگائے تھے- تب ہی تو عاری ہو گئی احساس سے- اب تو کچھ سکون ملا ہے- ضبط کی عادت پڑ چکی ہے- مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکی- اماں نے ایک گولی بھی کھلا دی غالباً درد روکنے کی- اس نے بھی مدد کی- مجھے نیند آ گئی-

گوشی آپا کافی عرصے سے نہیں آئی تھیں- اس دن آ گئیں- زخم کے بارے میں سوالات کیے- پھر آنکھیں چمکا کر بولیں-

''بہت دن کے بعد آئی ہوں- پوچھو گی نہیں وجہ-''

''ہاں- بتائیں-''

''بھئی منگنی ہو گئی ہے میری- شرم آتی تھی مجھے تم سے مل کر- تم مجھ سے سات سال چھوٹی ہو اور شادی شدہ- مجھے کم از کم منگنی شدہ تو ہونا چاہیے تھا- سو وہ میں نے کر لی- اب بے دھڑک مل سکتی ہوں- کہو کیسی رہی-''

کافی خوش تھیں- میں نے مبارکباد دی- شادی کے بارے میں دریافت کیا- بولیں-

''شاید اگلے چھ ماہ تک- دراصل شادی بھی ہو جاتی- مگر میرا جو بھائی ہے نا بھائی اس کے زبردست قسم کے امتحان ہو رہے ہیں- وہ ان سے فارغ ہو گا- تب شادی ہو گی-''

''چھ مہینے تک امتحان ہوں گے؟''

''اوہ نہیں بھئی- دراصل وقفے وقفے سے ہوتے رہیں گے اور وہ پڑھائی میں جتا رہے گا- پڑھا کو ہے زبردست-'' گوشی آپا کی زبان پر جیسے شہلا لگا تھا بھائی کے ذکر پر-

''آپ سے چھوٹا ہے؟''

''نہیں- برابر ہے-'' انہوں نے چٹخارا لے کر کہا- ''بڑی مزے کی باتیں کرتا ہے-''

وہ مسلسل اس کا ذکر کرتی رہیں' آخر میں بتایا کہ وہ ان کا جڑواں بھائی ہے- مجھے ہنسی آ گئی-

رضوان نے صحن سے ہی آواز لگائی- ''چار کپ چائے چاہیے-'' میں اٹھنے لگی-

گوشی آپا نے سختی سے روکا دروازے پر جا کر کہا- ''بنا لو جا کر-''

''کیوں- میں کیوں بناؤں- وہ ایک کارگزار خاتون بھی ہوتی ہیں گھر میں-''

''خالہ جی پڑوس میں گئی ہیں- مجھے بٹھا گئی ہیں- میں چائے نہیں بناؤں گی- اپنے گھر میں بھی کام- اگلے گھر بھی واہ ہم مہمان ہیں-''

''میں ان کا ذکر کر رہا ہوں- جو تم آرام ہیں-''

''وہ- محو آرام صابحہ کے سر کا زخم کھل جانے کا ڈر ہے- اس لیے خالہ جی قسم دے گئی ہیں- ویسے کبھی کبھار ہاتھ ہلانے میں حرج نہیں ہے- نہ ہی ذلت ہے- بنالو چائے-''

پھر گوشی آپا صحن میں چلی گئیں- کچھ دیر رضوان سے جھک جھک ہوئی- مجھے پھر نیند آ گئی- رات کو آنکھ کھلی- تو اماں گرم دودھ لے آئیں- مجھے بڑی شرم آئی-

''جاؤ بیٹا! اپنے کمرے میں جا کر سوؤ-''

انہوں نے مجھے چمکار کر کہا- وہ جانتی تھیں کسی طرح میں ان کے بیٹے کا دل جیت لوں- جو ناممکن تھا- اس لیے میں چپ پڑی رہی- عزت نفس کا احساس تو تھا مجھے-

رات دیر تک اماں کمرے سے باہر رہیں- یقیناً بیٹے کو نصیحتیں کر رہی ہوں گی میں تو آرام سے پڑی سوتی رہی- میں اماں کے کمرے میں ہی سوتی تھی- وہی آدمی تھے گھر میں- الگ الگ کہاں رہتے- مجھے تو ڈر بھی لگتا تھا- صبح کو بھی اماں نے اٹھنے نہیں دیا- خود ناشتہ بنا کر لائیں- رضوان کو بھی بلا لیا- زمین پر میرے بال پڑے تھے- اماں نے اٹھا کر تاسف سے کہا-

''ہائے ظالم- اتنے سارے بال کاٹ ڈالے- بچی نے کتنے جتن سے بڑھائے ہوں گے-''

''اب بھی بہت باقی ہیں- پلنگ کے لیے رسی بٹوائیں گی؟ اور کاٹ دوں؟''

''اللہ نہ کرے- عورت کا حسن بالوں کا مرہون منت ہے- ترسا کرتی ہیں لڑکیاں کہ کیسے بال بڑھالیں- میری بہو کے بالوں کو نظر لگاتی ہیں-''

''وحشی جنگلیوں والے بالوں کو بھی نظر لگ سکتی ہے؟ اس ڈھیر کا کوئی فائدہ- زخم تلاش کرنا مشکل- مجھے تو لگا جیسے افریقہ کے جنگل میں سفر کر رہا ہوں' جنگلی جانوروں سے بچتا بچاتا- اف جہالت-'' ناگواری کے پھن پھیلے نظر آ رہے تھے ہر طرف-

''چل ہٹ نا قدرا-'' اماں پیار سے بیٹے کو ٹہوکا مار کر میرے پاس آ بیٹھیں اور لگیں میرے حسن کی تعریف کرنے- شرم سے میں بے حال ہو گئی-

اس دن رضوان واپس چلے گئے- اماں انہیں رخصت کر کے آئیں- خاصی سنجیدہ تھیں- میرے سامنے بیٹھ کر ہولے سے بولیں-

''بیٹا! حالات سے کبھی گھبرانا نہیں- نہ ہی مایوس ہونا- وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا- دکھ کے دن تھوڑے ہوں- تب بھی بہت لگتے ہیں- سکھ کی لمبی راتیں ہمیشہ بہت کم لگتی ہیں- بیٹا مجھے یقین

ہے- قدرت تم پر بھی مہربان ہو گی- دکھ کے دن آخر کار گزر جائیں گے اور تم بھی سکھ کی نیند کے مزے لوٹو گی-'' ان کی آواز بھاری ہو گئی-

''اماں! میں خوش ہوں- آپ کیوں فکر کرتی ہیں- مجھے میکے میں بھی کبھی ایسا سکھ نصیب نہیں ہوا- جتنا آپ نے مجھے دیا ہے- اس سے زیادہ کی تو میں امید بھی نہیں کرتی-''

''نہیں نہیں- جو سکھ شوہر کی ہمراہی میں ملتا ہے وہ اصلی ہوتا ہے- میں تو آج ہوں- کل کیا ہو گا- اللہ جانے تمہیں کل کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے- تمہاری جیسی بیوی ہر مرد کا ارمان ہوتی ہے- تمہیں بھی کچھ کوشش کرنی ہو گی- آگے بڑھ کر اپنا حق طلب کرو- اس میں کوئی شرم نہیں- اس سے بات کرو-''

''میں بات کروں؟'' میں کانپ کر رہ گئی ایک ہاتھ بے ساختہ سر پر چلا گیا- چوٹ-

''ہاں- تم بات کرو پتا تو چلے- وہ کیا چاہتا ہے- دیکھو باہر سے وہ جتنا سخت اور کھردرا ہے- اتنا اندر سے ہے نہیں- نرم گودا سا- بس ضدی ہے- مجھ سے تو ہر بات میں بحث کرتا ہے- اس لیے چاہتی ہوں کہ تم خود آگے بڑھو- اس سے پوچھو کہ تمہیں اپنے ساتھ کب لے کر جائے گا- شادی مجھ سے تو نہیں ہوئی کہ میں تمہیں ساتھ رکھوں-''

''اماں-'' باہر سے آواز آئی- میں جھٹ تکیے پر گر گئی- آنکھیں بند کر لیں- دل دھڑ دھڑ بجنے لگا-

''اماں! آپ بھول جاتی ہیں-'' ناگواری لہجے سے برس رہی تھی- یقیناً اماں کی گفتگو سن چکے تھے محترم- ''آپ شادی کی ذمہ دار ہیں- آپ نے ہی میری نعمتیں' خوشامدیں کی تھیں- آپ کو اپنی زبان کا در دتھا- جو آپ اپنی لاڈلی چلتر باز بہن کو دے کر پابند ہو گئی تھیں- میرا تو بس اتنا کام تھا کہ آپ کے حکم پر سر جھکا دوں- آپ جہاں بھی لے جاتیں- میں چلا جاتا- میری ذمہ داری نہیں آپ کی تھی- آپ ہی اس بوجھ کو اٹھائیں- یا گرا دیں- یا جہاں سے لائی ہیں انہیں لوٹا دیں-''

ماشاء اللہ پھول جھڑ رہے تھے- زہریلے- اماں کو جلال آ گیا- خوب ہی صلواتیں سنائیں- بیٹے کو گھر سے نکلنے کا آرڈر دیا اور اس کے عمل درآمد ہونے پر دوپٹے میں منہ چھپا کر لیٹ گئیں- آخر میں- ''آئندہ قدم منہ دھر نا میرے گھر میں-'' کا آرڈر پشت سے چپکا دیا-

☆☆

گوشی آپا کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی- اماں اور میں ان کے گھر روز چلے جاتے' اماں تو خالہ جان کے ساتھ مصروف عمل رہتیں- کبھی پینڈیاں بن رہی ہیں- تو حلوے بھونے جا رہے ہیں- رضائیوں میں پٹا پٹی کی گوٹ سی جا رہی ہے- میں بھی حتی الامکان کچھ کر دیتی- دوپٹے میں ستارے ٹانکنا- گوٹا کرن لگانا- چھوٹے موٹے کام میرے ذمے تھے-

جمیلہ آپا جب آتیں- کوئی کام نہ ہوتا' گانا ہوتا یا لطیفے' قہقہوں کی برسات برسا کر وہ چلی جاتیں- اس دن بھی وہ آئی ہوئی تھیں- مگر خالہ جان نے صاف کہہ دیا-

''آج ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والے کو کھانا نہیں ملے گا- وقت کم ہے کام کرو-''

میں تو حسب معمول دوپٹہ لیے بیٹھی تھی- جمیلہ آپا مٹر چھیلنے لگیں- پھر چھلے ہوئے دانے لے کر کچن کی طرف چلی گئیں' جاتے جاتے مڑ کر ایک آنکھ دبا کر بولیں-

''اپنی محنت کے ہیں- ابھی تل کر لاتی ہوں- سب مل کر کھائیں گے-''

یعنی جتنے مٹر چھیلے تھے وہ سب لے کر چلی گئیں- احسان جتا کر- پھر تل کر لے بھی آئیں اور ہم سب نے کام رکھ کر چمچے پکڑ لیے- جب پیالے میں مردانہ ہاتھ داخل ہوا اور مٹھی بھر دانے اٹھ گئے- تو میری نظر اٹھی- وہ مٹھی منہ میں ڈالے میری طرف دیکھ رہا تھا- کچھ حیران سا- اسی وقت جمیلہ آپا اٹھ کر باہر چلی گئیں- ان کے جاتے ہی گوشی نے لڑکے کے کندھے پر زوردار دھپ رسید کر کے کہا-

''او- بدتہذیب انسان- کھانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں- جو بچپن سے امی ابا تمہیں ازبر کرا رہے ہیں- مگر تم رہے وہی جنگلی کے جنگلی-''

''خاندان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں-'' بڑے فخر سے کہا گیا- ''جنگلی کہنے والے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں- مگر اس سے پہلے میرا ایک سوال ہے-''

''فرماؤ- وحشی-''

''یہ.... تمہاری کون سی دوست ہے یہ سامنے' نمبر سے بتانا- ساٹھ عدد سے تو میں واقف ہوں-'' انداز بڑا لاپروا تھا-

''یہ میری عزیز ترین بہن ہے- بس اتنا تعارف کافی ہے فی الحال-'' گوشی نے بھی ادائے بے نیازی سے کہا- ''اور اب یہ پیالہ اٹھا کر چلتے پھرتے نظر آؤ-''

''اتنی بے دردتو نہ بنو آپا-'' کراہ کر کہا گیا- یہ یقیناً گوشی کا وہ بھائی تھا جس کی آمد پر گوشی کی شادی ٹھہرنی تھی- ''کچھ دیر اپنے کمرے میں ہمارا وجود برداشت کر لو-''

''جی نہیں- ایسی بے تکلفی کی گنجائش نہیں ہے-''

''میں تو تمہارے کمرے کو زیارت گاہ سمجھتا ہوں- بڑا ادب کرتا ہوں- پلیز آپ میری مدد کریں- اتنی دور سے چل کر آیا ہوں-''

وہ مجھ سے مخاطب تھا اور میں پریشان ہوگئی- گوشی نے اسے دھکے دے کر نکالا- اس دن کے بعد وہ روز ہی گوشی آپا کے کمرے میں ملتا اور دھکے دے کر ہی نکالا جاتا-

آخر گوشی آپا رخصت ہو کر پنڈی چلی گئیں- جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئیں کہ وہ پنڈی جا کر

رضوان کا پیچھا کریں گی-

جمیلہ آپا شادی میں اپنے دیور کے لیے لڑکیاں دیکھتی رہیں- دیور کو بھی دکھاتیں- پھر بڑبڑاتیں-

''لو بھلا- پہلے کہتا تھا- بڑی آنکھوں والی ہو- بڑی آنکھوں والی دکھائی- تو لمبے بالوں والی کی شرط رکھ دی- آج کل لڑکوں کے بال تو لمبے ہو سکتے ہیں- لڑکیاں تو گدھیاں صاف کرا رہی ہیں- بھلا بتاؤ-''

مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور گوشی آپا کے ولیمے میں دیور کے ساتھ پنڈی چلی گئیں- مگر مطلوبہ لڑکی مل کر نہ دی-

☆☆

وہ رضوان سے مل کر آئی تھیں مگر مجھے کچھ نہیں بتایا- اماں سے سرگوشیاں کرتی تھیں- اماں کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی- پتا نہیں موسم کی وجہ سے یا فکریں کر کر کے-

جمیلہ آپا روز آنے لگیں- علاج' دوا وغیرہ میں ان کی مرضی اول تھی- ان کا دیور فرخ بھی ساتھ آتا- وہ ڈاکٹر کو بلانے- دوائیں لانے- کلینک کے چکر لگانے وغیرہ میں گھر کی ضرورتیں پوری کرتا- مجبوری تھی- میں تو اماں کے قریب بیٹھی رہتی-

فرخ بھی بہانے بہانے کمرے میں آتا- میں دوسری طرف منہ موڑ لیتی- وہ ادھر بھی آ جاتا- اس کی تیز نظریں مجھے اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہوتیں- اس کا مذاق بھی زہر لگتا مجھے جبکہ جمیلہ آپا قہقہے لگاتیں- ان کی گفتگو عموماً لڑکی کی تلاش کے بارے میں ہوتی- فرخ لڑکیوں کی شکل صورت پر نکتہ چینی کرتا- اماں سے گواہی لینا چاہتا- اماں کی طبیعت خراب تھی- وہ بھی بیزار تھیں- گوشی آپا سسرال سے آئیں تو اماں کو دیکھنے آئیں- فرخ موجود تھا- وہ مجھے الگ لے جا کر بولیں-

''سخت ناقابل اعتبار ہے یہ شخص- کبھی گھر میں اکیلی ہو تو دروازہ ہرگز نہ کھولنا- باہر کے باہر ٹرخا دینا- خالہ جی کی بیماری نے تمہیں تنہا کر دیا ہے- محتاط رہنے کی ضرورت ہے- ورنہ رضوان کا شک کہیں اور گہرا نہ ہو جائے-''

میں چونکی- ''شک گہرا.... کیا انہیں مجھ پر شک ہے؟''

گوشی آپا کے منہ سے بے ساختہ جملہ نکل گیا تھا- وہ بھی پریشان ہوگئیں- ''ہاں-'' نظریں چرا لیں- ''پنڈی میں میری بات ہوئی- وہ کہتا ہے کہ خالہ امینہ نے کسی وجہ سے شادی میں جلدی سے کام لیا اور پھر میاں بیوی رفو چکر ہوگئے- جبکہ امینہ کے تم سے پیار کے ڈنکے پٹ رہے تھے- کوشش کرتے تو- خالو ساتھ لے جا سکتے تھے تمہیں- میں نے تم پر خالہ کے ستم کا بتایا- اسے یقین

نہیں آیا- یہی کہا کہ کوئی وجہ تو ہوگی ورنہ کون کسی سے غیر انسانی سلوک کرے گا-''

میں گونگی آپا کو دیکھتی رہی- دل رک رک کر جلنے لگا تھا اور دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی- یہ ایک نئی بات- پہلی بار سنی تھی اور ایسی بات سن کر گنہگار بھی بے چین ہو جاتا ہے- تو رضوان کی مجھ سے نفرت کی یہ وجہ تھی؟ یا اس کے بلند معیار خیالات ارمان اور آدرش کی ناکامی نے مجھ کو ہدف انتقام بنانا ضروری سمجھا تھا اس شخص نے لیکن میری ذات- بہرحال کسی پہاڑی کی اونچی چٹان پر ایستادہ تھی- جس کے تین طرف خوفناک کھائیاں تھیں- ہوا کا تیز جھونکا بھی- لڑکھڑانے کی گنجائش بھی نہ تھی- ابھی تک تو میں امن چین کے جھولے میں تھی- اب پتا چلا' یہ خواب ہے اور ذرا قدم بہکا- بلکہ ہوا نے بھی اشارا کیا تو میں کھائی میں گر پڑوں گی- میرے محافظ خود دھکا دے دیں گے-

اب مجھے اماں کی پناہ کی قدر ہوئی اور زیادہ ہی اہمیت- اللہ ان کو زندہ رکھے اور وہ کبھی مجھ سے بدظن نہ ہوں- ہر نماز کے بعد میں ان ہی کی صحت کی دعا مانگا کرتی- میں نے خود ایک بار اپنے زخموں کے داغ انہیں دکھا دیے تھے اور اپنی خطاؤں کی تفصیل بھی- اماں نے اسی وقت مجھے گلے لگا کر کہا تھا-

''اس کٹنی کو کبھی ماں نہ کہنا- میں ہوں تمہاری ماں- کم بخت' ظالم جادوگرنی-''

اماں اسی لیے رضوان سے خفا تھیں کہ انہیں میرے دکھوں اور محرومی کا احساس تھا نہ یقین-

☆☆

آخر اماں کو میری خدمت' لگن اور دعاؤں نے صحت یاب کر ہی دیا- اب اور زیادہ ان کا خیال رکھتی کہ پھر نہ بیمار ہو جائیں-

یں- گھر میں عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا- اماں رشتے داروں اور محلے والوں میں بہت مقبول تھیں-

جمیلہ آپا نے مجھے مشکل میں دیکھا تو اتنی مہربانی کی کہ ایک بوا کو لے آئیں- بوا دن میں کسی کے گھر کھانا پکاتی تھیں- اس لیے میرے پاس وہ سہ پہر کو آتیں- لوگ بھی عموماً شام کو آتے تھے- بوا چائے وغیرہ بنا لیتی تھیں- مجھے بڑا آرام اور سہولت ہوگئی- رات کو وہ یہیں رہتیں- صبح ناشتہ بنا کر چلی جاتیں-

اب جمیلہ آپا کا چکر کئی دن بعد لگتا- مگر فرخ روز آ جاتا- یہ بھی شکر ہے کہ اماں بات چیت کرنے لگی تھیں اور شام کو بوا بھی ہوتی تھیں- تو میں اس کا سن کر کمرے میں چلی جاتی تھی-

اس دن بھی وہ آیا ہوا تھا- میں اپنے کمرے میں لیٹی تھی- اچانک رضوان کو سامنے دیکھ کر حیران ہو کر اٹھی- ان کے چہرے پر کبیدگی کے آثار تھے- بیگ نیچے پٹخ کر کہا-

''یہ کیوں آتا ہے اب؟''

''جی؟'' میں سمجھ گئی تھی مگر گھبرا گئی-

''بناوٹ کی ضرورت نہیں- فرخ کیوں آتا ہے؟'' (اس سے خود پوچھنا تھا- میں کیا بتاؤں)

''چائے لاؤ-''

حکم دے کر باتھ روم میں گھس گئے- خدا کی شان- آج تو مخاطب بھی ہو رہے ہیں- گھر آئے مہمان کے بارے میں استفسار بھی ہو رہا ہے- چائے کا آرڈر بھی- شاید اماں کی علالت کا سن کر آئے ہوں گے- حالانکہ ان کی آمد اتنی ضروری نہیں تھی- خیر اگلے دن ہی آمد نزول کی وجہ معلوم ہوگئی-

''مجھے شادی کے لیے تمہاری اجازت چاہیے تحریری اجازت-''

دوٹوک انداز تھا- میں واقعی ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگی- بے ارادہ- کیا میری اتنی حیثیت ہے؟ میرے علم میں لائے بغیر بھی یہ کام کر سکتے تھے- بلکہ علم ہونے کے بعد بھی- بھلا میں کیا کر لیتی- اماں نے مجھے پاس بٹھا کر چپکے چپکے سمجھایا-

''دیکھو خبردار- رضوان کچھ بھی کہے- جواب نہ دینا- کوئی کاغذ دے دستخط نہ کرنا- ابھی میں زندہ ہوں- دیکھتی ہوں- کیسے وہ من مانی کرتا ہے-'' اماں خاصی پریشان تھیں-

میں نے انہیں سہارا دے کر لٹایا-

''اماں! آپ فکر نہ کریں- آپ کے بیٹے آپ کے فرماں بردار ہیں- کیوں پریشان ہوتی ہیں-''

''کہتا ہے- تم یہیں رہو گی- وہ وہاں- ارے میری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ دندناتی ہوئی آ جائے گی- یہ میرا گھر ہے- میں....میں-''

اماں کانپنے لگیں- کمزور تو تھیں' بمشکل انہیں ٹھنڈا کیا-

''اگر اس نے تم کو چھوڑا تو میں کبھی اسے معاف نہیں کروں گی- یاد رکھنا- ماں کی دعا لینی ہے تو تمہیں تمہارا مقام دینا ہوگا-''

اماں کسی طور یہ بات بھلا نہیں رہی تھیں- میں تھک گئی کہہ کہہ کر-

''اماں! میں خوش ہوں- آپ کا بیٹا اتنا بے رحم بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ دے- اماں! میرا کوئی نہیں آپ کے سوا-''

میرا اندازہ کتنا غلط تھا- شاید وہ بے رحم نہ بھی ہوں- مگر معاملہ ان کی پسند کی شادی کا تھا- ہر شخص کو اپنی خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے- رضوان کا کیا قصور کہ ان سے ان کا حق بہ جبر چھین لیا گیا- اب جب ان میں اتنی ہمت پیدا ہوئی اور ان کی آئیڈیل لڑکی بھی مل گئی- تو بھلا مجھ جیسی کمزور ہستی کی فکر کیوں ہوتی اور میں مقابلہ بھی تو نہیں کر سکتی-

رات کو کچن ہی میں اسٹول پر بیٹھ کر وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے بارے میں بیان داغنے لگے- ان کو آئزہ کی شکل میں دل پسند شریک حیات مل رہی تھی- ایڈوانس اعلیٰ تعلیم یافتہ- سرمایہ دار باپ کی بیٹی- یہی تو ان کا ارمان اور آرزو تھی- میں ان کے ساتھ چل ہی نہیں سکتی تھی- جاہل.... مفلس کی بیٹی- جسے محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز بھی نہیں- بھلا رضوان- جو سوسائٹی کے دلدادہ اور ہائی کلاس سوسائٹی کا فرد بن کر بہت اوپر جا رہا جا رہے تھے- ان کا میرے ساتھ کیا جوڑ تھا- مگر ان کی اماں نے سادگی میں سمجھا ہی نہیں- جانا ہی نہیں-

''میرے کمرے میں کاغذات رکھے ہیں- دستخط کر دینا یا انگوٹھا لگاؤ گی؟'' جاتے جاتے مڑ کر طنز سے فرمایا- ''بہرحال میں یہ کاغذات مکمل کروا کر آج ہی لے جانا چاہتا ہوں- نہیں کل' کل شام تک-''

میں کھانا پکاتی رہی- اماں نے سختی سے منع کیا تھا- خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی- اماں کو کھانا دے کر خود کھا لیا- رضوان کے لیے کچن میں ہی ڈھانک کر رکھ دیا- وہ گھر میں نہیں تھے- پھر انتظار کیے بغیر اماں کے پاس جا کر سو گئی- بوا کی وجہ سے آسانی تھی- دروازہ انہوں نے کھولا ہوگا- اماں تو چاہتی تھیں کہ میں اپنے کمرے میں سوؤں- شاید رضوان کو کسی چیز کی ضرورت ہو میں اتنا تو جانتی تھی- انہیں ہر چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے- علاوہ میرے-

☆☆

میلے کپڑے کافی جمع ہو گئے تھے- میں انہیں اکٹھا کر کے صحن میں بنے کھرے میں مشین فٹ کرنے لگی- جمیلہ آپا بولتی ہوئی داخل ہوئیں- رضوان کے ساتھ- تعجب ہوا- صبح ہی جا کر لے آئے- حالانکہ بہن کی انہیں خاص چاہت نہ تھی-

جمیلہ آپا مجھے نظر انداز کر کے اماں کے کمرے میں چلی گئیں- میں کپڑے مشین میں ڈال کر کچن میں گئی- کھانے کی تیاری بھی کرنی تھی- گوشت بنری نکال کر مسالا تیار کیا پھر صحن میں آ کر کپڑے مشین سے نکالے- بالٹی میں ڈال کر کھنگال رہی تھی تو رضوان غصے میں بھرے آئے-

''کہا بھی تھا کہ لکھنا نہیں آتا تو انگوٹھا لگا دینا-'' لہجے میں تندی اور عجلت کا تاثر تھا-

''مجھے کسی باور چن یا دھوبن سے دلچسپی نہیں ہے- یہ کام تنخواہ دار لوگ کرتے ہیں- آیا سمجھ میں سیدھی طرح دستخط کرو- یہ بھی اماں کی ضد پر چاہتا ہوں- ورنہ ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دوں- کر سکتا ہوں یہ بھی- مگر اماں کا لحاظ ہے- میرا احسان مانو-''

میں اپنی جگہ ساکت ہو گئی- احسان' ایک بار پہلے بھی کسی موقع پر انہوں نے مجھ سے شادی کرنے کا احسان جتایا تھا- میں اپنی جگہ سے ہلی نہیں- تو ایک ٹھوکر لگائی- گالی بھی دی- میں کھرے کی منڈیر پر بیٹھی تھی- بے خبری میں لات کھا کر بے ڈھب گری- لوہے کی بالٹی کا کنڈا میری کنپٹی پر

لگا- کان جھنجھنا گیا- شاید چیخ بھی نکلی مگر میں نے آواز دبا لی- بچپن سے جس ضبط کی تربیت ملی تھی اس وقت اسی سے کام لیا- ورنہ اماں اور جمیلہ آپا دونوں کو میری تذلیل کا علم ہو جاتا-

بالٹی کا پانی سب میرے اوپر گرا- بمشکل کان دبا کر اٹھی تو چکر آ گیا- کچھ دیر اسی کیفیت میں درد برداشت کرتی رہی- پھر اٹھ کر کچن میں آ گئی- کمرے سے جمیلہ آپا کے قہقہے سنتے ہوئے سوچنے لگی- کیا کروں کس سے کہوں- اماں منع کر رہی ہیں اور رضوان کو جلدی ہے- کاش گوشی آپا آ جاتیں- جمیلہ آپا صحیح مشورہ نہیں دیں گی- انہیں بھائی عزیز ہوگا-

وقت گزاری کے لیے کھانا پکانا شروع کر دیا- کپڑے ابھی ویسے ہی کچھ دھلے' کچھ بے دھلے پڑے تھے اور میری ہمت نہ تھی کہ انہیں پھیلا دوں- اپنی قسمت پر افسوس کر رہی تھی- میرا کوئی ہمدرد نہ تھا اماں اور گوشی آپا کے سوا-

اماں تو اپنا بھگتان بھگتنے پر مجبور تھیں- گوشی آپا کا خلوص واقعی قابل تعریف تھا- ابا تو شاید بھلا چکے تھے مجھے- یہاں ہوتے تو انہیں پکارتی- وہ بھی خیر خبر لے ہی لیتے-

اماں کا پرہیزی کھانا تیار تھا- وہ جلدی کھا لیتی تھیں-

میں کھانا لے کر گئی تو باہر ہی سے جمیلہ آپا کی آواز کان میں پڑی-

''ہمیں اس نام نہاد شادی سے کیا ملا؟ ہوا کچھ حاصل؟ رضوان کی پسند کی ایک چیز نہیں- جہیز کا سرے سے دھانگا نہ ملا- گھر پلاٹ کچھ تو دیتے خالو- نقد ہی دے دیتے اور نہیں تو امینہ خالہ ایک موٹر سائیکل ہی سلامی میں دے دیتیں- خیر چھوڑیں- لالچ نہیں ہے ہمیں- مگر رضوان کو خوشی تو ملتی- یہ بھی نہیں- اب آئزہ کا جہیز تو ایسا ہوگا کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی لوگوں کی- اچھا' اسے بھی چھوڑیں وہ پڑھی لکھی ہے- انگلینڈ میں جا کر پڑھ کر آئی ہے- یہ تو ہماری نسلیں سنوار دے گی- کوٹھی کار ملے گی اور کیا چاہیے- عزت کے لیے تو-''

میں کمرے میں داخل ہوئی تو جمیلہ آپا کی قینچی کی طرح چلتی زبان رک گئی- میں نے کھانا میز پر رکھ کر کہا-

''جمیلہ آپا' آپ کا کھانا یہیں لا دوں-''

''ہاں- ہاں- اپنا بھی لے آؤ- رضوان کا بھی- سب مل کر کھائیں گے-'' ان کا لہجہ شہد آگیں تھا-

میں کھانا لے آئی- مجھے تو بھوک نہ تھی- کپڑے بھی ڈوری پر ڈالنے تھے- میں کچھ جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی- کنپٹی میں درد ہو رہا تھا- کان سوج گیا تھا- اور گرم آگ ہو رہا تھا-

جمیلہ آپا اور فرخ کے جانے کے بعد میں برتن اٹھانے گئی- تو رضوان اور اماں میں بحث ہو رہی تھی- رضوان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر نمایاں تھا- مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا- پھر

میرے کان پر نظر جم گئی - سوجن اور سرخی پوشیدہ نہ تھی - اماں میرا دفاع کر رہی تھیں -

''چائے لے کر آؤ -'' حکم صادر ہوا -

میں چائے لے کر آئی تو اپنے کمرے میں جا چکے تھے - اف اب پتا نہیں - کیا سننا پڑے گا - زبردستی پکڑ کر دستخط کرا لیے تو؟

''یہ کاغذات رکھے ہیں - غور سے دیکھو - قلم اٹھاؤ اور -''

میں ان سنی کرتے واپسی کے لیے مڑی - انہوں نے میرا دوپٹہ پکڑ کر کھینچا - دوسرا سرا پیچھے تھا - دوپٹہ گلے میں پھندے کی طرح کس گیا - میں لڑکھڑا کر گرنے کو تھی - مگر حلق پر ہاتھ تھا - وہ خود بھی توازن برقرار نہ رکھ سکے - پلنگ پر دھم سے گرے - دوپٹہ ہاتھ سے چھوٹ گیا - میں کھانستی لمبے سانس لیتی اماں کے کمرے میں آ گئی - ابھی تک پھندا ڈھیلا نہیں ہوا تھا مگر کسا ہوا بھی نہیں لگتا تھا - پلنگ پر ہیٹھ کر ڈھیلا کیا - حلق اندر سے بالکل خشک اور خوف سے آنکھیں اُبلی پڑتی - موت کتنی قریب تھی - ایک لمحے کی دیر تھی کہ قبر کا اندھیرا.... میری آنکھوں تلے واقعی اندھیرا چھا گیا -

''کیا ہوا - کیا ہوا؟'' کہتی ہوئی اماں میرے پاس آ گئیں - پتا نہیں میرے چہرے پر کون سی تحریر پڑھ لی تھی انہوں نے - میرا ہاتھ گلے پر تھا اور کھانسی بھی آ رہی تھی - جواب دینے کے قابل میں رہی نہیں - انہوں نے پانی کا گلاس میرے منہ سے لگا دیا -

''بیٹا! شرمندہ ہوں میں شاید میں نے - انصاف نہیں کیا تمہارے ساتھ - پھر بھی میرا یقین کہتا ہے - تم کو بہت خوشیاں ملیں گی - اتنی کہ تم سمیٹ نہ سکو گی - تم نے اتنا صبر کیا ہے - جس کی ایک تمہاری عمر کی لڑکی سے توقع نہیں کی جا سکتی - میں شاید تمہارا عروج دیکھنے کو زندہ نہ رہوں - مگر مرنے سے پہلے تمہارے لیے کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کر کے جاؤں گی -''

کچھ دیر بعد ہی گلے کے اوپر کی خراشیں جلنے لگیں اور اندر سے گلا بند - آواز غائب - اماں نے کچھ دوا لگائی - کلی کروائی - مگر شاید یہ دکھوں کی انتہا تھی - ورنہ اتنی نازک تو میں نہ تھی - روئی کی سنکائی سے اوپر کی خراشوں میں درد ہوا مگر آواز نکل گئی - اماں برابر تاسف سے سر ہلاتی تھیں مگر سوال نہیں کیا -

شام کو ہنستی کھلکھلاتی جمیلہ آپا فرخ کے ساتھ پھر آ گئیں -

''چائے پینے آئے ہیں ہم -''

دونوں رضوان کے کمرے میں چلے گئے - فرخ آ کر اماں کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں مٹھارنے لگا - اس کی گندی نظروں سے بچنے کے لیے میں پھر کچن میں گئی - چائے بنانی تھی -

اب یہ چائے دو جگہ بھیجنی کس قدر مشکل کام تھا - اللہ کرے بوا آ جائیں - روز آ ہی جاتی تھیں - فرشتہ رحمت بن کر گوشی آپا آ گئیں - پہلے اماں کے کمرے میں سلام کرنے گئیں - پھر میرے پاس

آئیں -

''یہ خبیث پھر آ گیا؟ تم دھتکارتیں کیوں نہیں اسے -''

''میں؟ اور جمیلہ آپا کے دیور کو دھتکاروں؟''

''ہاں - ایسے لوگوں سے ذرا بھی رعایت گناہ ہے - دنیا بھر کا ذلیل غنڈہ -''

''اچھا اس غنڈے کو چائے تو دے کر آئیں -''

وہ بنس پڑیں اور چائے لے گئیں پھر جمیلہ آپا کی چائے بھی لے گئیں' اپنی بھی - کمرے سے ہنسی کی آواز آ رہی تھی - میں ہی اداس کو اپنی کچن میں اکیلی بیٹھی تھی - گوشی آپا بھائی انہیں لینے آ گیا - گوشی آپا کے میاں کسی کورس کے سلسلے میں تین سال کے لیے کینیڈا گئے ہوئے تھے - اس لیے گوشی آپا کا وقت میکے میں زیادہ گزرتا - جیسے قدرت نے میری دل دہی کے لیے ہی یہ موقع فراہم کیا تھا - گوشی آپا کے بھائی کا نام شیراز تھا - رازی پکارا جاتا تھا - اس کی نظر میں بڑی عزت اور عقیدت ہوتی تھی - مجھے وہ اچٹتی نظر سے دیکھ کر سلام کرتا تھا - ایسے لوگ بھی تو ہیں دنیا میں - شرافت کا پیکر - آنکھوں میں حیا - عورت کے لیے احترام -

''میں کل پھر آؤں گی - رضوان کے جانے کے بعد -'' گوشی آپا نے مجھ سے کہا -

میں نے جمیلہ آپا سے کہا - ''آپ رات کا کھانا کھا کر جایئے گا - بھائی جان بھی آ جائیں گے -''

وہ تو جیسے ریشہ خطمی ہو گئیں - مجھے گلے لگا کر بولیں -

''مجھے یقین ہے کہ تم میرے لیے اچھی اچھی ڈشیں بناؤ گی - مگر کاش کہ تم نے رضوان کا خیال کیا ہوتا - کیا بہتر نہ ہوتا؟ تمہارے لیے - سب خوش ہوتے - رضوان بھی اس طرح کونج سے بچھڑی ڈار - میرا مطلب ہے ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح اکیلا نہ ہوتا -''

وہ اسی طرح بنس بنس کر بات کرتی تھیں - میں دم سادھ کر رہ گئی - کچھ دن پہلے تک میں ان کی جان جگر آنکھ کا تارا تھی - تب آئرہ کا جہیز کوٹھی کار سامنے نہ تھی - اس لیے؟ شاید وہ بھول گئیں - وہ جب بھی آتیں - میں ان کی خاطر میں بچھ بچھ جاتی - ان کے بچوں کو گود میں لادے پھرتی - وہ جہاں جاتیں - بچے میرے حوالے ہوتے - اماں بلکہ ان پر فخا ہوتیں -

مگر جمیلہ آپا لاپروائی سے ٹال جاتیں - انہیں کبھی احساس نہ ہوتا کہ ان کے بچے سارا دن مجھے فرمائشیں کر کر کے عاجز کرتے ہیں - طرح طرح کی شرارتیں - شور شرابا - میں نے کبھی شکایت نہ کی - اس گھر میں جو محبت اور عزت ملی تھی - اس کے بدلے - میں خدمت اور سلوک ہی دے سکتی تھی - ان سب کا احسان تھا - جو مجھے اتارنا تھا -

جمیلہ آپا چلی گئیں - اماں نے کہا -

''دن کا سالن رکھا ہے - بس چاول پکا لو - میں بھی کھا لوں گی اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں -''

میں چپ چاپ لیٹ گئی- گلے میں پھر درد ہونے لگا تھا- گوشی آپا نے سرسری سا سوال کیا تھا کہ میری آواز کو کیا ہوا ہے- میں ٹال گئی- مگر مجھے ان سے دستخط کے بارے میں مشورہ کرنا چاہیے تھا- اماں تو پرامید ہیں اور دستخط کے خلاف- حالانکہ مجھے کیا فرق پڑنا تھا- وہ چار شادیاں کرلیں- میری حیثیت اپنی جگہ قائم رہے گی- قدردانی یا مہربانی اس کی امید رضوان کی طرف سے نہیں ہوگی-

چاول پکانے کچن میں آئی- ساتھ ہی رضوان بھی- پھنکارنے میں ثانی نہ تھا- میری جہالت' غربت' کم مائیگی کا ذکر حالانکہ میں خوب واقف تھی- جتانے سے فائدہ-

''میں اپنی پسند کی خوشحال زندگی کے لیے کیوں ترسوں؟ اپنے معیار کی بیوی کیوں نہ حاصل کروں- تمہارے تو یہاں بہت چاہنے والے ہیں- میرا ساتھی کون ہے؟''

پھر اماں کی چال بازی کا ذکر- ''اپنی کم عقل' بے کردار لڑکی کو میرے سر منڈھ دیا- وہ تو بازی جیت گئیں- میری زندگی جہنم بنا گئیں- اتنا کم حیثیت نہ تھا مگر-

میرے سامنے زبان کیوں چپک جاتی ہے-

دانت پیس پیس کر آدھے گھس گئے ہوں گے- آواز بھی موٹی ہو رہی تھی-''

میں پیڑھ موڑے چاول میں کنگیر چلاتی رہی اور جب چاول کا پانی نکالنے کے لیے دیگچی اٹھائی تھی- اس وقت پھر بے خبری میں دھکا لگا- میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رضوان بغیر کچھ کہے اس طرح حملہ کریں گے- نتیجہ- چاولوں کی پتیلی پوری کی پوری میرے پیر پر گری- آگ آگ کی طرح پچھلسا تھا' چیخ بھی نکلی- پھر میں ادھر سے ادھر ناچتی پھر رہی تھی- اذیت سی اذیت تھی- سچ ہے کہ ماں نے مجھے بارہا گرم چمچے سے جلایا تھا- چمٹا جلا کر چرکے لگائے تھے- چھڑی سے زخم بنائے تھے- میں نے بہت کچھ برداشت کیا- مگر وہ سزائیں میرے علم میں لا کر دی تھیں- سامنے سے- پیچھے سے وار کرنے والے بزدل ہی نہیں کمینے بھی ہوتے ہیں-

''اگر آج دستخط نہ کیے- تو چولہے میں جلا دوں گا- مر بھی سکتی ہو- سمجھیں؟''

میں نیچے بیٹھ کر پنجے سے بچے کھچے چاول صاف کرنے لگی- تیل گھول کر لگایا- اب پتا چلا- عورتیں کیوں جلائی جاتی ہیں- بزدل کمینے شوہر ہی ایسی حرکت کرتے ہیں-

مگر میں کیوں جلوں- کب تک اذیت اٹھاؤں- میرا کوئی نہیں ہے- خدا تو ہے- اب تک خدا ہی مددگار رہا- ورنہ- اف! بہت تکلیف تھی- شاید میں آرام طلب' تن آسان ہوگئی تھی- کافی دیر کے بعد لنگڑاتی ہوئی رضوان کے کمرے میں گئی اور سامنے پڑے کاغذوں پر بغیر پڑھے دستخط کر آئی اور اماں کے پاس آ کر پڑ گئی- انہیں بھی خوشخبری سنا دی- ساتھ ہی چاولوں کے گرنے کی-

رضوان بغیر کھائے چلے گئے- ہم نے ڈبل روٹی سے کام چلا لیا- رات بھر میں ہائے ہائے کرتی اور پیر پٹختی رہی- اماں نے کچھ دوائیں لگا دی تھیں- ان سے سکون تو ہوا- مگر شاید دلی اذیت زیادہ تھی کہ منہ سے ہائے ہائے نکلتی رہی-

گوشی آپا صبح وعدہ آ گئیں- پیر کے آبلے دیکھے- سوالات کیے- میں نے گردن کی خراشیں دکھائیں اور ساری بات بتا دی- وہ کچھ دیر چپ رہیں- پھر لمبا سانس لے کر بولیں-

''اچھا کیا- مگر بہتر تھا' تم علیحدگی مانگ لیتیں- جو کام اسے کچھ عرصے بعد کرنا ہے- تم خود کیوں نہ کرو- اپنی زبان سے مانگو اپنا حق-''

''گوشی آپا! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میرے کانوں لہو نہیں بدن میں والا معاملہ-

''صحیح کہہ رہی ہوں- ان حضرت کو تمہاری قدر ہے نہ فکر- سخت خود غرض انسان ہے-''

''مجھے- اپنی تو فکر ہے-'' میں رونے لگی- ''بے بس میں کہاں جاؤں گی-''

''کیوں- جو اس کا خدا ہے- کیا تمہارا نہیں-'' وہ مشتعل ہوگئیں- ''اسے عیاشی کی اجازت- تمہیں قید کیوں؟ اب آئے تو مجھے بلا لینا- دماغ درست کر دوں گی-''

مگر میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی- چھالے ٹھیک ہو گئے' اماں کی محبت وہ چند ہوگئی-

دودھ ملائی کھلا کھلا کر میرا وزن بڑھا دیا-

☆☆

اس روز میں صحن میں کھڑی تھی کہ اپنی جگہ ساکت بلکہ منجمد ہوگئی ماں چلی آ رہی تھیں- میں بے اختیار دو قدم آگے بڑھی- وہ کنکھیوں سے کترا کر ماں کی طرف ہولیں- میں متوقع نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی- ''ابا' ابا کہاں ہیں-''

ماں نے خط نکال کر دیا- ابا کا خط- بے شمار تحائف میرے لیے بھیجے تھے- رضوان کے لیے بھی امریکن ڈالر تھے کہ وہ کار خرید لیں- اماں اور جمیلہ آپا' یہاں تک کہ ان کے میاں اور بچوں کے بھی کپڑے اور دیگر تحفے- ماں خط دے کر جیسے مطمئن ہوگئیں اماں سے یوں لپک جھپک گفتگو ہونے لگی جیسے اسی مقصد کے لیے آئی ہوں-

''ارے میرے بیٹا رضوان کہاں ہے؟'' بڑی لگاوٹ سے سوال کیا-

اماں نے دورے کا بہانا بنایا- اماں بہن سے خوش نہ تھیں-

''خوش ہو؟'' یہ سوال میری ماں مجھ سے کر رہی تھی- جواب بھی خود ہی دیا- ''ارے ہاں تو خوش کیسے نہ ہوگی- کوئی ایسا ویسا تو نہیں ہے میرا رضو- ارے میں نے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگایا ہے- قدر کرکر میری بھی اور سسرال کی بھی-'' پھر وہ اسی رو میں اماں سے مخاطب ہوگئیں- ''ارے آپا! اس کے بال بچہ کیوں نہیں ہوا ابھی تک- علاج کراؤ- کہیں بانجھ تو نہیں ہے- تمہارا ایک ہی بیٹا ہے- نسل کیسے بڑھے گی-''

''خدا نہ کرے بانجھ کیوں ہوتی۔'' اماں بگڑ گئیں۔ ''اپنی بھی خبر ہے؟ بیس برس میں چوہے کا بچہ تک پیدا نہ کر سکیں۔ تمہارے میاں کو بیٹے کی آرزو تھی اور ایسا تم نے چکر چلایا کہ وہ دوسری شادی کا بھی نہ سوچ سکے۔''

واہ کیا تاک کے تیر مارے تھے اماں نے۔ میرا دل باغ باغ بلکہ گلزار ہو گیا۔ ماں بغلیں جھانکنے لگیں۔ غصہ اتارا مجھ نا تواں پر۔

''چل ادھر سے۔ دفع ہو کمینی۔ کن سوئیاں لینے کی عادت نہ گئی۔ آپا! اسے کم نہ سمجھنا۔ اس نے میرا گھر اجاڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ادھر کی ادھر لگانے میں' جھگڑا کرانے میں تیز بہت ہے۔ اسی وجہ سے میں اس کے باپ کو لے کر دور چلی گئی۔ چار پوت کی مار دوا سے۔ تب دماغ درست ہوگا۔''

اماں ایک دم سرخ پڑ گئیں۔ ''دماغ تو تمہارا جگہ سے کھسک گیا ہے۔'' وہ تیز آواز میں چیخیں۔ ''میری بہو سے بات کرتے ہوئے ذرا تمیز سیکھ کر آؤ۔ تم کو کس نے یہ حق دیا ہے کہ اس بیہودہ لہجے میں بات کرو۔ پتہ نہیں کس گھٹیا گود میں پرورش پائی ہے تم نے۔ جس نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی۔ اب تو بڑھاپا آ گیا تمہارا۔ مگر تم کتے کی دم کی طرح ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہیں۔ خبردار! یہ ایک شریف باپ کی بیٹی اور شریف گھر کی بہو ہے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس سے مخاطب ہونے کی۔ یاد رکھو کہ تم عزت نہیں کرو گی۔ تو لوگ بھی تھتکاریں گے۔ میرے گھر میں منہ بند ہی رکھنا۔ ورنہ ایک کی دس سنو گی۔''

آہ! کیا بات تھی۔ اماں کی آواز۔ شعلے برساتا لہجہ۔ میری حمایت میں۔ عزت سکھاتا گرجتا برستا لہجہ۔ اس کے بعد ماں کی کھسیانی حیران صورت۔ برسوں کی لگی آگ پر ٹھنڈی پھوار برس رہی تھی۔ من تو جیسے بلند ہو گئی تھی۔ سرشار ہو رہی تھی۔ روح کے سارے زخم صاف ہو گئے۔

''ارے واہ۔ میری بیٹی ہے۔'' ماں بہت زیادہ کھسیانی ہو رہی تھیں۔

''بیٹی کا نام ہی سنا ہے تم نے۔ دیکھا نہیں کہ کیسی ہوتی ہے۔ اس بیٹی کے جسم پر تمہارے ہاتھوں نے زخم لگائے۔ جلایا اور نہ جانے کتنے زخم اس کی روح پر لگائے ہوں گے' اس کی سہمی صورت اور گھبرایا ہوا چہرہ میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ بیٹیوں کے ساتھ ایسا سلوک ڈائنیں کر سکتی ہیں۔ عورت نہیں۔ خدا کا خوف تم کو نہ تھا۔ تو دنیا سے ہی ڈرتیں۔ تم سمجھتی تھیں' جیسے اس کے باپ کو الو بنایا ہے سب کو بنا لو گی۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ خدا پوچھے گا تم سے اپنے' تمہارے ایک ایک ظلم کا حساب لے گا۔ معصوم بے گناہ بچی کے ساتھ جو سلوک تم نے روا رکھا تھا اس کی جواب دہی کے لیے تیار رہو۔ وقت نزدیک ہے۔ توبہ ہی کر لو۔ شاید دردناک انجام سے بچ جاؤ۔''

اماں کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا اور ماں کو جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ ''ضروری ملنا ہے۔'' کہہ

کر نہ جانے کس کے گھر چلی گئیں۔

میں نے ابا کا خط اماں کو دے دیا۔ (لگے ہاتھوں یہ معاملہ بھی صاف ہو جائے) ماں رات کو آئیں تو اماں نے جواب طلبی کی۔

''کدھر ہیں امریکن ڈالر؟ رضوان کے لیے بھیجے ہیں۔ تمہیں آتے ہی دینا چاہیے تھے۔ امانت تھی اور وہ تھے۔''

ماں کا خیال تھا۔ میں ساس کو خط نہیں دکھاؤں گی۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے۔ صبح کیا کم فضیحتے سن چکی تھیں۔ رنگ اڑ گیا۔

''ڈالر چوری ہو گئے۔ تحائف کا بکس ایئرپورٹ پر گم ہو گیا۔''

یہ جواب سن کر اماں آپے سے باہر ہو گئیں۔ کمزور ہو گئی تھیں۔ غصے کی برداشت نہیں رہی تھی۔

''اری امینہ! ذرا سامنے آ کر بات کر۔ میں تو تجھے صرف بدتمیز اور کمینہ سمجھتی تھی۔ تو تو ڈاکو ہے۔ وہ بھی امانت میں خیانت کرنے والی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے۔ تف ہے تجھ پر۔ حق غصب کرنے والی۔ ظالم۔ بیٹی کے مال کو ہضم کرنے والی۔ ارے اور کون کون سی خوبیاں ہیں تیرے پاس۔ دکھا مجھے ذرا۔ برسوں سے ہماری رشتے داری ہے اور میں نے تجھے آج پہچانا۔ تو تو ننگ خاندان ہے۔ توبہ' توبہ میں تو شکرانے کے نفل پڑھوں گی کہ تیرے پاس سے میری بہو جان بچا کر میرے پاس آ گئی۔ ورنہ تو قاتل بھی ہو سکتی تھی۔''

اماں کا غیض وغضب انتہا پر تھا۔ ستم یہ ہوا کہ گوشی آپا بھی ساتھ آ گئی تھیں اور ابا بھی موجود۔ ادھر ماں نے اپنا بکس اٹھا کر دروازہ پار کیا' ادھر گوشی آپا کا قہقہہ بلند ہوا۔ اماں بے چاری گھبرا گئیں پھر افسوس کرنے لگیں۔

''ہائے کیا ہو گیا تھا مجھے۔ مہمان کو ذلیل کیا۔ کچھ لحاظ نہ کیا۔ توبہ توبہ اللہ معاف کرے مجھے۔''

گوشی آپا نے بتایا کہ ان کے گھر جا کر ماں نے اماں کے مجھ پر ظلم ڈھانے اور ابا کے بھیجے ہوئے تحائف اپنے قبضے میں دبانے کے قصے سنائے۔ غرضیکہ ماں بے چاری کی داستان تو پورے خاندان میں مشہور ہوئی اور میرا تو دل فضا میں قلقاریاں مارتا اچھل رہا تھا۔ بادلوں کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ مری روح ہلکی پھلکی تھی اور اب مجھے کوئی شکوہ نہ تھا۔ البتہ میں جو کبھی سوچا کرتی تھی کہ ابا کے پاس چلی جاؤں گی۔ ابا کوئی ترکیب مجھے پاس رکھنے کی کریں گے' اب اس کی امید نہ رہی کہ بھوکی شیرنی کا لقمہ بننا مجھے منظور نہ تھا۔

مجھے اپنی ساس اتنی عزیز ہو گئیں کہ شاید میری اپنی سگی ماں بھی نہ ہوتی۔

☆☆

رضوان کی شادی کی خبر گوشی آپا نے دی۔ یہ بھی کہ جمیلہ آپا خود بارات لے کر گئی تھیں۔ ان کے

میاں نہیں گئے تھے- کیونکہ اماں سے پوشیدہ شادی پر وہ بھی خفا تھے- میں کچھ دیر کے لیے سناٹے میں گھر گئی- کتنی غیر محفوظ تھی میں- اماں کا دم غنیمت تھا- فرخ کی آمد بڑھ گئی تھی- اب وہ صبح بھی آ جاتا- دواؤں کے بہانے- رضوان کی شادی نے میرا کیا بگڑا- اب پتا چلا- خاندان محلے والے جو اصل راز سے واقف نہ تھے اب واقف ہو گئے- یعنی میرے اور رضوان کے تعلق سے- جمیلہ آپا کے میاں بھی مجھ پر مہربان ہو گئے تھے- مذاق فرماتے- مجھ سے کہتے-

''ہنسو- باتیں کرو- خوش رہا کرو- ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو-''

ان کی لگاوٹ بھی پاک جذبے کے تحت تھی- اف میں کیا کروں- اس ایک شخص نے مجھے کھلے آسمان تلے لا کھڑا کیا- بجلی گرے یا طوفان برسے- دھوپ جلائے- یا گدھ منڈلائیں- وہ اپنی خوشیوں کے جشن میں مگن ہوگا- بے رحم-

☆☆

اور اب جبکہ اس بات کو اس وقت کو برسوں گزر چکے ہیں- میں حیران ہوتی ہوں- میری زندگی بھی کیسے طوفانوں سے گزری تھی- میں بہت چاہتی ہوں بھول جاؤں- ان دہشت ناک راتوں کو اور خوفناک دنوں کو- برے دن ذہن کے پردے سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے- پہلے پہل تو' ہر لمحہ ہر منٹ ان واقعات سے ڈرتی رہی- پھر خوشیوں کا ریلا اور بہالے گیا مرے سارے خدشے- کبھی کبھی تنہائی میں سوچ کرتی- کیوں ہوا ایسا میرے ساتھ- ایسا تو نہیں ہوتا- مگر میں نے کسی شکوے گلے کے بنا ہر دکھ سہا- یہ کام اس طرح الٹ چھیر کے بجائے- سیدھے راستے سے ہوتا یا کچھ بھی نہ ہوتا-

اب تو میں اپنے عالی شان گھر میں نوکروں کی قطار کے ساتھ- اپنے چار بچوں کو سمیٹے- دنیا جہان کی مسرتوں کے حصار میں- شوہر کی بے پایاں چاہت لیے ہوئے- بے حد مصروف زندگی گزار رہی ہوں- بچوں کی معصوم سی حرکتیں- چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی قلقاریاں ساری سوچوں کو منفی سوچوں کو اڑا لے جاتیں-

اور وہ جو میرا شریک حیات ہے- زندگی کا حاصل ہے- وہ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی کب دیتا ہے- پارٹیاں' دعوتیں اور رشتے داروں سے راہ و رسم- بچوں کے مسائل- اسے تو ہر بات کا خیال رہتا ہے- وہ مجھے اداس یا فکر مند دیکھ ہی نہیں سکتا-

ٹھہریے- ابھی بتاتی ہوں-

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں تنہا تھی اور ہر سمت اندھیرے لپک رہے تھے- تنہائی تو ازل سے میری ہم سفر ہے- مگر کچھ دن اماں کی پناہ نے بڑا حوصلہ دیا تھا مجھے- انہیں جب رضوان کی شادی کی خبر ملی- وہ تڑپ گئیں- انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے-

''میری بچی! میں تیری قصوروار ہوں- دیکھ بیٹی جب بھی تجھے کوئی دکھ پہنچے- تجھے خدا کا واسطہ- رضوان کو بد دعا نہ دینا- وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے- اسے بد دعا نہ دینا- دیکھ دل کی دعا عرش تک پہنچتی ہے اور بد دعا عرش کے کنگورے ہلا دیتی ہے- جو کبھی نہیں خالی جاتی- بس اگر کبھی تمہیں مجھ بدنصیب سے کوئی سکھ ملا ہو- اس کے صدقے میں- میری التجا یاد رکھنا-''

اماں بے حد مضطرب تھیں- میں حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی- وہ سارا دن روتی رہیں- میں تسلیاں دیتی رہی مگر جانے کیسی بے قراری تھی انہیں کہ آنسو لکیروں کی صورت ان کے چہرے پر بہتے رہے- بیٹے کی بد دیانتی نے انہیں بے یقین کر دیا تھا- صبح وہ نہیں اٹھیں- نہ جانے کس وقت زندگی سے ناتا ٹوٹ گیا- میں انہیں ہلا جلا کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی- بوا نے آ کر دیکھا اور مجھے وہاں سے ہٹا دیا-

وہ جمیلہ آپا کو فون کرنے گئیں تو ایک ڈاکٹر کو بھی لے آئیں- موت کی تصدیق تک میں نا امید نہ ہوئی تھی- مگر اب بدحواس ہو کر چیخنے لگی- محلے والے آ گئے- گوشی آپا کے گھر والے بھی فوراً آ گئے- جمیلہ آپا چیخیں مارتی آئیں اور آتے ہی مجھے دو تھپڑوں سے مارنا شروع کر دیا-

میں سمجھی نہیں- جب انہوں نے محلے والوں کے سامنے میرا نام لے لے کر فریاد شروع کی تو میں سمجھی- وہ اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا رہی تھیں-

''یہ اگر رات کو ہی مجھے بلا لیتی- میں کچھ تو کرتی- ہائے میری ماں کے دشمن گھر میں موجود تھے اور میں بے فکر رہی-''

اچانک میرا دل مضبوط ہو گیا- آنسو رک گئے- میں اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی- اب میرا وہاں کیا تھا- گوشی آپا ان کی امی اور کئی پڑوسنیں جمیلہ آپا کو برا بھلا کہنے سے روکنے اور انہیں حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتی رہیں- سب میری حمایت کر رہی تھیں- بوا نے گواہی دی-

''چھوٹی بی بی نے کھانا کھلا کر ساری دوائیں پلا دی تھیں- بی بی موت کا بہانا ہوتا ہے- چھوٹی بی بی نے تو ایسی خدمت کی کہ اس کی مثال کوئی اپنی بیٹی بھی نہیں دے سکتی اور جمیلہ بی بی! آپ نے کب اپنی ماں کا خیال' خدمت کی- یہ تو بہو ہی تھی- جس نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات- ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے تھے-''

شام تک رضوان معہ نئی نویلی دلہن کے آ گئے- جمیلہ آپا کی خواہش تھی کہ ان کی دلہن بھابھی کی خدمت کے لیے کچن میں موجود رہوں- مگر میں اب اندر تھی- گوشی آپا نے رضوان کو بھی شرمندہ کیا-

''کون سا موقعہ تھا دلہن کی رونمائی کا- جو لوگ افسوس کے لیے جمع ہوئے- سب تمہاری دیدہ دلیری پر انگشت بدنداں ہیں- تمہارا یہ اقدام ہی خالہ کی موت کا سبب سمجھ رہے ہیں- ذرا سا ظرف

ہوتا تو چھپا دن اور اس خبر کو چھپا لیتے۔''

خالہ جان جمیلہ آپا کے پیچھے پڑ گئیں۔ انہیں اس موقع پر بھابھی کی خاطر داری' آرام کا زیادہ خیال آ رہا تھا۔ بہ نسبت افسوس کے۔ سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ جو سو فیصد میرے حق میں تھی۔ مگر بیکار۔

دلہن کو تو اگلے دن ہی روانہ کر دیا گیا۔ رضوان چار دن بعد گئے۔ چھٹی نہیں تھی۔ جمیلہ آپا دل کی بھڑاس نکال چکی تھیں۔ پھر مجھ سے شیر و شکر ہو گئیں۔

مہینہ بھر رہ کر چلی گئیں۔

بوا اب رات دن میرے پاس رہنے لگیں۔ فرخ نے پیچھا نہ چھوڑا۔ بوا نے اسے دو ٹوک کہا کہ وہ جمیلہ کے ساتھ آیا کرے۔ یا ان کی موجودگی میں۔ مگر فرخ نے ڈھٹائی اختیار کر لی۔ بوا نے ایک دن کہا۔

''میں رضوان میاں سے تمہاری شکایت کروں گی۔''

تو وہ تمسخرانہ ہنسنے لگے۔ عجب اڑیل ٹٹو تھا۔

ایک دن بوا کی غیر موجودگی میں آیا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ حماقت یہ کی کہ کہہ دیا ''بوا نہیں ہیں آپ بعد میں آئیں۔''

وہ تو دروازہ توڑنے کے درپے تھا۔ صحن میں ایک دروازہ تھا جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ میں نے وہ کھولا اور گلی میں سامنے جو گھر تھا۔ وہاں گھس گئی۔ یہ زرینہ کا گھر تھا۔ میرا اس سے زیادہ میل جول نہ تھا۔ مگر اسے مجبوری بتانی پڑی۔ وہ میرے ساتھ آ گئی۔ زور زور سے باتیں کرنے لگی۔ فرخ چلا گیا۔

''تم اپنے میاں سے کہو۔ تمہارا کوئی انتظام کرے۔ دنیا بہت خراب ہے۔ رضوان کو احساس دلاؤ۔ جمیلہ کے میاں سے اس کے بھائی کی شکایت کرو۔''

''لوان کی نظریں تو پہلے ہی بدل گئی تھیں اور میں ان سے بے رخی برتنے لگی تھی۔''

بوا کے آنے کے بعد وہ چلی گئی۔ اپنے تعاون کا یقین دلا کر۔

''بوا کہیں چلی جائیں تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں درست کر دوں گی اسے۔''

کتنا خوفناک زمانہ تھا وہ۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی میری۔ خواب بھی ایسے دہشت ناک آتے کہ چیخ مار کر اٹھ جاتی۔ گوشی آپا سسرال گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میرے لیے کچھ تحائف بھیجے۔ ان کا بھائی خود لا کر دے گیا۔ کس قدر شائستہ اور شریفانہ انداز تھے۔ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ بوا نے بھی تعریف کی۔ اور فرخ سے مقابلہ۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

گوشی آپا کتنی مخلص تھیں۔ انہیں میرا کتنا خیال تھا۔ اس خود غرض دنیا میں کچھ لوگ۔ میرے ہمدرد

بھی تھے۔

سات ماہ یوں گزرے جیسے ہر دم انگاروں پر چل رہی تھی۔ سکون اور چین اماں کے ساتھ جا سوئے۔

ابا کو اپنی حالت زار کا لکھ کر ان سے واپس آنے کی التجا کی۔ وہاں سے جواب میں ابا کے دوست کا لمبا خط آیا۔ ہائے اللہ' میں ابا کی شفقت کے سائے سے محروم ہو چکی تھی۔ ابا کے دوست نے ان کی بیماری کا حال لکھا۔ ماں کی چلتر بازی۔ وہ ابا کو بیمار چھوڑ کر آئی تھیں اور پھر واپس نہ گئیں۔ ابا کا سارا روپیہ سمیٹ لائیں۔ اب وہاں گھر میں ساز و سامان تو تھا۔ کوئی ذی روح نہ تھا۔ ابا پیارے ابا۔ ایسے پردیس گئے کہ واپس آنا بھول گئے۔ ماں کو پتا ہوگا۔ مگر مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ اماں کے انتقال پر بھی نہیں آئی تھیں۔ لگتا تھا یہی گھر میرا قید خانہ ہے۔ زندگی یہیں گزرنی تھی۔ یونہی ڈرڈر کر۔

میں روتی تو بوا آنسو پونچھتیں۔ میں کیسی بے آسرا تھی۔

پھر میری زندگی کا وہ تاریک ترین دن طلوع ہوا۔ دن تو عام دنوں کا سا تھا۔ مگر شام۔ شام غریباں سی۔ رضوان نے قدم رنجہ فرمایا تھا۔ سات ماہ بعد ان کی آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا دل کسی خدشے سے کانپ گیا۔ میرے آگے آ کر ایک لفافہ بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں ہکلائی۔

''خود دیکھ لو۔ پڑھ لو۔ طلاق نامہ ہے۔'' میں اپنی کیفیت خود نہیں بتا سکتی۔

شاید سکتہ ہو گیا تھا۔ یا دل کی دھڑکن رک گئی تھی۔

''اتہا پڑ ھنا تو آتا ہوگا۔ دیکھ لو۔ تمہارے کردار پر الزام نہیں لگایا۔ ایسا کر سکتا تھا۔ مگر پھر اماں کی تم سے محبت کے صدقے میں۔ ایسا نہیں کر سکا۔ ترس آ گیا تمہارے تو ابا بھی زندہ نہیں۔ بالکل اکیلی ہو۔ جاؤ خالہ امینہ کے پاس۔ بہت چاہنے والی ہیں وہ۔ ان کا دامن تھامو۔ میں جمیلہ کی طرف جا رہا ہوں۔ تم جہاں جا ہو چلی جاؤ اور جو چاہو یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ مجھے دلدل میں دھکا دے کر خود پہاڑوں کی بلندی پر روانہ ہو گئے جہاں ان کی خوشیاں تھیں۔ محبت اور زندگی تھی۔ یہاں میرے سامنے اندھیرا اور گہرا ہو چلا تھا۔ بوا آئیں تو میں ان کے کندھے پر سر رکھ کر حلق پھاڑ کر روئی تھی۔ یہی تھا میرے بس میں۔

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے چاروں جانب طوفان امڈ رہا تھا۔ زبردست طوفان ہزاروں بلائیں میرے آس پاس چیختی چلاتی چنگھاڑتی گھوم رہی تھیں۔ میں اکیلی تھی اور رو رہی تھی کیوں نہ روتی کسی کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا۔ کسی نام کا فخر ساتھ نہ تھا۔ کوئی بڑھ کر تھامنے والا نہ تھا میں گھٹنوں کے بل زمین پر دھنستی چلی گئی۔ انسان کتنا ناشکرا ہے۔ جلدی ہمت ہارتا اور مایوس ہوتا

اور خدا کی نعمتوں کو بھلا دینا۔

جب مایوسی میں مرنے کو تھی۔ بوا نے فرشتہ رحمت بن کر مجھے حوصلہ دیا۔ واقعی گرتوں کو اٹھانے والی طاقت تو کوئی اور تھی۔ اس نے ہی مجھے اٹھایا تھا۔ بوا مجھ سے مخاطب تھیں۔

''سنو بی بی! رونے کو تو عمر پڑی ہے۔ شام ہو چکی ہے۔ رات سر پر کھڑی ہے۔ رات بھی اندھیری ہے۔ تم اب کسی کی عزت نہیں ہو کہ کوئی لحاظ کرے گا۔ یہاں سے ابھی نکل چلو۔ ورنہ الزام لگانے والے نہ جانے کیا کیا کر ڈالیں۔''

میرے پیروں سے جان نکل چکی تھی۔ ذہن کچھ سوچنے سے عاری تھا۔ بوا نے کچھ کپڑے اور دیگر سامان بیگ میں ٹھونسا اور میرا ہاتھ تھامے دہلیز پار کر گئیں۔

''کہاں؟ بوا کہاں؟'' میں لڑکھڑاتی زبان میں پوچھتی رہی۔

وہاں جہاں چار لوگ گواہی دینے والے ہوں کہ رات تم نے وہاں گزاری۔'' میں نیم مدہوشی میں تھی۔ کہاں لے گئیں بوا۔ آوازوں سے اندازہ نہ ہوا۔ پھر ایک لمبی نیند تھی اور حواس غائب۔ بارے صبح خوش رنگ۔ خوش جمال تھی۔

یہ گوشی آپا کا گھر تھا۔ اور دوپہر تک گوشی آپا بھی پہنچ گئیں۔ رشتے دار آتے۔ رضوان کو تیروں کا نشانہ بناتے۔ مجھ سے ہمدردی کرتے۔

گوشی آپا کی ذات سے میرے تپتے دل کو سکون ملا۔ انہیں اب تک ابا کی وفات کی خبر نہ تھی۔ میں نے سرے سے روئی۔ اب نہ جانے یہاں کتنا رہنا تھا۔ جمیلہ آپا آ کر ہمدردی جتا گئیں اور بس۔

''اماں نے مجھے تسلی دی تھی کہ مرنے سے پہلے وہ میرا انتظام کر کے جائیں گی۔ کیا کیا انہوں نے؟'' میں ہچکیوں کے ساتھ رو رو کر خالہ جان سے شکوہ کر بیٹھی۔

''انہوں نے غلط دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بیٹی! انتظام کر گئی ہیں وہ۔ فکر نہ کرو۔ اب رونا دھونا چھوڑو اور خوش ہو کہ آزادی مل گئی۔ آسانی سے اور جلد۔''

میں رونا دھونا بھول گئی۔ ان کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

''مگر۔ اب میں کہاں جاؤں گی۔'' ان کی مسکراہٹ سے سٹپٹا کر میں نے کہا۔

''ہائے معصوم۔'' گوشی آپا نے مجھے لپٹا لیا۔ ''یہاں تکلیف ہے کوئی؟ ہم کیا کاٹتے ہیں تمہیں؟ شکر یہ ادا کرو۔ کورنش بجالاؤ۔ مگر ٹھہر جاؤ۔ رازی آ جائے تو تمہیں کورنش اور تسلیمات سکھائے گا۔ اسے بڑا شوق ہے۔ جھک جھک کر سات سلام کرنے کا۔''

گوشی آپا پراسرار مذاق کر رہی تھیں۔ میں ٹکر ٹکر انہیں دیکھنے لگی۔ یہ لوگ میری بے بسی کا اثر کیوں نہیں لے رہے۔ گوشی آپا ہی نہیں۔ ان کی دونوں بہنیں اور بلکہ خالہ جان بھی مجھے ہنسانے کے لیے عجیب مضحکہ خیز حرکتیں اور باتیں کرتیں۔

یہاں تک کہ ایک دن رازی بھی آ گیا بلکہ آ گئے اس وقت پانچ ماہ گزر چکے تھے اور میں کچھ بے فکر بھی ہو گئی تھی۔ رازی گاتے' گنگناتے' مسکراتے آئے تھے۔ دلچسپ اور حاضر جواب۔

پھر خالہ جان نے مجھے اماں کا خط دکھایا۔ جس میں انہوں نے میرے انتظام کے لیے خالہ جان کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور خالہ جان نے بھی آمادگی کے ساتھ عہد کیا تھا۔

تو اس طرح میرا نکاح رازی سے ہوا۔ اماں نے خود درخواست کی تھی خالہ جان سے کہ ان کی موت کے بعد۔ اگر رضوان کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو وہ مجھے اپنی بہو بنالیں۔ شادی خاصی دھوم دھام سے کی خالہ جان نے۔ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ لوگ خاصے خوش حال بھی تھے۔ پھر میں ان کے بیٹے کی پسند' ان کی بیٹیوں کی خواہش تھی۔

رازی کو ان کی آئیڈیل مل گئی تھی ان کی مسرتوں کا تو ٹھکانا نہ تھا۔ وہ گوشی آپا کی شادی پر پہلی بار مجھے دیکھ کر فریفتہ ہو گئے تھے اور عہد کیا تھا کہ اس لڑکی کو حاصل کرنا ہے۔ مگر جب معلوم ہوا تو ان کے جذبات پر اوس گر گئی۔

پھر انہوں نے دامن بچالیا۔ اور جب انہیں خبر ملی۔ میں ان کے گھر میں موجود ہوں۔ آزاد۔ تب انہوں نے جشن منایا۔

شادی کے چند دن بعد ہی ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''بڑے بدقسمت ہیں رضوان بھائی۔ جو تمہاری قدر نہ کر سکے۔ لگتا ہے کہ وہ اندھے ہو جاتے تھے گھر آ کر۔''

رازی تو واقعی میرے عاشق تھے۔ میں شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔ گوشی آپا نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ٹیوٹر رکھی گئی۔ رازی اعلیٰ پوسٹ پر تھے۔ پوزیشن تھی۔ ویسے بھی ہر جگہ ہر دل عزیز تھے۔ انہوں نے میرا اعتماد بحال کیا۔ انہیں میری جہالت' کم علمی سے کبھی شرم نہ آئی۔ ہر جگہ لے گئے۔ سیر تفریح۔ کہیں کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ سوئٹزرلینڈ لے گئے۔ انہیں سرکاری وفد کے ساتھ جانا تھا۔ مجھے ذاتی خرچ پر لے گئے۔ میں جو تصور نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اس تک رسائی دلوائی۔ بغیر منہ سے کہے ہر ضرورت پوری کی۔

اف میری آسائشیں۔ کہاں تک بیان کروں۔ میں خوابوں کے جزیرے میں حکمرانی کر رہی تھی۔ جہاں صرف خوشیاں تھی۔ رنگ رنگ کے پھول تھے۔ تتلیاں اور خوش آواز پرندے۔ گنگناتے جھرنے اور نہ جانے کیا کچھ۔

میں خوشیوں سے لبالب بھری ہوئی تھی اور اب میری کوئی خواہش باقی نہ رہی تھی۔ محبوب شریک زندگی۔ پیارے پیارے بچے۔ آسائشیں' آرام۔ میرے عروج کی کوئی حد تھی؟ خوشیاں میرے گرد۔ میرے اطراف میں رقص کرتی تھیں اور کیا چاہیے؟

☆☆

اور یہ اس دن کا واقعہ ہے- جب میں ڈاکٹر ثروت کے کلینک گئی تھی- یوں تو میں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی چلی جاتی تھی- بلکہ اب تو میں ڈرائیو بھی کر لیتی تھی- لیکن اس دن رازی گھر پر تھے- بچے ان کے گلے کا ہار ہو رہے تھے- وہ انہیں سیر کرانے جانے لگے تو میں نے یاد دلایا-

''آج میں نے ثروت سے ٹائم لیا ہوا ہے-''

چنانچہ وہ انہیں لے کر کلینک کے باہر کھڑے ہو گئے- میں اندر چلی گئی- معہ اپنی نٹ کھٹ معطر کے ساتھ- میرے بچوں کے شوق بھی عجیب ہیں- انہیں سڑک کی سیر بھی مرغوب ہے-

ڈاکٹر کے پاس ایک خاتون پہلے سے بیٹھی تھیں- وہ پردے کے پیچھے سے ابھی معائنہ کرا کر آئی تھیں- ڈاکٹر انہیں کچھ ہدایتیں دے رہی تھیں- ان کی رپورٹیں میز پر کھلی پڑی تھیں- ڈاکٹر ان میں سے کچھ خاص نکات پڑھ کر انہیں سمجھا رہی تھیں-

سات سال کوئی لمبی مدت نہیں ہوتی کہ بندہ کسی کو بھلا دے- میں تو انہیں پہچان چکی تھی- سات سال میں میری ظاہری حیثیت واقعی اتنی بدل چکی تھی کہ جس نے دو ایک بار مجھے دیکھا ہوگا- اب پہچان نہیں سکے گا- اور ان صاحب نے مجھے غور سے پہلے دیکھا بھی نہ ہوگا- میں تو کچھ سے کچھ ہو گئی تھی-

انہوں نے جب مجھے دیکھا تھا- میلے کچیلے حلیے میں غم واندوہ کے عالم میں صدمے سے بے حال' ظلم کی چکی تلے پسی ہوئی بے آسرا لڑکی تھی- اب میرے جسم پر قوس قزح کے رنگوں کی قیمتی ساڑھی تھی میرے کانوں اور گلے میں ڈائمنڈ کے ٹاپس اور لاکٹ تھا- لمبے براؤن بال بڑے سے جوڑے کی شکل میں تھے جس پر موتیا کی کلیوں کا گجرا لپٹا ہوا تھا- میرا حال بدل چکا تھا- میں ایک پراعتماد' ایڈوانس صاحب ثروت عورت تھی- باوقار عورت بلکہ خاتون- معطر بار بار میز کی طرف لپک رہی تھی- وہ اسٹیتھسکوپ کی ڈوری چبانے کی شائق تھی- اسے رنگین پنسلوں سے بھی دلچسپی تھی- بی پی آپریٹس سے بھی-

معطر بے حد حسین بچی ہے- اس کے سنہری' ریشمی' لچھے دار بال اور سیب جیسے سرخ گال- نیلی آنکھیں اور چلبلا پن راستہ چلتے لوگوں کو متوجہ کر دیتا ہے- ان خاتون کو بھی معطر سے دلچسپی ہو رہی تھی- وہ اسے چھو رہی تھیں' جھیڑ رہی تھیں اور جب انہوں نے اسے اپنی گود میں لینا چاہا- تو معطر برا مان کر منہ میرے کندھے میں سر دے کر بیٹھ گئی- وہ اجنبیوں کو پسند نہیں کرتی- خاتون کھسیانی ہو گئیں-

''آپ کی بیٹی- ہو بہو آپ کی کاپی ہے-'' انہوں نے کہا اور اپنے کاغذات سنبھالتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں-

میں نے ثروت سے پوچھا- ''ان کو کیا تکلیف ہے-''

''اولاد نہیں ہے- دولت بہت ہے- اولاد ہو بھی نہیں سکتی- یہ خاتون پنڈی سے خاص طور پر مجھے

دکھانے آئی ہیں-''

زن زن زن- پوری ٹرین میرے اوپر سے گزر گئی- کتنی بے خبر تھی میں- فلم کی طرح کتنے ہی سین آنکھوں تلے سے گزر رہے تھے- میں ثروت کو دکھائے بغیر باہر آ گئی- سامنے ہی رازی بچوں کو لیے کھڑے تھے- وہ خاتون بھی وہیں تھیں اور رضوان بھی- فراز رازی کی گود میں تھا- وہ خاتون اسے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں- مجھے آتا دیکھ کر رازی نے فراز کو گود سے اتارا اور معطر کو میری گود سے لے لیا-

وہ باپ کی شیدا' جھٹ لپٹ گئی- انہوں نے اسے گدگدایا تو وہ سر پیچھے لڑھکا کر کھلکھلا کر ہنسی- قل قل قل جیسے نقرئی گھنٹیاں بجی ہوں- اس کی ہنسی بہت پیاری تھی رضوان نے مجھے بغور دیکھا-

''چلیں؟'' میں نے نظر انداز کیا- شاید میں رضوان کا سامنا کرتے گھبرا رہی تھی-

''ہاں چلتے ہیں-'' رازی معطر کو اچھالتے ہوئے بولے- ''دراصل عرصے بعد رضوان بھائی سے ملاقات ہوئی ہے- تم ان کی بیگم سے ملیں؟''

میں جواب دیے بغیر سیاہ مرسیڈیز کی طرف بڑھ گئی- فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے میری گردن کچھ بلند ہو گئی- میں بیٹھی تو رازی نے معطر کو میری گود میں ڈال دیا اور اعراج معراج فراز کو ہانکتے ہوئے لائے پیچھے بٹھایا- رضوان کی نظریں مجھ پر اور معطر پر گڑی ہوئی تھیں- ان لوگوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے رازی گنگنا رہے تھے-

میں آج بھی اپنے احساسات کو زبان نہیں دے سکتی-

آتا ہی نہیں مجھے- سلیقہ ہی نہیں- لیکن میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے جسم کپکپا رہا تھا- ماضی تلخ واقعات کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہو گیا تھا- میں آج تک اس سے چھٹکارا نہ پا سکی تھی- رازی ہی میری مدد کرتے تھے- آج بھی انہوں نے میرے سرد ہاتھوں کو اپنی گرم ہتھیلی میں دبا کر تسلی دی- مجھ پر کتنے احسانات ہیں رازی کے- گنوانا چاہوں تو نہیں گن سکتی- میں کیا تھی کیا ہو گئی- سوچتی ہوں تو یقین نہیں آتا-

''کیا خیال ہے- رضوان بھائی آئے ہوئے ہیں- انہیں ڈنر پر انوائٹ نہ کیا جائے؟''

اتنے بے حس تو رازی نہیں مگر آج-

''جی نہیں-'' میں تلخی سے بولی-

''یار! کیا ہو گیا ہے؟ اس قدر تو پیار کر رہے تھے تمہارے بچوں کو-''

جب چاہیں میرے بچے- جب چاہیں تمہارے بچے- یہ ان کا خاص انداز تھا-

میرے جیسے ''بچھو'' نے ڈنک مارا- ''آپ چپ نہیں ہو سکتے؟'' میں چیخی-

''آپ مسکرا نہیں سکتیں؟'' وہ اس سے بڑھ کر چلائے- میں ہنس پڑی-

بچے تالیاں بجانے لگے- ایسی کتنی ہی ترکیبیں مجھے ہنسانے کی- دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی ان کے پاس تھیں-

رازی نے میرے ماموں کو بھی تلاش کرلیا تھا- مجھے ان سے ملانے لے گئے- بتایا نہیں- میں تو خوشی سے پاگل ہوگئی- میں نے اس دن رازی کو فلک کی بلندی پر دیکھا- میری گردن اس بلندی کو سہار نہ سکی جھک گئی- میرا میکہ 'اب میں بچوں سے کہہ سکتی ہوں-

''اس بار چھٹیوں میں نانا کے گھر جائیں گے-''

کتنی حسرت تھی مجھے یہ الفاظ کہنے کی- میکے جانے کی- اب میری کوئی حسرت نہیں رہی- ساری تمنائیں جو کبھی سوچی نہ تھیں' وہ بھی پوری ہوچکی ہیں- میں واقعی خوش قسمت ہوں- میرا ہر ارمان رازی نے پورا کیا- میں شرمسار ہوجاتی- میں اس قابل نہ تھی اور اس کے کچھ عرصے بعد..... رازی کہہ رہے ہیں-

''کہ میں رضوان کو معاف کردوں-'' میں انہیں حیرانی سے دیکھ کر رہ گئی-

''میں نے کہا ہے- تم صرف دل سے رضوان بھائی کو معاف کردو- ان کی سزا پوری ہوچکی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ رہے-''

''آپ کے ضمیر پر بوجھ-''

''ہاں- میں نے تو حتی الامکان تمہیں ہر خوشی فراہم کی- تمہیں خوش دیکھنے- ہنستا دیکھنے کی خواہش میری تھی- میں اس میں کامیاب ہوا ہوں- میری آئندہ زندگی بھی- تمہاری خوشیوں کے لیے وقف رہے گی- میں نے تمہیں اس وقت چاہا تھا- رخشی! جب مجھے علم نہ تھا کہ تم شجر ممنوعہ ہو- میں نے بہت چاہا کہ تمہیں بھلادوں- تمہارا خیال دل سے نکال دوں- مگر ممکن نہ ہوا- میں جانتا تھا' تم میری نہیں بن سکتیں- اب تم میرے لیے قابل احترام ہو- مگر یہ پاگل دل- میں نے تم کو بھلانے کی خاطر- تم سے دوری بھی اختیار کی- دور دراز علاقے میں ٹرانسفر کرایا- امی سے مہینوں بعد ملنے آتا- لیکن یہ دل بے ایمان- تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے بہانے سے رضوان بھائی کے گھر لے جاتا- میں نظر نہ اٹھا پاتا کہ کوئی غلط خیال دل میں نہ آئے- شاید یہ میری پاکیزہ محبت تھی- جو قدرت کو پسند آگئی- یا اس نے تمہیں میرے لیے ہی دنیا میں اتارا تھا- فرشتوں کی غلط فہمی نے تمہیں رضوان بھائی کے گھر پہنچادیا-''

''فرشتوں نے کیوں-'' میں حیران ہوگئی- رازی بہت سنجیدہ تھے- اور یہ غیر سنجیدہ جملہ مجھے عجیب لگا-

''کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر کام فرشتوں سے لیتا ہے اور فرشتے بھی غلطی کرسکتے ہیں- تو انہیں فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا-'' رازی پھر غیر سنجیدہ ہوگئے- میں الجھ گئی-

''پریشان نہ ہو- سنو نکاح والے دن تک میں اس راز سے واقف نہ تھا- کہ قدرت کے کسی پیچیدہ نظام کے تحت- تم بطور امانت میرے لیے دوسرے گھر میں رکھوائی گئی ہو- تاکہ جب میں تمہارے لائق ہوجاؤں تب تک تم محفوظ رہو- میرے لیے- رخشی کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا- یہ تمہارا ہوش اڑا دینے والا حسن جمال- قاتل ادائیں- تمہارے گھنے بالوں کی گھٹائیں- تم جو عمر خیام کی رباعی کی تفسیر ہو- جو ہر مرد کی اولین تمنا ہوتی ہے- پھر رضوان بھائی تم سے متاثر کیوں نہیں ہوئے- انہیں وہ سب کیوں نظر نہیں آیا- جو میں نے دیکھا اور دل ہار گیا- ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی- ظالم سماج نہ تھا- پھر کس لیے؟ میری جان جاناں- عقل سے کام لو' اس لیے کہ تم میرے لیے تھیں- تمہیں میرے لیے دنیا میں اتارا گیا تھا اور میری پہلی نظر کی محبت اس کا ثبوت ہے- گوشی کی شادی میں میں نے تمہیں دیکھا اور اسے بتا بھی دیا کہ تم میری ہو- پھر اس راز کے افشا ہونے پر میں تمہیں بھلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر- تم میرا نصیب تھیں- تو غور کرو اور..... میں نے اپنی محبت کا پورا پورا خراج ادا کیا ہے- اپنی پوری زندگی دے کر- اپنی وفا تابعداری- دل داری سے اسے عشق کے درجے پر پہنچادیا-''

وہ بے حد سنجیدہ تھے- میں ساکت بیٹھی تھی زبان تائید نہ کرے- دل تو اقرار کررہا تھا-

''رخشی! تم تو میرے دل میں دھڑکتی ہو- میری روح میں رچی بسی ہو- تمہیں کبھی بھی کوئی شکایت مجھ سے ہوئی-''

''نہیں-'' میں گردن ہلا کر زبان سے بھی انکار کررہی تھی-

''تو میری آواز سنو- میرے دل کی آواز- فرشتوں کی غلطی کو سزا نہ بناؤ- وہ اپنی اس غلطی کی تلافی کرچکے ہیں- تمہیں جو کا تو اس پوری پاکیزگی کے ساتھ مجھ تک پہنچانے کا مکمل- یہ معجزہ نہیں؟ اور اس کے لیے میں تم سے پہلی بار ایک سوال کررہا ہوں- تم نے رضوان بھائی کے لیے بددعا کی؟ کبھی بھی-''

''ہاں کی تھی-'' میں بول اٹھی- کیونکہ اب چپ رہنا ممکن نہ رہا تھا- ''طوفان میں اکیلا چھوڑ کر جانے والے کے لیے دعاؤں کے ہار نہیں پروئے جاتے-''

میں تلخ ہوگئی اور مجھے وہ وقت یاد آگیا- وہ جو میں بھول چکی تھی- رات اور شام گلے مل رہی تھی- میرے پیروں میں سکت نہ تھی اور ہوا مجھے گھسیٹتی ہوئی سڑک پر لائی تھیں- آہیں اور چیخیں میرے گلے سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھیں اور میرے دل کی صدا آواز بن گئی تھی- مجھے یاد آگیا- میں رو رو کر چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی-

''رضوان! خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے' تم سدا نامراد رہو' جیسا تم نے مجھے اکیلا ہے' اللہ تمہیں بھی اکیلا کرے- جس طرح تم نے مجھے اجاڑا ہے- اللہ تمہیں بھی اجاڑے گا-''

''تمہیں بددعا کرتے ہوئے خدا کا خوف نہ تھا؟ بددعا بھی گناہ کے دائرے میں آتی ہے۔تم نے گناہ کیا ہے۔ خدارا اب اس کا کفارہ ادا کرو اس سے پہلے کہ قدرت.... رخشی تمہاری بددعا آج تک رضوان بھائی کا پیچھا کر رہی ہے۔انہیں اس سے نجات دلا دو۔آزاد کر دو۔مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔رضوان بھائی' بھابھی کی اجازت سے دوسری شادی کر رہے ہیں اولاد کے لیے۔لڑکی والوں کا مطالبہ ہے کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دیں۔بھابھی بہت پریشان ہیں۔جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔وہی ہو رہا ہے۔اب ان کو معاف کر دو۔اس دن تمہاری آزادی کا دن تھا۔تمہارے ساتھ ظلم نہیں ہوا۔قدرت نے یہ موقع فراہم کیا تھا۔اس کے اشارے کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں ہوتا ناں۔اس دن رضوان بھائی سے تمہیں واگزار کروایا تھا قدرت نے۔رضوان بھائی نے احسان کیا تھا تم پر۔میری امانت واپس کی تھی' جوں کی توں۔انہیں خیانت کا خیال تک نہ آیا تھا۔اس لیے کہ تم فرشتوں کی غلطی سے ان تک پہنچی تھیں۔قدرت نے تمہاری محرومیوں دکھوں اور صبر کے عوض وہ کام انعام کے طور پر کروایا۔تمہیں میرے پاس اسی طور آنا تھا۔کیونکہ تم میری تھیں۔ابا نے تمہیں حق دیا تھا کہ تم اس دروازے میں داخل ہو جاؤ جو دراصل تمہارے لیے سجایا سنوارا گیا تھا۔وہ دروازہ میری زندگی کا تھا رخشی۔اس لیے گناہ کا کفارہ ادا کرو تم رب کے حضور سجدے میں گر کر رضوان بھائی کی بددعا کو واپس لینے کی دعا کرو۔بس یہی میری پہلی خواہش ہے۔انہیں دل سے معاف کر دو۔اس لیے کہ وہ بے قصور تھے۔انہیں تو میرا امانت دار بننا تھا۔''

رازی چپ ہو گئے اور مجھے اب ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔اماں صغریٰ کی التجا۔

''میرے رضوان کو بددعا نہ دینا۔کبھی بددعا نہ دینا۔''

اف اماں۔آپ کی محبت' سلوک اور مہربانیوں کے صدقے میں' میں اپنی غلطی کا کفارہ دوں گی۔ضرور دوں گی۔میں نے معاف کیا۔رضوان کو معاف کیا۔اماں! میں کم ظرف تھی۔آپ کی التجا کو بھلا دیا۔اف بھول گئی۔

آپ تو میری نجات دہندہ ہیں۔آپ نے میری منزل فراہم کی تھی مجھے۔آپ نے اس گھر تک مجھے پہنچایا تھا۔اور میں بھول گئی۔مجھے کفارہ دینا ہے کہیں اس غلطی کی سزا مجھے کسی دکھ سے روشناس نہ کر دے۔

میں جلدی جلدی وضو کر رہی ہوں۔کہیں وقت گزر نہ جائے قبولیت کا وقت۔مجھے توبہ کرنی ہے۔وقت گزرنے سے پہلے۔رضوان کی بددعا کا اثر ختم کرنے کی دعا۔التجا کرنی ہے رب سے جس نے مجھے رازی سے نوازا ہے۔

☆☆ ☆☆